مولانا محمد سراج الحسنؒ

جو دلوں کو فتح کرلے وهی فاتح زمانه

مرتب

ابوالاعلی سید سبحانی

مشمولات

اشارہ

یہ کتاب سابق امیر جماعت اسلامی ہند مولانا محمد سراج الحسن صاحب مرحوم کی شخصیت اور فکر پر ایک معمولی سی کوشش ہے۔ کتاب کا عنوان 'جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ' مولانا مرحوم کی شخصیت اور فکر کا مکمل ترجمان ہے۔

محبت اور حسن معاملت تمام انسانوں کے ساتھ یکساں طور پر مطلوب ہے، وابستگان تحریک کے ساتھ بھی، عام مسلمانوں کے ساتھ بھی، اور برادران وطن کے ساتھ بھی۔ یہ ایک اعلیٰ انسانی قدر، ایک مطلوب اسلامی وصف اور ایک اہم دعوتی ذمہ داری ہے۔ انسانوں سے محبت مولانا مرحوم کی شناخت اور پہچان، نیز آپ کی جدوجہد سے بھرپور زندگی کا نمایاں پیغام تھا۔

انسانوں کے درمیان ایسے بہت کم لوگ ہوتے ہیں جن کے ہاں صرف اور صرف محبت اور مودت کا چرچا ہوتا ہے، ان کے تمام معاملات محبت پر مبنی ہوتے ہیں، اور ان کی تمام یادیں حسن معاملت سے متعلق ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے مولانا مرحوم کی زندگی یقیناً قابل رشک تھی، ہر فرد یہی سمجھتا تھا کہ وہ مولانا کے نزدیک سب سے مقرب اور سب سے محبوب ہے، ایک بار کی ملاقات ذہن و دل پر گہرے نقوش ثبت کر جاتی تھی۔

اس مجموعہ مضامین میں مولانا مرحوم کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن خاص بات یہ ہے کہ ان تمام پہلوؤں کا محور مولانا کی شخصیت کا یہی عنوان ہے، کہیں اس کو خوئے دل نوازی، کہیں سخن دل نواز اور جاں پرسوز، کہیں مشفق قائد، کہیں شخصیت ساز، کہیں نرم دل انسان، کہیں ٹوٹ کر چاہنے والی شخصیت، کہیں شجر ہائے سایہ دار، اور کہیں دوسرے عناوین دیے گئے ہیں، گھریلو معاملات سے متعلق یادیں ہوں یا وابستگان تحریک سے متعلق، ملت اسلامیہ ہند کے مشترکہ پلیٹ فارم پر نمائندگی کی بات ہو یا برادران وطن کے ساتھ ربط وتعاون کی بات ہو، ہر موقع پر اور ہر مرحلہ میں، آپ کی شخصیت کا یہ پہلو بہت ہی نمایاں، واضح اور ابھرا ہوا نظر آتا ہے۔

مولانا سراج الحسن مرحوم کی زندگی بہت ہی قابل رشک اور مثالی تھی، ان کی تحریکی زندگی کا آغاز عین جوانی میں ہوا تھا، اور ایک شعوری اقدام کے طور پر ہوا تھا۔ آپ کی جوانی غیر معمولی قربانیوں اور انتھک جدوجہد سے عبارت تھی، جوانی اور قربانی کے ملاپ سے جس شخصیت کی تعمیر ہوئی تھی وہ شخصیت تادم زیست بلند حوصلوں اور آہنی عزائم سے معمور رہی۔ مولانا مرحوم کی زندگی کا ایک پہلو نوجوانوں سے خاص تعلق اور نوجوانوں کے ساتھ ربط و تعلق بھی ہے، اس پہلو پر بھی کتاب میں جگہ جگہ گفتگو کی گئی ہے۔

تحریک اسلامی کے لیے افراد کی تیاری، زمین کی ہمواری، قیادت کی فراہمی، ملکی حالات کے تناظر میں پالیسی سازی، ملی حالات کے پیش نظر منصوبہ بندی، ہر ہر محاذ پر آپ یکساں طور پر فکرمند رہتے تھے۔ ملت اسلامیہ ہند کا تحفظ بھی یقینی بنایا جائے اور اس کی اصلاح کے راستے بھی تلاش کیے جائیں، اور اس کی تعمیر وترقی کے لیے ہر ممکن کوشش کی جائے، تحریکی قیادت کے دوران ان تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے تھے۔ لیکن تحریک اسلامی ہند کے لائحہ عمل کے تعلق سے آپ کا یہ موقف بہت صاف اور واضح تھا کہ دعوتی محاذ پر توجہ دیے بغیر، برادران وطن کے ساتھ اچھے تعلقات استوار کیے بغیر اور اسلام کی صحیح نمائندگی کے بغیر حالات میں بہتری لانا ممکن نہیں ہے۔ وقتی مسائل اور وقتی حالات کے درمیان اصل محاذ اور اصل مشن کو نظرانداز کر دینا وہ کسی بھی طرح مناسب نہیں سمجھتے تھے۔

یہ کتاب ان شاء اللہ مولانا کی شخصیت اور فکر کے تعارف کا ایک اہم ذریعہ ہوگی، ممکن ہوا تو آئندہ مولانا کی شخصیت اور فکر پر مزید چیزیں بھی منظر عام پر لانے کی کوشش کی جائے گی، مولانا کے خطوط کا مجموعہ بھی پیش نظر ہے، ان شاء اللہ جلد ہی اس کو بھی منظر عام پر لانے کی کوشش کی جائے گی، اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ اس کوشش کو شرف قبولیت عطا فرمائے، ذمہ داران ایس آئی او آف انڈیا، بالخصوص تنظیمی سکریٹری برادر محترم معاذ سلمان منیار اور وہائٹ ڈاٹ پبلشرز کے مینیجر برادر عبدالجبار اور اسسٹنٹ برادر سلیم اکرم کا خصوصی شکریہ کہ ان کی بار بار توجہ اور یاددہانی سے یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔

طالب دعا

ابوالاعلی سید سبحانی

محبت فاتح عالم

سید سعادت اللہ حسینی، امیر جماعت اسلامی ہند

قرآن مجید میں نبی کریم ﷺ کو اہل ایمان کے سلسلے میں ہدایت دی گئی کہ وَاخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِلۡمُؤۡمِنِينَ (تم ان[مومنین] کے لیے اپنے شفقت کے بازو پھیلا دو)۔ اور آپ ﷺ کے بارے میں یہ گواہی دی گئی کہ لَقَدۡ جَاءَكُمۡ رَسُولٌ مِّنۡ أَنفُسِكُمۡ عَزِيزٌ عَلَيۡهِ مَا عَنِتُّمۡ حَرِيصٌ عَلَيۡكُم بِالۡمُؤۡمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (تمھارے پاس ایک ایسا رسول آیا ہے جس کو تمھاری ہر تکلیف بہت گراں معلوم ہوتی ہے، جسے تمھاری بھلائی کی دھن لگی ہوئی ہے جو مومنوں کے لیے انتہائی شفیق اور نہایت مہربان ہے۔) صحابہ اکرامؓ نے آپ ﷺ کے بارے میں یہ گواہی دی کہ کوئی مصافحہ کرتا تو آپ ﷺ اُس کا ہاتھ نہیں چھوڑتے تھے جب تک وہ الگ نہ کرلے، جس سے گفتگو فرماتے پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوتے کوئی آپ سے بات کرتا تو پوری توجہ سے سماعت فرماتے تھے اور ہر فرد یہی تصور کرتا تھا کہ آپ ﷺ مجھ کو ہی سب سے زیادہ چاہتے ہیں۔

کل سہ پہر رسول اللہ ﷺ کا ایک ایسا پیرو اس دنیائے فانی سے رخصت ہوا جس کے بارے میں اس وقت بلا مبالغہ ہزاروں لوگ یہ محسوس کر رہے ہوں گے کہ وہ سب سے زیادہ مجھے چاہتا تھا۔ آں حضرت ﷺ کے مذکورہ اسوے کی پیروی کا بہترین عملی نمونہ، اپنی معاصر شخصیات میں، ہم نے مولانا محمد سراج الحسن صاحب رحمتہ اللہ علیہ میں دیکھا ہے۔ گرمجوش محبت اور بے لوث رفاقت مولانا مرحومؒ کی دلنواز شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو تھا۔ ان کے وجود کی گرمی اور شخصیت کی مٹھاس کو ہر ملنے والا ملاقات کی پہلی ساعت ہی میں محسوس کر لیتا۔ آنے والے کے، کمرے میں داخل ہونے سے پہلے وہ استقبال کے لیے کھڑے ہو جاتے، نظر پڑتے

ہی گرمجوشی سے گلے لگا لیتے۔دیر تک سینے سے لگا کر انتہائی اپنائیت سے گفتگو کا آغاز فرماتے۔ ان کے کشادہ سینے اور اس سے کہیں زیادہ وسیع قلب کی گہرائیوں میں شکوے، شکایتیں اور مسائل و الجھنیں، آنِ واحد میں تحلیل ہوکر غائب ہو جاتیں۔خوئے دلنوازی اور جانِ پرسوز کیسے قائدین کی سب سے بڑی طاقت بن جاتی ہے، اس کا عملی مشاہدہ مولانا سراج الحسن کی سحر انگیز شخصیت میں کیا جاسکتا تھا۔مرحوم قائدؒ نہ کوئی بڑے عالم دین تھے اور نہ نامور دانشور، نہ ان کے پاس اونچی ڈگریاں تھیں اور نہ تصنیفات کا ذخیرہ۔لیکن ذہانت، معاملہ فہمی، فکری توازن وغیرہ کے ساتھ اُن کا اصل اثاثہ ان کی انسان نوازی، اخلاقی بلندی اور تعلقات کی گرمجوشی تھا۔ان اوصاف نے ان کی شخصیت میں غیر معمولی کشش اور جاذبیت پیدا کردی تھی۔اس اثاثے کو اللہ کے دین کی خاطر جدوجہد کے لیے انہوں نے بہت شاندار طریقہ سے استعمال کیا۔تحریکی کارکن، ان سے مل کر لوٹتے تو نئی توانائی اور جوشِ عمل سے سرشار ہوتے۔عام و خاص مسلمان ملتے تو تحریک کا اچھا اثر قبول کرتے، دوریاں ختم ہوتیں اور تحریک کا اثر بڑھتا۔غیر مسلم ملتے تو اسلام، اس کی دعوت اور اس کے پیغام کے بارے میں ان کی رائے بہتر ہو جاتی۔ان سب نتائج کے اثرات پورے ملک میں بکھرے ہوئے ہیں۔اور برسوں بعد آج بھی لوگ ان کو یاد کرتے ہیں۔اللہ غریق رحمت فرمائے اور جو محبتیں انہوں نے اللہ کے بے شمار بندوں پر اور اس کے دین کے مخلص کارکنوں پر لٹائی ہیں اس کا عظیم صلہ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی بے پایاں رحمتوں کے نزول کے ذریعہ عطا فرمائے، آمین۔

محمد سراج الحسن صاحب، ملک کی آزادی سے پندرہ سال پہلے، ریاست حیدرآباد دکن کے ایک دور افتادہ قصبہ میں، ایک متمول زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔جولگیرہ نامی یہ قصبہ اب کرناٹک کے ضلع رائچور کے تعلقہ سندھنور میں واقع ہے۔بچپن میں کسی بااثر راجہ سے خاندانی تنازعہ کی وجہ سے انہیں برسوں چھپ کر رہنا پڑا جس کی وجہ سے ان کی باقاعدہ تعلیم منقطع ہوگئی لیکن اسلامی لٹریچر کے گہرے مطالعہ کا موقع ملا اور تحریک اسلامی سے تعارف حاصل ہوا۔ نظر بندی کی طویل مدت سے آزاد ہوئے تو اللہ کے دین کی خاطر جدوجہد کا سودا سر میں سما چکا تھا۔کم عمری میں رکن جماعت بنے اور 26 سال کی عمر میں کرناٹک کے امیر حلقہ بنائے گئے۔

اس کے بعد پوری زندگی اللہ کے دین کی خاطر جدوجہد اور قربانیوں میں گزاردی۔ گھر کے آرام اور پر تعیش طرز زندگی کو چھوڑ کر، ریاست کرناٹک کے دوردراز کے علاقوں کے پر مشقت دورے شروع کردیئے۔ سیکڑوں خاندانوں کو متأثر کیا۔ بے شمار کارکن تیار کیے۔ ان گنت لوگوں کے دلوں میں تحریک کی شناسائی، ہمدردی، اور تعلق خاطر کے بیج بوئے۔ خود انتہائی سادہ زندگی گزاری۔ اپنی دولت اس راہ میں لٹائی۔ اور متاعِ زندگی خدا کی راہ میں لٹا کر بے نیازی اور استغنا کی قابل رشک شان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گئے۔

اس وقت ذہن کے اسکرین پر بہت سی تصویریں چل رہی ہیں۔ عجیب وغریب، حیرت انگیز لیکن نہایت حسین اور دلفریب۔ میری ان سے پہلی ملاقات، ایک اجتماع میں اس وقت ہوئی جب میں اٹھارہ سال کی عمر کا ایس آئی او کا ایک گمنام کارکن تھا۔ اس کے بعد وہ کبھی میرا نام نہیں بھولے۔ پھر جگہ جگہ ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ایس آئی او کا صدر بنا تو کئی سال ان کے سایہ شفقت میں مرکز کے قریب رہنے کا موقع ملا۔ اُس وقت مرکز کے جن ذمہ داروں سے ملنے اور بے تکلف بات کرنے میں ہم ایس آئی او کے کارکنوں کو کبھی کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی، ان میں ایک نمایاں نام خود امیر جماعت کا تھا۔ ہم وقت لیے بغیر پہنچ جاتے۔ بے تکلف بات کرتے۔ کبھی اپنے دفتر ایس آئی او میں بھی دعوت دینے کی جسارت کرتے۔ ہلکی پھلکی تنقید اور تیکھے سوالات بھی کرڈالتے۔ کبھی مولانا کی باتوں سے متفق ہوتے، کبھی نہیں بھی ہوتے لیکن ان کے پاس سے کبھی مایوس یا دل شکستہ نہیں لوٹتے۔ مولانا تحریک کے امور پر بھی بات کرتے، علمی و فکری مسائل پر بھی گفتگو ہوتی، لیکن ساتھ ہی ہماری ذاتی زندگیوں کے بہت سے امور بھی زیر بحث آتے۔ تعلیم کے بارے میں پوچھتے۔ والدین کے بارے میں سوال کرتے۔ اور خاص بات یہ ہے کہ جو کچھ ہم کہتے تھے انہیں یاد بھی رکھتے تھے۔

یہ بات ہمارے نوجوان رفقاء لیے انتہائی تعجب کا باعث ہوتی تھی کہ امیر جماعت کو ایک عام کارکن کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ اس کا باپ بیمار ہے یا اس کا پورا خاندان اس کی بہن کے رشتہ کے حوالے سے متفکر ہے، یا اسے انجینئرنگ کے دو پرچے پاس کرنے میں مشکل ہورہی ہے یا وہ کئی دنوں سے نوکری کی تلاش میں پریشان ہے۔ وہ صرف سوالات ہی نہیں

کرتے بلکہ اُس کے ذاتی مسائل کو حل کرنے میں ممکنہ تعاون بھی کرتے۔ میری اس وقت تک شادی نہیں ہوئی تھی۔ کئی رشتوں کی نشان دہی کی۔ ایک آدھ رشتے کے بارے میں والد صاحب مرحوم سے بھی بات کی۔ مولانا مرحوم کی شخصیت، خوئے دلنوازی کی ایسی بے شمار اداؤں کا مرقع تھی۔

مولانا کو معلوم ہوتا کہ ہمارا کوئی سفر درپیش ہے تو ٹکٹ کے بارے میں پوچھتے۔ ریزرویشن کے کنفرمیشن کے بارے میں معلوم کرتے۔ اپنے تجربات کی روشنی میں ہدایات دیتے۔ فلاں اسٹیشن سے فلاں اسٹیشن کے درمیان چوریاں بہت ہوتی ہیں، دھیان رکھنا۔ فلاں ٹرین میں کھانا اچھا نہیں ملتا، ساتھ میں ٹفن لے لینا۔ فلاں روٹ پر دن میں عام مسافرین بھی ریزروڈبوں میں چڑھ جاتے ہیں۔ رات ہی میں نیند اچھی مکمل کرلینا وغیرہ۔

ملک بھر میں پھیلے ہوئے سیکڑوں لوگوں سے وہ پوسٹ کارڈز کے ذریعہ ربط میں رہتے۔ سفر وحضر میں ہر وقت ان کے ساتھ پوسٹ کارڈز کا ایک بنڈل ساتھ ہوتا۔ روزانہ دن کا کچھ حصہ خطوط لکھنے میں صرف ہوتا۔ جہاں جاتے، اپنے رفقاء کے گھروں میں قیام کو پسند فرماتے۔ ٹرین سے طویل سفر پر نکلتے تو راستہ میں آنے والے اسٹیشنوں کے رفقاء کو خبر کردیتے۔ وہ خوشی و مسرت کے ساتھ ملاقات کے لیے آتے۔ بعض اوقات آدھی رات کو بھی اٹھ کر، اسٹیشن پر آنے والے رفقاء سے ملاقاتیں کرتے۔ کھانے پینے کی پسند بہت سادہ تھی۔ مرچی کے پکوڑے، جوار کی روٹی، اس جیسی سادی چیزوں کو اپنی مرغوب ترین چیزیں کہتے۔ رفقاء ان سادی چیزوں کو لاکر اور کھلاکر بے پناہ خوشی محسوس کرتے۔ یہ سب بھی تعلقات کے استحکام کے انوکھے انداز تھے جنہیں بہت خوبصورتی سے برتتے تھے۔

غالبا 2002 کی بات ہے، ایس آئی او کی کوئی کل ہند مہم چل رہی تھی۔ میرے مسلسل دورے ہورہے تھے۔ ایک دفعہ بھوپال میں رات کا پروگرام کرکے مجھے اگلے دن میرٹھ میں ایک بڑے پروگرام کی صدارت کرنی تھی۔ رات بھوپال اسٹیشن پہنچے تو معلوم ہوا کہ میرٹھ کے لیے جس ٹرین کا ریزرویشن تھا وہ منسوخ ہوگئی ہے۔ کسی طرح دلی کا ٹکٹ بنایا گیا۔ وقت تنگ تھا۔ دلی سے میرٹھ، پروگرام کے وقت پر، اسی صورت میں پہنچ سکتے تھے جب ٹرین ٹائم پر چلے،

اسٹیشن پر فوری کار مل جائے اور دلی سے میرٹھ کا سفر تیزی سے مکمل ہو جائے۔ کار اس وقت ہمارے پاس نہیں تھی۔ دلی میں موجود رفقاء نے مرکز جماعت پہنچ کر درخواست کی اور یہ واقعات امیر جماعت کے علم میں آ گئے۔ اس کے بعد مولانا کی بے چینی کا جو عالم تھا وہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ فون کر کے معلوم کیا کہ برتھ کنفرم ہوئی ہے یا نہیں؟ پھر دلی پہنچنے کے بعد فون آیا کہ کیا مرکز کی گاڑی وقت پر آ گئی تھی؟ پھر میرٹھ پہنچنے کی اطلاع، پھر پروگرام میں بروقت پہنچ جانے کی اور پروگرام کے بخیر و خوبی مکمل ہونے کی اطلاع، یہ سب اطلاعات وہ حاصل کرتے رہے۔ اور واپس ہوتے ہی حاضر ہونے کا حکم دیا۔ اور تفصیل سے سفر کی روداد سنی۔

اسی طرح کا واقعہ چند سال پہلے اس وقت پیش آیا جب مولانا کو امارت سے فارغ ہوئے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ میرے ایک عزیز کا ایک پیچیدہ آپریشن ہونا تھا اور میں انہیں لے کر، حیدر آباد سے مولانا کی خدمت میں دعا کے لیے حاضر ہوا تھا۔ ہمارے گھر کی بعض خواتین بھی ساتھ تھیں۔ شام میں دعا سے فارغ ہونے کے بعد، مولانا نے پہلے رات میں آرام کر کے صبح جانے کے لیے کہا۔ ہم نے مصروفیات کی وجہ سے معذرت کی تو فرمایا کہ رات رک نہیں سکتے تو پھر اب فوری نکل جاؤ، خواتین کے ساتھ دیر رات کا سفر مناسب نہیں۔ فوری ناشتہ منگایا اور بغیر کسی تکلف کے، خود عجلت کر کے رخصت کر دیا۔ یہ بھی مولانا کا مخصوص انداز تھا۔ انہیں روایتوں سے زیادہ اپنے رفقاء کے آرام اور ان کی بھلائی کی فکر رہتی اور اس معاملہ میں کبھی تکلف سے کام نہیں لیتے تھے۔ مہمان کی مرضی کے خلاف اس کی پلیٹ میں باصرار کھانا ڈالنا اور اس کے کاموں میں حرج کر کے اس کو اپنے یہاں روکنا وغیرہ، ان کے نزدیک سخت ناپسندیدہ اور ناشائستہ حرکتیں تھیں۔ اس زمانہ میں یہ بات مشہور تھی کہ مولانا کی یادداشت کافی متأثر ہو گئی۔ اس کے باوجود یہ عالم تھا کہ حیدر آباد پہنچتے ہی مولانا کا فون آ گیا کہ کیسے پہنچے؟ اپنے عزیز کے آپریشن کی جو تاریخ اور وقت بتایا تھا، اس وقت فون، پھر آپریشن مکمل ہوتے ہی فون اور پھر ہسپتال سے ڈسچارج ہونے کی تاریخ کو فون۔۔۔ عام کارکنوں سے یہ تعلق کسی مصنوعی کوشش کے ذریعہ پیدا نہیں ہو سکتا، یہ اللہ تعالیٰ کا عظیم انعام ہے جو رؤف و رحیم نبی ﷺ کے سچے پیروکاروں کو وہ عطا کرتا ہے۔

ایک قائد تحریک کو بنیادی طور پر تین کام کرنے پڑتے ہیں۔ تحریک کے وژن اور سمت کا تعین، اس کے لیے افراد کار کی تربیت اور اس کے حصول کے لیے موثر تنظیمی ماڈل۔ سراج الحسن صاحب نے ان تینوں محاذوں پر بہت سے نئے تجربات کیے۔ ان تجربات کا گہرا اور سنجیدہ مطالعہ ہونا چاہیے۔ ان کے وژن میں دعوت دین کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اپنی تقریروں کے ذریعہ انہوں نے پوری جماعت میں اس کا شعور بیدار کیا۔ غیر مسلموں سے تعلقات و روابط کے نمونے خود بھی قائم کیے اور جماعت کو بھی اس کے لیے آمادہ کیا۔ اس کے لیے کئی ادارے وجود میں لائے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان، ماضی پر فخر، بادشاہوں کے کارناموں کے تذکروں اور اپنے آپ میں رہنے کے بجائے اس وقت کی اپنی ذمہ داریوں پر توجہ دیں۔ اور دعوت دین کے کام پر توجہات کو مرکوز کریں۔ دعوت کے کام کے لیے جس اخلاص، بے لوثی، قومی، فرقہ وارانہ و تاریخی عصبیتوں سے بالاتری وغیرہ درکار تھی، مولانا کی ذات، خود بھی اس کا نمونہ تھی اور وہ اپنی تقریروں سے ان صفات کو اپنے رفقاء میں بھی پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔

ان کا تنظیمی ماڈل کئی امتیازی خصوصیات کا حامل تھا۔ زیادہ سے زیادہ مشاورت اس ماڈل کی اہم خصوصیت تھی۔ کثرتِ مشورہ سے بعض لوگ پریشان بھی ہوجاتے اور معترض بھی ہوتے لیکن مولانا نے ہمیشہ مشاورت کو بہت اہمیت دی۔ اسی طرح ان کے ماڈل کی ایک خصوصیت ڈیلیگیشن تھی۔ اپنے بہت سے کام اور اختیارات انہوں نے اپنے معاونین کو ڈیلی گیٹ کیے اور کام کے بھرپور مواقع ان کو فراہم کیے۔ وہ جانتے تھے کہ ہر کام وہ خود نہیں کرسکتے۔ چنانچہ علمی و فکری رہنمائی کے لیے انہوں نے مولانا جلال الدین عمری، ڈاکٹر فریدیؒ اور ڈاکٹر عبد الحق انصاری جیسی شخصیتوں کو آگے کیا۔ تنظیمی امور میں شفیع مونسؒ صاحب اور محمد جعفر صاحب پر بھرپور اعتماد کیا۔ ملی و سیاسی امور میں شفیع مونسؒ صاحب، سید یوسفؒ صاحب، عبد القیوم صاحبؒ جیسے لوگوں کو کام کے بھرپور مواقع فراہم کیے۔ اس طرح اجتماعی قیادت کی ایک پوری کہکشاں مرکز جماعت میں روشن کردی۔

نوجوانوں اور نئے لوگوں کو آگے لانا اور ان کو ذمہ داریاں دینا، اس تنظیمی ماڈل کی تیسری اہم خصوصیت تھی۔ اپنی پہلی اور دوسری میقات میں جو امرائے حلقہ انہوں نے مقرر کیے، یہ

سارے تقررات ان کے بڑے جرأت مندانہ فیصلے تھے۔ اکثر امرائے حلقہ، اپنے اپنے حلقوں میں نہایت جونیئر تھے۔ لیکن ان کو آگے بڑھا کر انہوں نے جماعت کو تازہ دم کیا اور نئی توانائی اور قوت فراہم کی۔

نوجوانوں کی تربیت کا ان کا انداز بھی نرالا تھا۔ ایک انوکھی روایت، دوروں میں نوجوان امرائے حلقہ کو ساتھ رکھنے کی تھی۔ وہ کثرت سے دورے کرتے اور ریاستوں کے دوردراز مقامات اور دیہاتوں میں بھی تشریف لے جاتے۔ اس موقع پر نوجوان امرائے حلقہ کو ضرور ساتھ رکھتے۔ اس کے ذریعہ ان امرائے حلقہ کو ملک کے مختلف مقامات پر ہورہے اچھے تجربات سے روشناس کراتے۔ اپنے ساتھ رکھ کر اپنی صحبت سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کرتے اور تنظیمی مسائل اور تحریکی کاموں کے آداب اور طور طریقوں کو زیادہ گہرائی کے ساتھ سمجھنے اور سیکھنے کے موقعے بھی فراہم کرتے۔

بحیثیت صدر ایس آئی او مجھے بھی بعض دوروں میں ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ دوروں کے علاوہ دلّی میں جب سرکردہ شخصیتوں سے ملاقاتوں یا اہم اجلاسوں میں شرکت کے لیے تشریف لے جاتے تو اس وقت بھی مجھے طلب فرماتے۔ بعض اہم اور حساس اجلاسوں میں بھی ان کے ساتھ شریک ہونے کا موقع ملا۔ اجلاسوں میں پوری اہمیت دیتے۔ دیگر بڑی شخصیتوں سے تعارف کراتے۔ کئی دفعہ بات کرنے کا بھی موقع فراہم کرتے۔ اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ نوجوانی کے اس دور میں تنظیمی اور قیادتی تربیت کے عمل میں ان صحبتوں سے غیر معمولی فائدہ ہوا ہے۔

2007 سے 2011 ایک میقات مجھے ان کے ساتھ مرکزی مجلس شوریٰ کا رکن رہنے اور ساتھ میں اجلاسوں میں شرکت کرنے کا بھی موقع ملا۔ وہ میری پیدائش سے پہلے سے مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن چلے آرہے تھے۔ میری تحریکی و تنظیمی تربیت انہی کے بلکہ بعض ان کے شاگردوں کے زیر سایہ ہوئی تھی۔ لیکن کبھی شوریٰ کے مباحث کے دوران ایسا محسوس نہیں ہوتا تھا کہ ان قد آور بزرگوں کی موجودگی میں ہم کو بات کرنے میں کوئی تکلف یا دشواری درپیش ہے۔ ہم آزادانہ بات کرتے۔ تجویزیں پیش کرتے رہے۔ اُن کی اور دیگر بزرگوں کی باتوں سے اختلاف بھی کرتے۔ بعض وقت گرما گرم بحثیں بھی کرتے۔ یہ صالح جمہوری روایات

تحریک اسلامی کے کلچر کی بہت بڑی خصوصیت ہے جو مولاناؒ جیسے وسیع الظرف بزرگوں ہی کی دَین ہے۔

اللہ سے گہرے تعلق اور اس کے بندوں سے گہرے تعلق کے درمیان ایک خاص رشتہ ہے۔ اللہ کی محبت ہی انسانوں کے اندر سچی انسان نوازی پیدا کرتی ہے۔ مولانا مرحومؒ کے تعبدی پہلو کو دوروں اور اسفار کے موقعوں پر قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ تہجد کے وقت اٹھنے کی عادت انہوں نے مصروف سے مصروف دنوں میں بھی نہیں چھوڑی۔ صبح کاذب سے پہلے اٹھ کر ٹھنڈے پانی سے غسل اور نماز وتلاوت سے اُن کے دن کی شروعات ہوتی۔ ذکر واذکار کے معمول کی بھی سختی سے پابندی کرتے۔ اللہ نے بعض مخصوص بیماریوں کی شفا ان کے دم اور دعا میں رکھی تھی۔ بواسیر، آدھے سر کا درد اور اس جیسے بعض امراض کے مریض ان کی دعاؤں سے فوری شفا یاب ہوجاتے۔ وہ جہاں بھی جاتے، ایسے مریض ضرور ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ہر جگہ پرانے سے پرانے امراض کی شفایابی کی حیرت ناک داستانیں سننے کوملتیں۔

اللہ تعالیٰ سے گہرا تعلق، اس کے بندوں سے بے پناہ محبت، تمام انسانوں کی ہدایت اور فلاح وکامرانی کی حرص، زندگی کا اعلیٰ وارفع مقصد اور اس کی خاطر جان نچھاور کرنے اور اپنا سب کچھ لگادینے اور لٹادینے کا حوصلہ و جذبہ۔ یہی مومنانہ اوصاف شخصیتوں کو بلندی عطا کرتے ہیں۔ مولانا سراج الحسن صاحب مرحوم اس حوالہ سے یقیناً بہت اونچی اور بہت بلند و بالا کردار کے مالک تھے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ ان کی عظیم قربانیوں اور محنت وجدوجہد کو قبول فرمائے۔ اور تحریک اسلامی کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین۔

پیکر خوئے دلنوازی

محمد عبداللہ جاوید، سابق امیر حلقہ جماعت اسلامی ہند کرناٹک

مولانا محمد سراج الحسن صاحب کی رحلت پر امڈ رہے دلی جذبات کا اظہار الفاظ سے ادا کرنا ممکن نہیں۔ اور نہ یہ ممکن ہے کہ مرحوم کی تقریباً 70 سالہ تحریکی زندگی کا احاطہ کیا جائے۔ ایک طرف آپ کی دلنواز شخصیت ہے جو تحریک اسلامی کے دور اول کے حالات سے لے کر اب تک کی صورت حال کی شاہد رہی۔ اور دوسری طرف شخصیت کے وہ پہلو ہیں جو آپ کی جہد مسلسل کے امین اور اخلاص کے پیکر ہونے کو پوری آب و تاب کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ یہ بندہ درویش سینکڑوں اور ہزاروں باشعور نفوس کا مربی بھی ہے اور ملک کے طول و عرض میں پھیلی تحریک اسلامی کا معمار بھی ہے۔

بلاشبہ تحریک میں موجود رفقاء کی ایک بڑی تعداد مولانا مرحوم سے مستفید ہونے والوں میں سے ہے۔ ان میں کی بھی اکثریت ایسی ہے جو آپ سے خوب فیض پائی ہے اور ان کے اعمال و کردار میں آپ کے اخلاق کریمانہ کی جھلک محسوس کی جاسکتی ہے۔ وطن عزیز کے شمال سے لے کر جنوب تک اور مشرق سے لے کر مغرب تک ایسے رفقاء کی بڑی تعداد ملے گی جن کی زندگیوں میں مولانا مرحوم کے اخلاق کریمانہ کی یادیں سانس بن کر دوڑ رہی ہیں۔ چاہے وہ مرکز یا حلقہ کے ذمہ داران ہوں، عام وابستگان ہوں یا کسی بھی سطح کے کام کرنے والے کارکن۔ یا پھر وہ افراد جو بیرون ملک مقیم ہیں۔ طلبہ و نوجوان، مرد و خواتین کی ایسی بڑی تعداد ہے جن میں سے ہر ایک کے سینے میں مولانا مرحومؒ کے مربیانہ اور مشفقانہ کردار سے متعلق دسیوں واقعات محفوظ ہیں۔ اللہ رب العزت مولانا کی بال بال مغفرت فرمائے، ان کے حسنات کو شرف قبولیت بخشے اور جنت الفردوس عطا فرمائے۔

مولانا محمد سراج الحسن صاحب' سابق امیر جماعت اسلامی ہند' کی رحلت بروز جمعرات' 2اپریل2020 ' عصر کے وقت تقریباً شام5:30 بجے ہوئی۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔اس وقت مولانا اپنے گھر' واقع رائچور میں مقیم تھے۔طویل علالت کے بعد آپ کا انتقال طبعی رہا۔ 20مارچ2020 بروز جمعہ' صبح گھر میں گرنے سے کولہے کی ہڈی پر' جہاں پہلے ہی سے آپریشن ہوا تھا' چوٹ لگی۔اس سے لگے شاک اور پھر ضعیف العمری کی بنا پر طبیعت بڑی تیزی سے بگڑتی چلی گئی۔ بڑی سخت تکلیف میں مولانا مرحوم ہسپتال میں رہے۔طبیعت قدرے بہتر محسوس ہوئی تو 30 مارچ کو ڈسچارج کر کے گھر لایا گیا۔لیکن بات چیت اور جان پہچان بڑی حد تک متاثر تھی۔کبھی کبھار کچھ بات کر لیتے تھے۔محترم امیر مقامی رائچور محمد عاصم الدین اختر صاحب کے ہمراہ ہماری آخری ملاقات ایک دن پہلے ہوئی تھی۔اس وقت مولانا سے سلام کلام اور دعا کی درخواست کی گئی' اس نازک حالت میں بھی مولانا نے زور سے ہاں کی آواز نکالی جس سے صاف محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کہہ رہے ہوں کیوں نہیں آپ بھی میرے لیے دعا فرمائیں۔ مولانا سے ملاقات کے وقت بس یہی کلمات ہوا کرتے تھے' جن کی بہ کثرت تکرار تھی۔جب بھی ملنے اور رخصت ہونے کا وقت آتا' آپ سب جان پہچان والوں سے سلام اور دعا کی درخواست عرض کرنے کی بات ضرور کرتے۔

جس دن مولانا محترم کی روح پرواز ہوئی' اس وقت طبیعت میں کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔آپ حسب معمول ہی رہے۔لیکن بعد ظہر بے چینی محسوس کرنے لگے اور وقت گزرنے کے ساتھ بے چینی میں بھی اضافہ ہوتا گیا' بالآخر عصر کے وقت مولانا محمد سراج الحسن صاحب اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔موت کے حوالے سے حفیظ میرٹھیؒ کا یہ شعر مولانا اکثر سنایا کرتے تھے:

حیات جس کی امانت تھی اس کو لوٹا دی
میں آج چین سے سوتا ہوں پاؤں پھیلا کر

اللہ رب العالمین سے امید ہے کہ وہ مولانا مرحوم کی مومنانہ اور تحریکی جدوجہد سے عبارت طویل زندگی کے عوض انہیں قبر میں سکون سے پاؤں پھیلائے سونے کا موقع بہم

پہنچائے گا' ان کی قبر کو تاحد نظر وسعت دے گا اور اسے نور سے منور کرے گا۔ ان شاء اللہ۔

ابتدائی زندگی

مولانا کی پیدائش بروز جمعہ 6 ذی قعدہ 1351ھ 'بمطابق 3 مارچ 1933 بمقام موضع جولگیرہ' تعلقہ سندھنور' ضلع رائچور ہوئی۔ آپ کے والد کا نام ابوالحسن صاحب اور والدہ کا نام پاشاہ بیگم صاحبہ تھا۔ مولانا اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے۔ آپ کی کل چار بہنوں میں ابھی تین بہنیں باحیات ہیں۔ آپ کا تعلق بڑے ہی مالدار اور خوشحال گھرانے سے تھا۔ اکلوتی نرینہ اولاد ہونے کی بنا پر کسی قسم کی معاشی تنگ ودو کی ذمہ داری نہیں تھی۔ مولانا کے چھ بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ ان کی اہلیہ محترمہ خیر النساء صاحبہ اور ایک بیٹے نجم الحسن صاحب کا چند سال پہلے انتقال ہوا۔

مولانا کے والد ماجد کا بچپن ہی میں انتقال ہونے کے بعد والدہ ماجدہ نے بڑے احسن انداز سے آپ کی تربیت کی۔ مولانا فرماتے تھے کہ ان کے اندر نظم وضبط' امانتوں کا خیال رکھنا' رشتے قائم رکھنا' خدمت کرنا اور ملنساری جیسے اوصاف ان کی والدہ ماجدہ کی بنا پر پروان چڑھے ہیں۔ اولاد کی تربیت میں والدہ کا رول بڑی غیر معمولی اہمیت کا حامل ہوتا ہے' مولانا کی عبقری شخصیت دیکھ کر اس حقیقت کو تسلیم کرنے اور ایسی بے مثال مائیں یقینی بنانے کا جذبہ دلوں میں تازہ ہوجاتا ہے۔

مولانا کی والدہ ماجدہ نے اپنے اکلوتے بیٹے کو' چار بہنوں کی دیکھ بھال اور ان کی زندگی بنانے اور بڑی بڑی آبائی جائیدادوں کی دیکھ ریکھ پر متوجہ کرنے کے بجائے' انہیں دین کے لیے فارغ کیا اور خود' والد کا بھی رول بخوبی نبھاتی رہیں۔ والدہ نے بیٹے کے دینی مزاج اور رجحان کو خوب اچھی طرح سمجھ لیا تھا اور اسی کو صحیح رخ دیتے ہوئے رہنمائی فرمائی' راہ خدا میں سرگرم عمل رہنے کے مواقع بہم پہنچائے اور تاریخ نے سراج الحسن جیسا محسن تحریک اور حسن اخلاق کا پیکر دیکھا۔ مولانا محترم اپنی والدہ ماجدہ کے ان احسانات کا اکثر ذکر فرمایا کرتے تھے۔

مولانا کی عبقری شخصیت کی تعمیر وترقی میں ان کی اہلیہ مرحومہ خیر النساء صاحبہ کا تعاون بھی بڑا غیر معمولی رہا۔ مولانا کثیر العیال ہونے کے باوجود' مکمل یکسوئی سے تحریکی خدمات انجام دیں۔ اس یکسوئی اور پرسکون سفر کی روح رواں آپ کی شریک حیات تھیں۔ بلاشبہ کسی بھی فرد کا

ڈھالنے پر بھرپور توجہ کی اور ان تمام سرگرمیوں سے دور ہونے کی دانستہ کوشش کی جو اسلامی مزاج اور اس کے تقاضوں سے میل نہیں کھاتی تھیں۔ اصلاح حال سے متعلق مولانا نے ایک بڑا ہی غیر معمولی اقدام کیا اور جذبہ ایثار و قربانی کی ایک شاندار مثال قائم کی۔ غالباً یہی وہ حسین ابتدا تھی جس نے مولانا کو تحریک اسلامی کے لیے بیش بہا خدمات انجام دینے کا اہل اور مستحق بنا دیا۔

جیسا کہ معلوم ہے بھارت کی آزادی کے بعد حیدرآباد دکن علاقہ میں 13 تا 18 ستمبر 1948 کے دوران پولیس ایکشن ہوا جس سے کافی بڑے پیمانے پر جانی و مالی نقصانات ہوئے تھے۔ جب بگڑتے حالات دھیرے دھیرے معمول پر آنے لگے، جس میں غالباً دو سال کا عرصہ لگا، تو مولانا اپنے آبائی وطن جولگیرہ آ گئے۔ اس وقت سینکڑوں ایکڑ پر مشتمل آپ کی آبائی زمینیں تھیں جن میں کے بیشتر حصوں پر لوگوں نے پولیس ایکشن اور اس کے بعد کے دنوں میں قبضہ جما لیا تھا۔ اس میں کی صرف چند سو ایکڑ زمینیں عدالت کے ذریعہ سے دوبارہ حاصل ہو سکی تھیں۔ موجود اور مقبوضہ شدہ زمینوں کی مکمل تفصیلات مقامی شرست دار (محاسب) کے پاس تحریری طور پر موجود تھیں اور اس کے بڑے مستند دستاویزات بھی تھے۔

مولانا نے اپنے سارے خاندانوں والوں کو جمع کیا اور کہا کہ اس گاؤں میں ہماری ایسی اور ایسی زمینیں اور جائیدادیں ہیں، ان میں جن جن پر لوگ قابض ہیں ان کی مکمل تفصیلات موجود ہیں۔ میری دانست میں یہ تمام مقبوضہ شدہ زمینیں اور بددیانت لوگ، ایک میل کی مانند ہیں، اور میں چاہتا ہوں کہ آج ہم سب اس گندگی سے پاک ہو جائیں۔ جو ہمارا حق تھا وہ ہمیں دوبارہ مل گیا اور جو مقبوضہ زمینیں ہیں ہو سکتا ہے کہ ان پر ہمارا حق ہی نہ ہو۔ مولانا نے انتہائی جرأت مندانہ انداز میں اپنے خاندان والوں سے کہا" کیا آپ کو سراج الحسن چاہئے یا یہ جائیدادیں جو مزید کوشش سے دوبارہ حاصل کی جا سکتی ہیں؟ "افراد خاندان نے مولانا کا منشا سمجھتے ہوئے ان کے حق میں بات کہی اور جائداد سے دستبرداری کے لیے مکمل طور پر حامی بھر لی۔ اس کے بعد مولانا مرحوم نے ان تمام دستاویزات کو اسی وقت آگ لگا دی۔ جائیداد کے اس معاملہ کو ایسے ختم کر دیا کہ پھر کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ تادم حیات نہ کبھی انہوں نے اس پر کسی قسم کی گفتگو کی اور نہ ہی ان کی اولاد اور افراد خاندان نے۔ البتہ موجود جائیداد میں سے چار

نظر بندی کے اسی دور میں آپ کی ملاقات شہر رائچور کے ایک نوجوان عبدالعزیز صاحب سے ہوئی جو انہیں اپنے سے قریب کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ پھر اس کے بعد آپ کی

ملاقات میرے تایا مرحوم محمد عبد الرحیم صاحب سے ہوئی۔ یہ دونوں حضرات صوفیانہ مزاج کے تھے اور اسی سے متعلق افعال و اعمال پر توجہ دیا کرتے تھے۔ان دو حضرات کے ہمراہ مولانا نے شہر رائچور میں مسلمانوں کی اصلاح و تربیت کے لیے ایک نظم بنام اصلاح المسلمین بنایا تھا۔ یہ کس مدت تک قائم رہا اور اس کے تحت کیا کیا سرگرمیاں انجام دی گئیں' معلوم نہیں البتہ مولانا کے 1950 کے ابتدا ہی میں رکن جماعت بن جانے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نظم کی مدت زیادہ نہیں رہی ہوگی۔

آپ کے رکن جماعت بننے کا محرک بنے مولانا محمد جعفر منیار صاحب مرحوم۔ یہ شہر رائچور کی عثمانیہ مسجد میں درس قرآن دیا کرتے تھے۔ انہیں معلوم ہوا کہ سراج الحسن نامی ایک باصلاحیت نوجوان ہے جس کا فلاں فلاں سے تعلق ہے تو مولانا جعفر منیار صاحبؒ نے فوری ان سے ملاقات کی۔ ملاقاتیں جاری رہیں۔انہیں مولانا مودودیؒ کی کتاب خطبات پڑھنے کو دی۔ پھر مولانا سراج الحسن صاحب نے خود سے اسلام کا بڑا گہرائی سے مطالعہ کیا اور تحریک سے وابستہ ہوگئے۔اس کے بعد عبد العزیز صاحبؒ ان دونوں سے دشمنی پر اتر آئے۔ یہاں تک کہ سڑکوں پر ان پر فقرے کسنا اور ان کی ٹوپیاں اچھالنا روزانہ کا معمول بن گیا تھا۔لیکن ان حضرات کا صبر اور تحمل اور جماعت کی دعوت اور پیغام پر نظریں مرکوز رکھنا' بہتر نتائج کا باعث بنا۔ بالآخر عبد العزیز صاحب بھی رکن جماعت بن گئے۔اور ایسے رکن بن گئے کہ شہر میں انہیں پکے توحید پرست' نظم وضبط کے پابند اور ببانگ دہل حق بات کہنے والے کی حیثیت لوگ جانتے اور پہچانتے تھے۔

مولانا سراج الحسن صاحب سے ہمارا قریبی رشتہ ایسا ہے کہ وہ میرے پھوپھا کے بہنوئی ہیں۔ ہمارے پھوپھی زاد بھائی بہنیں انہیں سراج نانا کہتے تھے۔کبھی کبھار مولانا جان پہچان والوں کے سامنے میرا تعارف صوفی عبد الرحیم کے بھتیجے کی حیثیت سے کراتے تھے' یا کبھی پرمزاح انداز میں کہتے کہ یہ میرے سالے کے سالے کا بیٹا ہے۔

جذبہ ایثار وقربانی کی غیر معمولی ابتدا

اسلام کو شعوری طور پر سمجھنے کے بعد مولانا نے حتی الامکان اس کے مطابق اپنے آپ کو

ڈھالنے پر بھرپور توجہ کی اور ان تمام سرگرمیوں سے دور ہونے کی دانستہ کوشش کی جو اسلامی مزاج اور اس کے تقاضوں سے میل نہیں کھاتی تھیں۔ اصلاح حال سے متعلق مولانا نے ایک بڑا ہی غیر معمولی اقدام کیا اور جذبہ ایثار وقربانی کی ایک شاندار مثال قائم کی۔ غالباً یہی وہ حسین ابتدا تھی جس نے مولانا کو تحریک اسلامی کے لیے بیش بہا خدمات انجام دینے کا اہل اور مستحق بنادیا۔

جیسا کہ معلوم ہے بھارت کی آزادی کے بعد حیدرآباد دکن علاقہ میں 13 تا 18 ستمبر 1948 کے دوران پولیس ایکشن ہوا جس سے کافی بڑے پیمانے پر جانی ومالی نقصانات ہوئے تھے۔ جب بگڑتے حالات دھیرے دھیرے معمول پر آنے لگے، جس میں غالباً دو سال کا عرصہ لگا، تو مولانا اپنے آبائی وطن جولگیرہ آگئے۔ اس وقت سینکڑوں ایکڑ پر مشتمل آپ کی آبائی زمینیں تھیں جن میں کے بیشتر حصوں پر لوگوں نے پولیس ایکشن اور اس کے بعد کے دنوں میں قبضہ جمالیا تھا۔ اس میں کی صرف چند سو ایکڑ زمینیں عدالت کے ذریعہ سے دوبارہ حاصل ہوسکی تھیں۔ موجود اور مقبوضہ شدہ زمینوں کی مکمل تفصیلات مقامی شرست دار (محاسب) کے پاس تحریری طور پر موجود تھیں اور اس کے بڑے مستند دستاویزات بھی تھے۔

مولانا نے اپنے سارے خاندانوں والوں کو جمع کیا اور کہا کہ اس گاؤں میں ہماری ایسی اور ایسی زمینیں اور جائیدادیں ہیں، ان میں جن جن پر لوگ قابض ہیں ان کی مکمل تفصیلات موجود ہیں۔ میری دانست میں یہ تمام مقبوضہ شدہ زمینیں اور بد دیانت لوگ، ایک میل کی مانند ہیں، اور میں چاہتا ہوں کہ آج ہم سب اس گندگی سے پاک ہوجائیں۔ جو ہمارا حق تھا وہ ہمیں دوبارہ مل گیا اور جو مقبوضہ زمینیں ہیں ہوسکتا ہے کہ ان پر ہمارا حق ہی نہ ہو۔ مولانا نے انتہائی جرأت مندانہ انداز میں اپنے خاندان والوں سے کہا" کیا آپ کو سراج الحسن چاہئے یا یہ جائیدادیں جو مزید کوشش سے دوبارہ حاصل کی جاسکتی ہیں؟ "افراد خاندان نے مولانا کا منشا سمجھتے ہوئے ان کے حق میں بات کہی اور جائداد سے دستبرداری کے لیے مکمل طور پر حامی بھر لی۔ اس کے بعد مولانا مرحوم نے ان تمام دستاویزات کو اسی وقت آگ لگادی۔ جائیداد کے اس معاملہ کو ایسے ختم کردیا کہ پھر کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ تادم حیات نہ کبھی انہوں نے اس پر کسی قسم کی گفتگو کی اور نہ ہی ان کی اولاد اور افراد خاندان نے۔ البتہ موجود جائیداد میں سے چار

بہنوں کے درمیان فی کس 140 ایکڑ زمین تقسیم کردی۔

تحریکی خدمات کا آغاز

تحریک اسلامی کے بالکل ابتدائی دور'1958' میں مولانا محمد سراج الحسن صاحب پر پہلے حلقہ میسور اور پھر اس کے بعد حلقہ کرناٹک کی امارت کی ذمہ داری ڈالی گئی۔جنوبی ہند کی اس ریاست کی تشکیل گرچہ 1956 میں ہوئی لیکن پہلے اس کو ریاست میسور کے نام سے جانا جاتا تھا' اس کے بعد 1973 میں اس کا نام کرناٹک پڑا۔غرض آپ کے حلقہ کا دور امارت 1958 سے 1984 'کل 26 سالوں پر مشتمل رہا۔اس دور کی کارکردگی سے نہ صرف تحریکی قیادت کے خدوخال واضح ہوتے ہیں بلکہ مخلص ساتھی، ذمہ داران اور باشعور مامورین کے اخلاص' نصب العین کے گہرے شعور' راہ خدا میں صبر واستقلال کے ساتھ جدوجہد کے نت نئے رنگ پے در پے عیاں ہوتے ہیں۔بس جاننے اور سمجھنے کی تڑپ ہو تو اس دور کا بامعنی طریقے سے احاطہ کیا جاسکتا ہے۔یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ تحریک اسلامی کا کامیاب مستقبل' شاندار وژن اور اعلی منصوبہ بندی کے علاوہ' ماضی کی تاریخ اور اس کے درخشاں پہلوؤں کو ساتھ لے کر چلنے میں مضمر ہے۔تحریک کے کارکنوں کو تاریخ سے رشتہ اسی غرض کے لیے قائم رکھنا چاہیے تاکہ وہ ان خوبیوں کو اپنا سکیں جن کی بنا پر تحریک اور افراد تحریک کو سرخروئی اور سربلندی نصیب ہوئی تھی اور ان خامیوں کے ازالے کی کوشش کریں جن کی بنا پر' افراد تحریک کی پیش رفت' مطلوبہ معیار کے مطابق نہیں رہی۔تحریک کا نصب العین چونکہ انبیائی ہے' اس لیے لازم ہے کہ رفقائے تحریک انہی آئیڈیلس پر کھرا اترنے کی پوری کوشش کریں جو دین کا خاصہ رہی ہیں' ورنہ قرآن مجید یہ وعید پیش کرتا ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّونَهُ... (سورہ المائدہ:۵۴)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے (تو پھر جائے) اللہ اور بہت سے لوگ ایسے پیدا کر دے گا جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ اُن کو محبوب ہوگا۔

ذیل کی چند سطریں اسی ضمن کی ایک کوشش ہے۔

مولانا نے اپنے گہرے مطالعہ اور صحبت صالح سے شعوری طور پر اسلام کو بحیثیت نظام حیات سمجھا تھا۔اسی کا ثمر آپ کا وہ تحریکی مزاج تھا جس کے حسین جلوؤں سے طویل دور امارت مزین رہا۔آپ امارت حلقہ کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد تحریک کو اس کے طول وعرض میں وسعت دینے کے لیے جی جان سے لگ گئے۔حلقہ کے مختلف مقامات کے کثرت سے دورے کرتے۔ پیدل، سواری پر، بیل گاڑی پر، بس میں، بعض مقامات پر کشتی میں۔سفر کے جتنے بھی ممکنہ طریقے تھے، مولانا نے ان سب کو اختیار کیا۔چھوٹے بڑے مقامات پر تحریک کی مضبوط بنیادیں ڈالیں۔باشعور مرد وخواتین تیار کیے۔تحریک کے لیے درکار افراد اور ضروری وسائل حاصل کرنے کی کوشش کی، مخالفتوں کا مومنانہ شان سے مقابلہ کیا، ناسازگار حالات کے باوجود حرکت وعمل کو یقینی بنایا۔رب کا فضل کہ یہ انفرادی واجتماعی تحریکی سرگرمیاں ایک ایسے دور میں انجام پائیں جبکہ اسلام کا پختہ شعور کم ہی پایا جاتا تھا، اسلام کے بجائے کسی اور ہی مقصد کے لیے مسلمان سرگرداں تھے، اس صورت میں اسلام کو سمجھنے، سمجھانے، دل سے ماننے، اس پر چلنے اور اس کے مطابق اطراف کا ماحول تیار کرنے کے لیے انہیں تیار وآمادہ کرنا، بڑی جرأت، حوصلہ اور صبر واستقلال چاہتا تھا۔

اس دوران آپ نے افراد سازی، تربیت، تنظیمی استحکام کے علاوہ دعوت پر بڑی خاص توجہ فرمائی۔آغاز میں کام چونکہ زیادہ پھیلا نہیں تھا، اس لیے مولانا کے علاوہ حلقہ میں بس ایک محاسب ہوا کرتا تھا۔لیکن کام بڑھنے کے باوجود، مولانا نے تنظیمی سیٹ اپ ہلکا ہی رکھا۔پہلے ڈاکٹر محمد مقبول صاحبؒ کا بحیثیت آفس سکریٹری تقرر ہوا، اس کے بعد محمد عبدالمجید صاحبؒ اس ذمہ داری کے لیے مقرر کئے گئے۔

مولانا کے تحریکی جذبے اور انتھک جدوجہد کو مزید جلا بخشنے اور پروان چڑھنے والوں میں اس وقت کے امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابواللیث اصلاحیؒ کا رول بڑا اہم رہا۔مرحوم حلقہ سے متعلق سرگرمیوں کو نہ صرف قریب سے جانتے اور سمجھتے تھے بلکہ اکثر وبیشتر انفرادی ملاقاتوں کے ذریعہ آپؒ کی رہنمائی فرمایا کرتے تھے۔مولانا محمد سراج الحسن صاحبؒ تین شخصیات سے بڑی عقیدت ومحبت رکھتے تھے، ان سے جب بھی ملتے، معانقہ اس طرح کرتے کہ آپ کا سران

کے سینے سے نیچے ہو جاتا تھا۔ ان شخصیات میں مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ لکھنؤ مولانا ابوسعود صاحبؒ بانی دارالعلوم سبیل الرشاد بنگلور اور مولانا انعام الرحمٰن خان صاحبؒ بھوپال ہیں۔

تحریکی خدمات کی دو جہتیں' دعوت وتربیت

بحیثیت ذمہ دار آپ نے جن امور پر بطور خاص توجہ فرمائی وہ دعوت وتربیت ہے۔ دعوت سے متعلق کاوشوں میں کنڑا زبان میں لٹریچر کی اشاعت پر توجہ اہم ترجیحات میں سے تھی۔ بطور خاص قرآن وسنت سے متعلق بنیادی کتابیں منظر عام پر لانے کی منصوبہ بند کوشش کی۔ معلوم تاریخ کے مطابق 1965 سے لے کر 1988 تک مختلف مقامات اور افراد کے حوالے سے منظّم کوششیں ہوئیں۔ 1965 میں' ہبلی کے ایم ایس شیخ صاحبؒ کی زیر نگرانی کنڑا دارالاشاعت کا قیام عمل میں لایا۔ پھر جناب ابراہیم خلیل اللہ خان صاحبؒ کی ذمہ داری میں ساہتیہ پرکاشنا کے نام سے بنگلور میں نظم قائم کیا۔ 1983 میں آئیڈیل پبلی کیشن' منگلور میں قائم کیا۔ اس کے بعد مولانا محمود خان صاحبؒ کے توسط سے منگلور ہی میں دارالاشاعت' شانتی پرکاشنا کا قیام عمل میں آیا۔ جو الحمد للہ اب ریاست کرناٹک کے کنڑی دارالاشاعتوں میں بڑے معیاری اور نامور ادارہ کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔

مولانا کی زیر نگرانی کنڑا ہفت روزہ اخبار سنمارگ کی شروعات 1978-79 کے دوران ہوئی۔ ان تمام کاموں کے لیے افراد کی تیاری کا کام بھی بیک وقت ہوتا رہا۔ پہلے ایم ایس شیخ صاحبؒ ہبلی اس کاز کے لیے یکسو ہوئے۔ ایمرجنسی کے بعد ابراہیم سعید صاحبؒ اس کاز میں' بینک کی ملازمت سے مستعفی ہوکر' جٹ گئے اور سنمارگ سنبھالا۔ کنڑا زبان میں لٹریچر کی فراہمی کے لیے باصلاحیت افراد تیار کیے جس کی فہرست میں کئی نام شامل ہیں' جن میں سید یوسف صاحبؒ عبدالغفار صاحبؒ سلیا' سعد اللہ صاحب' عبدالسلام پتیگے صاحب اور بی ایش شرف الدین صاحب قابل ذکر ہیں۔

مولانا محمد سراج الحسن صاحب نے کنڑا میں لٹریچر کی تیاری کے لیے ان تمام مراحل پر توجہ مرکوز رکھی۔ علاوہ ازیں برادارن وطن کی اہم شخصیات سے روابط وتعلقات کے لیے مختلف سرگرمیاں بھی جاری رکھیں۔ رفقائے جماعت کو کار دعوت کے لیے تیار کرنا بھی اپنی ترجیحات

میں شامل رکھا۔ آپ اپنی ملاقاتوں، گفتگوؤں اور تقاریر میں اسی پر زور دیا کرتے تھے۔ مستقل مزاجی کے ساتھ لوگوں سے روابط وتعلقات قائم کرنے پر آپ کی کافی توجہ تھی۔ مولانا کی عام نصیحتوں میں سے ایک اس سے متعلق بھی ہوا کرتی، آپ کہتے کہ "کسی سے ملاقات کرنا بڑی بات نہیں بلکہ تعلقات بنانا اور انہیں قائم رکھنا، بڑی بات ہے"۔ اس ضمن میں مولانا بے لوث تعلقات قائم کرنے پر توجہ دیتے تھے۔ اور جو رفقاء ساتھ ہوتے ان سے بھی تاکیداً کہا کرتے تھے کہ باثر افراد سے روابط وتعلقات کو ذاتی مفادات کے لیے ہرگز استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ اس سلسلہ میں آپ خاص حکمت عملی اختیار کرتے تھے۔ کسی شخصیت سے ملاقات کے لیے ساتھ رہنے والے رفقاء کا انتخاب سوچ سمجھ کر کیا کرتے۔ اپنے تجربہ اور مشاہدے کی بنیاد پر ایسے لوگوں کو آپ اچھی طرح جان جاتے تھے جن کے نزدیک تحریک سے زیادہ کوئی اور مفاد عزیز ہوتا تھا۔ اور ایسے لوگوں کے لیے کسی اور طریقے سے استفادہ کی راہیں نکالتے۔ مولانا اس بات کے قائل تھے کہ قیادت بھی اور رفقاء بھی شریف النفس ہوں لیکن اس کے قائل نہیں تھے کہ وہ انتہائی بھولے بھالے ہوں کہ انہیں کوئی بھی، کبھی بھی جھانسا دے سکتا ہو۔

مولانا کی ملاقاتیں بڑی بڑی شخصیات سے ہوتی تھیں، جن کے اثرات اور وسائل کے کیا کہنے لیکن مولانا کی ان سب سے بے نیازی اور آپ کا قلندرانہ مزاج، تعلقات میں بلا کی مٹھاس پیدا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ بعض حضرات مولانا سے محبت اور انسیت کی ایسی ایسی باتیں کہہ جاتے تھے جو آج شاذ و نادر ہی سننے کو ملتی ہیں۔ جیسا کہ بقول برادرم محمد فائز الدین، سوامی شنکر آچاریہ نے حیدرآباد تا وجے واڑہ سفر کے دوران یہ بات کہی تھی کہ "اگر ایشور نے مجھ سے میری آخری خواہش معلوم کی تو میں کہوں گا کہ سورگ میں مجھے مولانا محمد سراج الحسن صاحب کے قریب جگہ دے"۔ ایک مرتبہ مولانا مرحوم نے خود ملاقات کے موقع سے اس بات کا ذکر کیا تھا کہ ایک مرتبہ شنکر آچاریہ جی دعوت افطار کے لیے مدعو تھے۔ جب افطار کا وقت قریب آیا تو موصوف نے گزارش کی کہ افطار کے لیے مولانا اپنے منھ سے کھجور توڑ کر انہیں دیں۔ غرض مختلف سیاسی، مذہبی اور سماجی شخصیات کی قابل لحاظ تعداد مولانا سے بڑی عقیدت رکھتی تھی۔

لوگوں کے دلوں میں ایسی محبت کا پیدا ہونا استقلال سے اعمال صالحہ کی انجام دہی سے

ممکن ہے، جس کا ذکر قرآن مجید میں .....

اِنَّ الَّذِینَ اٰمَنُوا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحاتِ سَیَجعَلُ لَھُمُ الرَّحمٰنُ وُدًّا۔ (سورہ مریم:۹٦)

یقیناً جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور عمل صالح کر رہے ہیں عنقریب رحمٰن اُن کے لیے دلوں میں محبت پیدا کر دے گا۔

.... کے ذریعہ کیا گیا ہے۔ اور دوسری اہم چیز، بے رغبتی اور بے نفسی ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے انسانوں کی محبت کے حصول کے لیے ایسا ہی زاہدانہ مزاج ضروری قرار دیا ہے:

اِزھَد فِیمَا عِندَ النَّاسِ یحِبُّکَ النَّاس

لوگوں کے پاس جو کچھ ہے ان سے بے نیاز ہو جاؤ، لوگ تم سے محبت کریں گے (مشکوۃ المصابیح)۔

مولانا مرحوم کے بقول اس پس منظر میں علامہ اقبال کے یہ اشعار کتنے صادق آتے ہیں:

یہ غازی، یہ تیرے پُر اسرار بندے
جنھیں تُو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دونیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سِمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذّتِ آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کِشور کشائی

.... بہر حال! لوگوں کی مولانا سے محبت و عقیدت کو ان کے شخصی اوصاف سے جوڑ کر دیکھنا چاہیے، کمال مولانا کا نہیں تھا بلکہ ان کے ان اوصاف حمیدہ کا تھا جو صرف اسی جسم کا حصہ بن سکتے ہیں جو ذوق خدائی سے مزین ہو، جس میں رب سے محبت کرنے والا دل، رب کے خیال میں مگن رہنے والا دماغ، اور رب ہی کی خاطر تڑپنے اور پھڑکنے والے اعضاء ہوں۔

لوگوں کے درمیان دعوت دین کی خاطر کام کرنے والوں میں استقلال کے ساتھ اعمال

صالحہ انجام دینے کا مزاج اور زاہدانہ کیفیت کا ہونا لازمی ہے۔ یہ نہ ہو تو دعوت دین سے دین نکل کر صرف دعوت رہ جائے گی۔ جو کبھی سطحی مفادات کی جانب تو کبھی جی حضوری کی طرف لے جائے گی، جس سے بہتر نتائج تو دور خود اس داعی کا ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ اس لیے داعی حق سے یہ تقاضا ہے کہ وہ ہر طرح کے مفادات سے بالاتر ہو کر دعوت دین میں مصروف رہے:

وَ مَا اَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔ (سورۃ الشعراء:۱۰۹)

میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو ربّ العالمین کے ذمّہ ہے۔

قرآن مجید میں یہ آیت، محض ایک اخلاقی قدر کے طور پر بیان نہیں ہوئی بلکہ مختلف دور میں آنے والے جلیل القدر پیغمبر اور انبیاؑ نے اس کا ذکر اپنی اپنی قوم کے سامنے کیا ہے۔ قرآن مجید کے مختلف مقامات کے علاوہ حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت لوطؑ، حضرت شعیبؑ کے حوالے سے اس کا بڑے دلنشین پیرائے میں ذکر سورۃ الشعرا کی آیات 109 تا 180 کے درمیان کیا گیا ہے۔ اس سے اللہ کے دین کی طرف دعوت دینے والوں کے لیے بے نفسی، بے لوثی اور بے نیازی کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ کار دعوت کے لیے، داعی اپنے اندر جس قدر بے نفسی کی دنیا بسائے گا، اسی قدر وہ لوگوں کی ایک مثالی دنیا بسانے میں کامیاب ہوگا۔

مولانا تربیت کے لیے رفقائے جماعت سے شخصی روابط کے قائل تھے، یعنی آپ کا طریقہ تربیت فطری تھا۔ ہر ایک رکن و کارکن کا نام یاد رکھنا، ان کی جماعت سے وابستگی کا معیار پرکھنا، راہ خدا میں جدوجہد کی کیفیت معلوم کرنا، ان کے گھریلو حالات سے واقفیت رکھنا، ان کے نجی اور کاروباری مسائل حل کرنا، جب بھی ان سے ملاقات ہو ان کے نام سے انہیں بلانا، سفر میں ساتھ رکھنا، دن ہو یا رات ان کے لیے بے دریغ وقت فارغ کرنا، ... یہ اور اس طرح کے دیگر قلبی امور مولانا کے ذرائع تربیت تھے۔ کسی بھی رفیق کو اپنے امیر سے ملنے میں کسی تذبذب کا شکار ہونا نہیں پڑتا تھا۔ ہر ایک کو یقین ہوتا تھا کہ میرا امیر میرے لیے فارغ ہے۔ اسلامی قائد کے بنیادی اوصاف میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے مامورین کے لیے بآسانی ملنے والا ہو۔

ظاہر بات ہے جس قائد تک اس کے اپنے مامورین ہی کی رسائی ممکن نہ ہو تو بھلا وہ اس تحریک کا علمبردار کیسے بن سکتا ہے جو تمام انسانوں کی فلاح و کامرانی کا منصوبہ لے کر اٹھی ہے؟

مولانا کے انداز تربیت میں بعض امور کا بکثرت اور بہ تکرار اظہار بھی شامل رہا۔ اکثر رفقائے جماعت کو اس کا بخوبی احساس ہے کہ مولانا اپنے خطابات میں اکثر و بیشتر اہم امور کی وضاحت کو شامل رکھتے تھے۔ اس وقت کے احساسات کیا ہوتے تھے یہ تو ہر فرد جائزہ لے کر خود جان سکتا ہے لیکن اب اگر مولانا کی ان باتوں پر غور کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ہی کبھی وہ باتیں پھر سننے کو ملیں؟ ایسا لگتا ہے کہ زندگی بھر کے لیے زادراہ کے طور پر مولانا نے اہم امور کی بہ کثرت تذکیر فرمادی۔

تحریک کے ابتدائی دور سے لے کر ایک خاصے عرصہ تک مولانا نے اپنے منصوبے، گفتگو اور تقاریر کے لیے بعض امور کو موضوع بنالیا تھا جیسے وسعت فکر، وسعت قلب، وسعت نظر، وسعت ظرف، فکر و نظر کا ارتقاء، وسعت قلب کی اہمیت، تحریک اسلامی کے رہنمایانہ رول کی اہمیت و ضرورت وغیرہ۔ قائد تحریک کی زبانی ان امور کی بار بار وضاحت اور اس کا قول و عمل گویا ایک طرح کا حسین امتزاج بنا جس کی وجہ سے اس وقت کے وابستگان کی علمی، فکری اور عملی استعداد قابل قدر تھی۔ ان کی جماعت سے وابستگی، تحریک سے والہانہ لگاؤ، جذبہ ایثار و قربانی، تقریباً یکساں تھا، ہر طرح کے منصب، پوزیشن اور سطحی مفادات سے بالکل بے نیاز۔ تحریک کے لیے کچھ کر گزرنے کے واسطے ان نیک نفوس کے نزدیک بس ایک بات کافی تھی کہ وہ اللہ کی خاطر اللہ کی تحریک سے وابستہ ہیں۔

مولانا کی احتیاطی تدابیر اور اس کے ثمرات

دعوت و تربیت پر توجہ دینے اور رفقاء کو آپس میں جوڑے رکھنے کے لیے مولانا مکمل یکسو اور فارغ تھے، علاوہ ازیں آپ نے بعض احتیاطی تدابیر بھی اختیار کر رکھی تھیں۔ اور جب تک وہ جس سطح کے بھی ذمہ دار رہے ان تدابیر پر سختی سے کاربند رہے۔ جیسے رفقاء میں خود پسندی و خودنمائی پیدا نہ ہو، ان میں منصب کی چاہت پیدا نہ ہو، جماعت میں دھڑے بندیاں نہ ہوں، شورائیت کا مکمل لحاظ ہو، جماعت کے لیے جائیدادیں جمع کرنے کا مزاج نہ ہو، جماعت کے تحت

ادارہ جاتی ذہنیت کا فروغ نہ ہو‘ رفقاء جماعتی سرگرمیوں کے علاوہ دیگر کاموں میں بہت زیادہ مصروف نہ ہوں وغیرہ۔ان تدابیر پر عمل پیرا ہونے کے لیے مولانا نے اپنے آپ کو نظم کا غیر معمولی حد تک پابند بنالیا تھا۔ چنانچہ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ شاید ہی کبھی مولانا کی طے شدہ ترجیحات میں کوئی فرق واقع ہوا ہو یا متعینہ دورے اور پروگرام ملتوی ہوئے ہوں۔ان تدابیر پر مولانا کے قولاً اور عملاً کاربند رہنے کا حاصل بھی اسی کے شایان شان رہا۔اس ضمن میں دو اہم باتیں ہمارے سامنے واضح ہو کر آتی ہیں۔

پہلی بات: جماعت کا داخلی ماحول‘ تمام طرح کے ہنگاموں‘ وقتی اور جذباتی اقداموں سے محفوظ رہا۔رفقاء میں نصب العین کے تئیں متانت وسنجیدگی پیدا ہوئی‘ مقصد کی خاطر کچھ کرگزرنے کا جذبہ پروان چڑھا۔اس پہلو کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لینا چاہئے۔اس بات کے پیش نظر کہ حلقہ کرناٹک میں مولانا تقریباً 26 سال ذمہ دار رہے‘اس کے باوجود نہ بڑی بڑی جماعتی جائیدادیں بنیں اور نہ ہی اداروں کی کثرت۔اس کے پیش نظر دیکھ لیں‘ جماعتی اثاثوں میں شہر بنگلور‘ان مقامات سے پیچھے نظر آئے گا جہاں حلقے کے دفاتر ہیں‘ بطور خاص جنوبی ہند کی ریاستوں میں۔ جماعت کے تحت ذیلی اداروں کے قیام سے متعلق مولانا کا یہ موقف رہا کہ جب تک داخلی صورت حال مستحکم نہ ہو‘ خارج میں توسیع پر زیادہ توجہ نہیں دینی چاہئے۔مولانا مرحوم نے جماعت کے قیام کے بعد کے ابتدائی دہوں میں سہولتیں اور مواقع ہونے کے باوجود‘ جماعت کو اس کے مقصد اور متعینہ طریقہ کار ہی کی حد تک محدود رکھا۔املاک کی کثرت اور ادارہ جاتی امور کی بہتات سے باقاعدہ دور رہے اور اپنے رفقاء کو بھی ان سے بچائے رکھا۔ مولانا کے اس موقف پر کلام کی گنجائش ہے‘ لیکن موجودہ صورت حال میں یہی اصول بڑا قابل عمل معلوم ہوتا ہے کہ خارج میں اثر انداز ہونا‘ داخل کے استحکام کے بغیر ممکن نہیں۔لوکل باڈیز کے انتخابات اور سیاسی پارٹی میں حصہ لینے کے لیے مرکز نے مقامی جماعتوں کے لیے داخلی استحکام کے حوالے سے یہی اصول متعین کیا ہے۔اگر اس کا لحاظ نہ رکھا جائے تو کسی بھی مقام پر بنا بنایا ماحول‘ ذمہ داریوں کے بوجھ تلے‘ بوجھل معلوم ہوگا۔اس حقیقت کا اندازہ‘ ذیلی اداروں اور تنظیموں کے قیام کے بعد مطلوبہ تعداد میں افراد کے نہ ملنے‘ نتیجتاً ایک ایک فرد پر کئی کئی ذمہ

داریاں عائد ہونے کی ایک عمومی کیفیت سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔اب اس کیفیت سے شاید ہر مقام اور حلقہ دوچار ہے۔غالبًا یہ تاثر بھی پختہ تر ہوتا چلا جارہا ہے کہ تحریک پر تنظیم بھاری پڑتی جارہی ہے۔

دوسری بات: ان تدابیر پر عمل پیرا ہونے کی بناپر' مولانا کے افکار وخیالات اور تربیت کے لیے کی جانے والی انفرادی واجتماعی کوششوں میں بلا کی کشش پیدا ہوگئی تھی۔ جب وہ کہتے کہ ہمیں عمارتیں نہیں افراد بنانے چاہئیں' ہمیں لوگوں کے لیے دیوار نہیں دروازہ بننا چاہئے' چھوٹوں کی ترقی سے بڑوں کو خوشی ہونی چاہئے' ہمارا سینہ دوسروں کے رازوں کا قبرستان ہونا چاہئے' منصب کی چاہت سے بڑھ کر نصب العین کا حصول عزیز ہونا چاہئے' تنگ ذہنی اور تنگ دامنی کے مقابلہ میں وسعت نظر وقلب پیدا کرنا چاہئے وغیرہ وغیرہ تو ان کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ محض چند الفاظ تھے' بلکہ وہ ایک قائد کی دوراندیشی پر مبنی سراسر خیرخواہی کے جگر پارے تھے جو رفقائے جماعت کو اخلاص وللّٰہیت اور جہد مسلسل کا پیکر بنانے کے لیے ترغیب وترہیب کا پورا مادہ رکھتے تھے۔

میر کارواں

مولانا محمد سراج الحسن صاحبؒ ایک اچھے قائد تھے۔وہ قیادت جو شجر ہائے سایہ دار کی طرح شفقت و رحمت کی پیکر ہو' وہی قیادت (paternalistic leadership) تحریک اسلامی کے مزاج ومنہاج سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔مولانا مرحوم کی شخصیت اس طرز کی قیادت کے لیے بڑی جچتی تھی۔مرحوم خود مثالی قیادت کے سلسلہ میں یہ اشعار سنایا کرتے تھے:

نگہ بلند' سخن دلنواز' جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے

اور

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیر کارواں میں نہیں خوئے دلنوازی

قیادت' قود سے ہے جس کے معنی کسی کے آگے چلنا' رہنمائی اور رہبری کرنا۔اسلام نے

قیادت کا تصور خیر خواہی کے جامع تصور سے دیا ہے۔فرد اپنی ذات کے لیے بھی خیر خواہ ہو اور ان لوگوں کے لیے بھی جن کا وہ ذمہ دار بنایا گیا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کے اس ارشاد مبارک سے خیر خواہی کا یہی تصور مترشح ہوتا ہے:

مَا مِنْ عَبْدٍ اسْتَرْعَاهُ اللّٰهُ رَعِيَّةً فَلَمْ يَحُطْهَا بِنَصِيحَةٍ اِلَّا لَمْ يَجِدْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ (صحیح بخاری - بروایت معقل بن یسارؓ)۔

''جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کو کسی گروہ کا امیر بناتا ہے اور وہ خیر خواہی کے ساتھ ان کی حفاظت نہیں کرتا تو وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا''۔

قیادت کے حوالے سے مولانا مرحوم کے چند نمایاں اوصاف کا یہاں ذکر کیا جارہا ہے۔

(۱) جهد پیهم

مولانا کی قائدانہ زندگی کے سفر کا آغاز 1952 سے ہوتا ہے۔اگر اس دور کی سرگرمیوں اور اس سے قبل آپ کی تربیت کے لیے کی گئی کوششوں کو دیکھیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شخصیت سازی کے لیے درکار تمام ابتدائی لوازمات کی تکمیل متذکرہ سال سے قبل ہی ہو چکی تھی۔اس کے بعد آپ کی راہ خدا میں سرگرمیاں، ذمہ داران کی تربیت و رہنمائی اور وابستگان جماعت کی رفاقت نے شخصیت کی تعمیر میں اہم کردار نبھایا ہے۔

مولانا مرحوم نے نہ صرف صحبت صالح پائی تھی بلکہ اسلامی لٹریچر کا بڑی یکسوئی اور گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔اس وقت کے بڑے مصنفین جیسے علامہ شبلی نعمانیؒ علامہ سلیمان ندویؒ مولانا مودودیؒ مولانا اشرف علی تھانویؒ وغیرہ کی کتابوں کے مطالعہ کے علاوہ عصری علوم میں تاریخ، سماجیات اور ادبیات سے متعلق خاصی کتابیں پڑھ رکھی تھیں۔اس غرض کے لیے آپ نے عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد سے شائع شدہ بیسیوں کتابیں اپنی ذاتی لائبریری میں رکھی تھیں۔جو فی الوقت حلقہ کرناٹک کی لائبریری میں موجود ہیں۔قیادت کے لیے ان لازمی اجزا کے علاوہ مولانا کی خصوصی عبادات کا پہلو بھی بڑا خاص تھا۔ بلکہ دن کی شہسواری کے لیے درکار قوت و صلاحیتیں، رات کی راہبانہ زندگی ہی سے نصیب ہوتی ہیں۔اس پہلو سے مولانا کی زندگی کا حصہ بننے والے معمولات میں پابندی اور تسلسل کے ساتھ تہجد، نفل روزوں، ذکر و اذکار، دعاؤں کا اہتمام

خاص تھا۔

عبادات کا التزام، صحبت صالح اور مطالعہ ان کے ہمراہ مولانا کی زمینی جدوجہد ایک عبقری شخصیت کی تعمیر میں ممد ومعاون رہی۔ مولانا بڑی کثرت سے دورے کیا کرتے تھے۔ شروع میں خال خال ہی جماعتی نظم تھا، بس کھلے میدان، غیر ربط مقامات اور نا آشنا افراد ہی ان کے لیے جماعت کی حیثیت رکھتے تھے۔ مولانا کہتے ہیں کہ 1952 سے دوروں کا آغاز ہوا اور دھیرے دھیرے بڑھتا گیا اور جب 1958 میں آپ پر امارت حلقہ کی ذمہ داری ڈالی گئی تو بڑی باقاعدگی اور پابندی کے ساتھ دورے ہونے لگے۔ آپ سے قبل شہر ٹمکور کے مولوی محمد عبد الحکیم عمری صاحب حلقہ کے ذمہ دار تھے۔

اس وقت کی سفر کی سہولتیں بڑی محدود ہوا کرتی تھیں۔ شروعات میں مولانا نے کرناٹک کے شمالی علاقوں کا دورہ سواری نہ ملنے پر پیدل بھی کیا ہے۔ جب کبھی آپ کے ساتھ سفر ہوتا وہ ان مقامات کی نشاندہی کرتے جہاں وہ پیدل آیا جایا کرتے تھے۔ لنگسگور سے چھاؤنی پھر مدگل۔ نیر مانوی سے مانوی۔ گنگاوتی سے کارٹگی وغیرہ۔ اکثر دورے علی الصبح سے لے کر عصر یا اس سے تھوڑی دیر بعد تک کے لیے ہوا کرتے تھے۔ کیونکہ آنے جانے کے لیے بسوں کی سہولت بہت کم تھی۔ اگر کسی وجہ سے کسی مقام پر قیام کرنا پڑے تو مسجد میں سو جایا کرتے تھے۔ اکثر کھانے پینے کی مشکل پیش آتی تھی۔ اس لیے دورے میں آپ اپنے ساتھ کچھ کھانے پینے کی چیزیں رکھ لیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی رفیق جماعت بھی ساتھ ہوتا تھا جیسے مولانا محمد جعفر منیار صاحبؒ، مولوی محمد قاسم صاحبؒ، مولوی محمد اسحاق صاحبؒ وغیرہ۔

جب حلقہ بنا تو دوروں کی نوعیت میں فرق آیا۔ آپ اپنی ٹو وہیلر تو کبھی میٹاڈور گاڑی کا استعمال کرتے تھے۔ ٹو وہیلر پر سفر اور دورے کے بھی بڑے دلچسپ واقعات مولانا سنایا کرتے تھے۔ معلوم تاریخ کے مطابق 1960 تک آپ نے ریاست کرناٹک اور گوا کے تقریباً مقامات کا احاطہ کر لیا تھا۔ حلقہ میں جیسے جیسے کام پھیلتا گیا، دوروں کی نوعیت میں بھی فرق آتا گیا، البتہ کثرت برقرار تھی۔ فرق سے مراد یہ کہ اور بھی ذمہ داران کے دورے ہونے لگے۔ اس دوران جن مقامات پر کام شروع ہوا ان میں ریاست کرناٹک کے تمام ہی بڑے بڑے اضلاع اور

مقامات شامل تھے، جن کو چار علاقوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ جن افراد پر ذمہ داری ڈالی گئی ان میں مولانا محمود خان صاحبؒ محمد جعفر منیار صاحبؒ ایم ایچ شیخ صاحبؒ اور میر محمد جعفر صاحبؒ جن کے تحت بالترتیب گلبرگہ، رائچور، ہبلی اور بنگلور علاقے تھے۔

جب 1984 میں آپ حلقہ کرناٹک سے مرکز جماعت، دہلی منتقل ہوئے اس وقت یہاں تقریباً100 ارکان جماعت تھے جبکہ ریاست کے بیشتر مقامات پر یا تو مقامی نظم قائم تھا یا بڑی حد تک جماعت کا تعارف ہو چکا تھا اور متاثرین اور متفقین کی قابل لحاظ تعداد رہتی تھی۔

مرکز جماعت جانے کے بعد 1984 سے 1990 ،ان چھ سالوں کے دوران آپ نے 3500 ارکان جماعت سے انفرادی ملاقاتیں کیں۔ مولانا کی غیر معمولی خدمات میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ یہ محض ارکان جماعت سے انفرادی ملاقاتیں صرف بغرض تربیت نہیں تھیں بلکہ ایک خاص مقصد کے تحت تھیں۔ اس دوران جماعت ایک سنگین داخلی مسئلہ سے دوچار تھی۔ بعض کا خدشہ تھا کہ کہیں جماعت بٹ نہ جائے۔ یہ مسئلہ ووٹ کی شرعی حیثیت کو لے کر کافی سنگین رخ اختیار کرلیا تھا۔ اس سے متعلق ڈاکٹر حسن رضا صاحب، رانچی لکھتے ہیں:

"الیکشنی سیاست اور ووٹ دینے اور نہ دینے جیسے ایشوز نے تحریکی حلقوں میں اصل ایشوز کی شکل اختیار کرلی تھی جس سے تحریک کی داخلی فضا گرد آلود ہو رہی تھی ان حالات میں اپنے صاف و شفاف رویے، لینت اور مشفقانہ کردار، بے لوث محبت واخوت اور ایک دوسرے کی رایوں کے احترام اور کسر وانکسار سے انھوں نے دھیرے دھیرے تنظیم کو بڑی آزمائش سے بچا لیا۔ وہ منوں مٹی کے ڈھیر کے نیچے دفن ہیں لیکن ان کے اس احسان کا بوجھ جماعت اسلامی ہمیشہ محسوس کرے گی اور آنے والی تحریکی نسلیں اس کو یاد رکھیں گی بالخصوص آج کی نسل اس لیے کہ اب تحریک تیسری نسل میں داخل ہو چکی ہے اور اس کا بوجھ آئندہ اس نسل کو اٹھانا ہے"۔

اس مسئلہ کے حل کے لیے مولانا کے کثرت سے دورے، ہر رکن جماعت سے ملاقات اور اس کو مطمئن کرنے کی کوشش بڑی حد تک کامیاب رہی۔ مولانا کہتے تھے کہ ملاقاتوں میں بعض ارکان جماعت کی جانب سے بڑی سخت اور تلخ گفتگو ہوتی تھی۔ ارکان کی نشست میں کہیں سختی تھی تو کہیں مولانا کی آمد کی غرض ہی پر سوالات اٹھائے جاتے تھے۔ لیکن آپ کی قوت

برداشت، صبر اور حلم و بردباری جیسے اخلاق حسنہ رب کریم کی رحمتوں کے دروازے کھولنے کے موجب بنے۔ مولانا بڑے مفکر وفقیہ نہیں تھے کہ جو اپنے رفقاء کو ایک نازک اور شرعی مسئلہ کو علمی فقہی دلائل کے ساتھ مطمئن کرتے، بس آپ کا صبر، شکایتوں اور اعتراضات کو سننا، ان کا واجبی جواب دینا اور سب سے بڑھ کر ہر رفیق کو اس کے مثبت یا منفی رویے کے علی الرغم گلے لگانا، کمال کر دکھایا۔ اس لیے تحریکی حلقوں میں اس بات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ مولانا نے گلے لگا کر مسائل حل کر دیے۔

وابستگان کا ان کے اپنے انفرادی و اجتماعی مسائل کے علی الرغم تحریکی قیادت سے چمٹ کر رہنا، بیرون کی دنیا کے وسائل اور صلاحیتوں سے بڑھ کر، قائد کی صالحیت سے بڑا گہرا تعلق رکھتا ہے۔ قرآن مجید، اللہ کے رسول ﷺ کے حوالے سے کیا خوب تذکیر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے:

(اے پیغمبرؐ) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ اگر کہیں تم تند خو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمہارے گردوپیش سے چھٹ جاتے۔ (سورہ آل عمران: ۱۵۹)

(۲) تحریکی خیر خواہی

مولانا محمد سراج الحسن صاحب کے قائدانہ اوصاف میں سے ایک نمایاں وصف خیر خواہی کا تھا۔ تحریک کی خیر خواہی، محض چند الفاظ نہیں بلکہ یہ ان اصولوں اور اخلاقی رویوں کا مجموعہ ہے جن سے قائد کے احساس ذمہ داری اور افراد جماعت کی وابستگی کی روح معلوم کی جاسکتی ہے۔ خیر خواہی گویا ایک معیار ہے، امیر اور مامورین، دونوں کی تحریک سے متعلق فکر مندی اور جدوجہد معلوم کرنے کا، یہ اندازہ لگانے کا کہ امیر و مامورین کے درمیان سمع و طاعت اور مل جل کر کام کرنے کے جذبات و احساسات کی کیفیت اور نوعیت کیا ہے؟

جماعت کے داخلی نظم کے استحکام میں خیر خواہی کا عنصر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ خیر خواہی سے مراد جماعت کو راہ راست پر رکھنا، جماعتی فکر کو کسی طرح سے متاثر نہ ہونے دینا۔ افراد جماعت کو، جماعت کی بنیادی فکر کے لحاظ سے مضبوط کرنا۔ جماعت کے نظریہ میں کسی قسم کی

تبدیلی نہ آنے دینا۔ ہر مقام پر جماعت کے قیام کو معروفات کے فروغ اور منکرات کے ازالہ کا مرکز بنانا۔ تمام سرگرمیوں میں صحت مند طریق کار ملحوظ رکھنا۔ جماعتی اصولوں کی ہر حال میں پاسداری کرنا۔ کسی فرد یا افراد کو تعاون دینے اور لینے کے متعینہ اصولوں کی پابندی کرنا۔ وابستہ افراد کی فکری و عملی تربیت پر توجہ دینا..... یہ تحریکی خیر خواہی کا چارٹر ہے۔ ان سارے امور سے متعلق مولانا نے بڑی محنت و جانفشانی سے خدمات انجام دیں۔ اوپر دعوت اور تربیت کے حوالے سے جو گفتگو ہوئی ہے اس سے اس کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مولانا کے جذبہ خیر خواہی کی شہادت رفقائے جماعت کی زندگیاں دیتی ہیں اور آپ سے محبت و عقیدت کے جذبات میں ڈوبے وہ تمام تعزیتی پیغامات بھی جو مختلف مسالک اور جماعتوں سے وابستہ افراد اپنے اپنے انداز سے تحریر فرما رہے ہیں۔

تحریکی خیر خواہی کے سلسلہ میں آپ نے بعض خصوصی تجربات بھی کئے۔ ان میں سے دو تجربات کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے۔

پہلا تجربہ: حلقوں کے درمیان دوروں سے متعلق تھا۔ یعنی شمال سے جنوب، جنوب سے شمال، جنوب سے مزید جنوب، مشرق سے مغرب، ان علاقوں میں موجود حلقوں کا دورہ مولانا خود بھی کرتے اور ذمہ داران حلقہ اور دیگر افراد کو بھی اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ جنوب کے ذمہ داران کو شمال کے دورے میں ساتھ رکھتے اور شمال کے ذمہ داران کو جنوب بھیجتے۔ یا پھر ان کے دورے طے کراتے۔ چونکہ حلقہ کیرلا میں کام نسبتاً زیادہ مستحکم ہے اس لیے مختلف حلقوں کے ذمہ داروں کا یا تو شیڈول بنا کر وہاں بھیجتے یا پھر خود اپنے ساتھ لے جاتے۔ غالباً آپ کے دور امارت میں رہے تقریباً امرائے حلقہ جات اور حلقہ جات کے بعض ذمہ داروں نے مولانا کے اس مشاہداتی تجربہ سے استفادہ کیا ہے۔

تنظیموں کی کارکردگی کا مشاہدہ کئی لحاظ سے ترغیب کا ذریعہ بنتا ہے۔ نہ صرف طے شدہ منصوبہ کے نفاذ کی صورت حال عملاً دیکھنے کا موقع ملتا ہے بلکہ افراد سے کام لینا، مسائل حال کرنا، مقصد کے حصول کے لیے حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھنا، ٹیم اسپرٹ کی حقیقت جاننا سب ممکن ہوتا ہے۔

ایس آئی او نے اپنے منصوبہ میں بین الریاستی مشاہدات کے لیے باضابطہ مواخاۃ کا نظم (Brotherhood System) بنایا تھا جس میں ایک شمال کے حلقہ کو جنوب کے حلقہ سے جوڑ دیا گیا تھا۔ ملک معتصم خان صاحب کے دور صدارت میں اس منصوبہ کو روبہ عمل لانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اچھی طرح یاد ہے کہ حلقہ کرناٹک کو اتر پردیش سے، حلقہ آندھرا پردیش کو بہار سے، حلقہ کیرلا کو مغربی بنگال سے اور مہاراشٹر کو مدھیہ پردیش سے جوڑ دیا گیا تھا اور ہدایت تھی کہ ہر دو حلقوں کے درمیان دوروں، اہم پروگراموں اور افراد کا تبادلہ ہوتا رہنا چاہیے۔

بین الریاستی تجربات و مشاہدات کی یہ رسم پھر سے تازہ کی جاسکتی ہے۔ امید کہ اس سے مطلوبہ حرکت میں کمی یا جمود کی کیفیت، جس درجہ میں بھی موجود ہو، دور ہو جائے گی۔

دوسرا تجربہ: مولانا نے ایسے کئی بااثر نوجوان علما اور باصلاحیت افراد کو الگ الگ مقامات پر منتقل ہونے کے لیے آمادہ کیا تھا تاکہ ان کے ذریعہ دینی تعلیم عام ہو اور جماعتی کام کی توسیع میں بھی مدد ملے۔ ایسی کئی شخصیات ہیں جن میں سے اکثر بہار، مغربی بنگال، اتر پردیش وغیرہ سے آکر جنوبی ریاستوں میں ہمیشہ کے لیے قیام پذیر ہو گئے۔ اس میں کہیں مولانا کا راست تو کہیں بالراست دخل رہا۔ ان شخصیات میں آندھرا پردیش سے مولانا احمد محی الدین صاحب، جولگیرہ قیام پذیر ہوئے، یہیں سے جمال احمد امین آبادیؒ بنگلور تشریف لائے، بہار سے مولانا عبدالقدیر اصلاحیؒ ہاسن، اتر پردیش سے مولانا ایوب اصلاحیؒ اڑپی، مولانا طارق فارقلیط فلاحیؒ ارے ہلی ضلع، ہاسن، مولانا اسماعیل فلاحی اور مولانا سید منور فلاحی، ساگر ضلع شموگہ قیام پذیر ہوئے۔ ان شخصیات میں سے بعض نے انہی علاقوں میں مستقل رہائش اختیار کی اور بعض ایک خاصی مدت کے بعد اپنے وطن واپس ہوئے۔ اس ضمن میں متحدہ آندھرا پردیش، مہاراشٹر اور دیگر ریاستوں میں ہوئے تجربات بھی معلوم کرنے چاہئیں۔

تحریکی مفاد کے پیش نظر اگر رفقاء میں ایسے جذبہ سمع و طاعت اور ایثار قربانی کا احیاء ہو تو بعید نہیں کہ شمال مشرقی ریاستوں کے علاوہ ہماچل پردیش، پنجاب، ہریانہ، چھتیس گڑھ، اڑیسہ جیسی ریاستوں میں تحریکی جڑیں اسی طرح مضبوط و پائیدار ہوں گی جس طرح اب ملک کی شمالی وجنوبی ریاستوں کا معاملہ ہے۔

بحیثیت قائد تحریک مولانا کے نمایاں اوصاف اور خصوصیات کا ذیل میں ذکر کیا جارہا ہے۔

(۳) اقامت دین کے موقف کا اصولی تعارف

مولانا کی گفتگو‘ ملاقاتیں‘ روابط وتعلقات اور تقریریں سب کی سب اقامت دین کے نصب العین کے مطابق رہتی تھیں۔ اقامت دین آپ کی ہمہ جہت کوششوں کا مرکز ومحور تھا۔ سب سے پہلے آپ نے اپنی ذات کو اس کے مطابق ڈھالا اور ان تمام سرگرمیوں سے دانستہ دوری اختیار کرلی جو نصب العین کی طرف نہیں جاتی تھیں۔ پھر اپنا ہر انفرادی واجتماعی کام اسی نصب العین کے تابع رکھا۔ بندگی رب کی دعوت‘ اسوہ رسول اللہ ﷺ کا اتباع‘ انسانوں سے بے لوث تعلقات اور کسی فرد یا گروہ کی بجائے مقصد کی طرف دعوت جیسے امور پر آپ کی بھرپور توجہ تھی۔ ترجیحات کا تعین‘ دورے‘ تقاریر اور دروس کے علاوہ وعظ ونصیحت کی محفلوں میں انہی پر زور دیا کرتے تھے۔ حتی کہ کسی مسجد یا مدرسہ کے لیے قرآنی آیات کی نشاندہی کی فرمائش کی جاتی تو آپ انہی آیات کا انتخاب کرتے جو تحریکی نصب العین سے میل کھاتی ہیں۔ جو مساجد اور مدارس مولانا کی زیر سرپرستی بنے ہیں یا جن کا آپ نے افتتاح کیا ہے وہاں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے‘ ان سب کے درودیوار سورہ آل عمران‘ سورہ النساء‘ سورہ المائدہ‘ سورہ الحجرات اور سورہ الحشر وغیرہ کی آیات سے مزین ہیں جن کی تلاوت وتشریح‘ اقامت دین اور اسلام کے نظام حیات ہونے کی وضاحت کے طور پر کی جاتی ہے۔

افراد کی تربیت میں یہ پہلو اس طرح نمایاں رہتا کہ مولانا اقامت دین کے داعی بننے کی ترغیب دلایا کرتے تھے۔ ہر رفیق جماعت‘ مرد وخواتین سے مطالبہ تھا کہ وہ کسی گروہ یا ازم کی طرف دعوت دینے کے بجائے‘ اسلام کی دعوت دیتے ہوئے اقامت دین کے داعی بنیں۔ آپ اس بات کی پرزور وضاحت کرتے تھے کہ اگر رفقائے تحریک اقامت صلاۃ کے پابند نہ ہوں تو وہ اقامت دین جیسا بڑا کام انجام نہیں دے سکتے۔ لہذا ہر فرد سے مطالبہ تھا کہ وہ اقامت صلاۃ کا بھی داعی بنے۔ نماز ہی وہ معیار ہے جس کے ذریعہ بخوبی معلوم کیا جاسکتا ہے

کہ اقامت دین کا کون اہل ہے اور کون اس کے لیے کتنا یکسو ہے؟ آپ اس کی مثال یوں دیا کرتے کہ بڑے پکوان کے ذمہ دار باورچی سے جب یہ پوچھا جائے کہ کھانا تیار ہوا ہے یا نہیں تو وہ صحیح جواب دینے کے لیے پوری دیگ نہیں دیکھتا بلکہ چند دانوں سے پتہ چلا لیتا ہے کہ کھانا پک کر تیار ہوا ہے یا نہیں۔ اسی طرح داعی الی اللہ ہونے والوں کی پہچان ان کے داعی الی الصلاۃ سے کی جاسکتی ہے۔

مولانا اس بلند نصب العین کے عین مطابق افراد تحریک کے اخلاق و کردار کی آبیاری کے لیے وسعت قلب و نظر کی وضاحت کرتے، اعلیٰ ظرفی اور صبر و استقامت کے ساتھ جہد پیہم کو ضروری قرار دیتے۔ آپ اپنی تقاریر میں جو آیات اکثر پڑھا کرتے ان میں سے یہ آیت بڑی نمایاں تھی جو نصب العین کے رنگ میں رنگ جانے کے لیے رفقاء جماعت کو تیار و آمادہ کرتی ہے:

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّ نَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ۔ (سورۃ البقرہ:۱۳۸)۔

اللہ کا رنگ اختیار کرو۔ اس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہوگا؟ اور ہم اسی کی بندگی کرنے والے لوگ ہیں۔

اقامت دین کے موقف کی اصولی وضاحت کے ضمن میں آپ کی وہ تمام ملی اور دعوتی سرگرمیاں بھی شامل ہیں جن کا مختلف پیراؤں میں ذکر کیا جاتا ہے۔ اس سے متعلق چند تفصیلات جذبہ بہی خواہی اور رابطہ عامہ کے حوالے سے نیچے پیش کی جارہی ہیں۔

(۴) جذبہ بھی خواہی

اقامت دین کے نصب العین کا تعارف کرانے کے لیے مولانا سماجی اور سیاسی حالات کے پیش نظر اقدامات ضروری سمجھتے تھے۔ اور جب کبھی موقع ملتا، بلاتاخیر پیش قدمی کرتے۔ آپ نے دور امارت کے موقع سے صدر ہند، نائب صدر ہند، وزیر اعظم کے بشمول مختلف مرکزی و ریاستی وزراء سے ملاقاتیں کی ہیں۔ مولانا ان سیاسی لیڈران میں سے یا تو کسی کے ہاں تشریف لے جاتے یا پھر انہیں دفتر جماعت مدعو کرتے تھے۔ ان ملاقاتوں میں آپ نے ملک اور باشندگان ملک سے بہی خواہی کا حق ادا کرتے ہوئے مختلف امور و مسائل پر گفتگو کی ہے اور اسلام کے پیش کردہ حل کا بڑے واضح انداز سے ذکر کیا ہے۔

مولانا کے مزاج میں معاشرتی پہلو نمایاں تھا' وہ میدان کے بھی آدمی تھے۔لوگوں سے ملنا جلنا' ان کے مسائل سے واقفیت حاصل کرنا اور انہیں حل کرنے کی بساط بھر کوشش کرنا' آپ کا خاص وصف تھا۔ جذبہ بہی خواہی سے مراد یہ کہ ملاقات چاہے کسی فرد سے ہو یا کسی گروہ یا ادارے سے' ان کی بھلائی چاہنا' ان تک اقامت دین کا پیغام یا اس کا کوئی نہ کوئی پہلو واضح کرنا مولانا ضروری سمجھتے تھے۔ پورے اخلاص کے ساتھ اس کی وضاحت بھی کرتے تھے۔آپ سے ملنے جلنے والے اس وصف کو اچھی طرح جانتے تھے اور حسب ضرورت استفادہ کے لیے مدعو بھی کیا کرتے تھے۔اس ضمن میں بنگلور کی قدیم تنظیم سنٹرل مسلم اسوسی ایشن' الامین گروپ وغیرہ قابل ذکر ہیں جن کی تنظیمی نشستوں میں مولانا بحیثیت مدعو خصوصی شریک رہتے اور اپنے مشوروں سے انہیں درکار رہنمایانہ خطوط فراہم کرتے۔

یہ جذبہ بہی خواہی افراد اور تنظیموں کے علاوہ فرد سے متعلق بھی بڑا نمایاں تھا۔آپ کی جن مذہبی' ملی' سیاسی اور سماجی سرکردہ شخصیات سے ملاقاتیں ہوئی ہیں ان سے ہمیشہ بہی خواہانہ رویہ روا رکھا۔اختصار سے کام لیتے ہوئے یہاں چار واقعات کا ذکر کیا جارہا جن میں حالات اور تقاضے الگ الگ ہیں لیکن داعی کا مطمح نظر ایک:

پہلا واقعہ: مولانا نے ایمرجنسی کے دوران تقریباً 21ماہ جیل میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔اس وقت ریاست کرناٹک کے وزیراعلی دیوراج ارس جی تھے۔جیل سے رہائی کے کچھ عرصہ بعد مرحوم عزیز سیٹھ صاحبؒ نے مولانا کی وزیراعلی سے ملاقات کرائی۔اس کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ وقفے وقفے سے جاری رہا۔ایک مرتبہ جب دیوراج ارس جی بیمار پڑے تو مولانا ان کی مزاج پرسی کے لیے تشریف لے گئے۔اس وقت تک وزیراعلی کی مولانا سے کافی شناسائی ہوچکی تھی۔جب آپ ان کی مزاج پرسی کو آئے تو دیوراج ارس جی نے کہا ہم نے آپ پر ظلم ڈھایا' کئی مہینوں تک جیل میں بند رکھا اور کچھ زیادہ سہولتیں بھی فراہم نہیں کرسکے' اس کے بعد ہماری کئی ملاقاتیں ہوئیں لیکن آج تک آپ نے اس بارے میں ایک بار بھی شکایت نہیں کی' کیوں؟ پھر اس کے بعد کہا کہ لوگ میرے پاس کوئی نہ کوئی مقصد یا کام اور اپنے مسائل لے کر آتے ہیں لیکن آپ جب بھی آتے ہیں صرف ملاقات ہی پر اکتفا کرتے ہیں؟ ان سب

کی وجوہات کیا ہیں؟

مولانا نے اپنا موقف واضح کیا' ملکی قوانین کے احترام' جماعت کے طریقہ کار اور بے لوث انسانی تعلقات کی وضاحت فرمائی۔ پھر بات آگے بڑھاتے ہوئے نصب العین کے پیش نظر کہا کہ سیاست اقدار کی بنیاد پر ہونی چاہئے۔ بغیر کسی قدر کے سیاست' سیاست نہیں ظلم ہے۔ بہرحال ملاقات ہوئی' مولانا تشریف لے گئے۔ اس ملاقات وگفتگو کا اثر یہ ہوا کہ (دیگر سیاسی وجوہات کا بھی کچھ دخل رہا شاید) دیوراج ارس جی نے بعد میں نہ صرف وزیراعلی کی کرسی چھوڑ دی بلکہ اس پارٹی سے بھی سبکدوشی اختیار کرلی جس سے وہ وابستہ تھے' پھر اپنی ایک الگ پارٹی کرانتی رنگا قائم کرلی۔

دوسرا واقعہ: 1991 میں ایس آئی او کے ہیڈکوارٹر واقع دہلی کا افتتاح تھا۔ اجلاس کی صدارت مولانا محمد سراج الحسن صاحب ؒ فرما رہے تھے جس میں نامور صحافی آنجہانی کلدیپ نیر جی بھی مدعو تھے' یہ جب تقریر کرنے لگے تو سامعین کو ان کی مذہب بیزاری بڑی نمایاں طور پر محسوس ہو رہی تھی' انہوں نے تخریب کاری وغیرہ کے کچھ حوالے دیتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ انسانی سماج کے لیے مذہب کی قطعاً ضرورت نہیں۔ پھر کہا کہ جس مذہب سے سماج میں انتشار پیدا ہوتا ہو اس مذہب کو صرف گھر ہی میں رکھنا چاہئے۔ مولانا مرحوم نے اپنی صدارتی خطاب میں کلدیپ جی کے ان خیالات پر بڑے دلنشین انداز میں گفتگو کی۔ مولانا نے ان کی اس بات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اگر مذہب سے تخریب کاری بڑھتی ہے اور سماج میں انتشار پیدا ہوتا ہے تو ایسے مذہب کو نہ دل میں رکھنا چاہئے اور نہ ہی گھر میں.......... پھر خطاب کے دوران مولانا نے ایس آئی او کی مرکزی بلڈنگ کی جانب توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا کہ اگر یہ عمارت اپنے مقصد کے لیے کام نہ آئے تو ایک دن مقبرہ بن جائے گی۔

مولانا کی اس بات میں سامعین کے لیے یہ واضح پیغام تھا کہ اگر لوگوں کو ان کا اپنا مقصد حیات ہی معلوم نہ ہو تو ان کی انفرادی واجتماعی زندگیاں اور ان کا سماج کسی کھنڈر سے کم نہیں ہوگا۔ سوال یہ نہیں کہ مذہب ہونا چاہئے یا نہیں' بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ مذہب کا تصور کیا ہے اور اس کے ذریعہ سماج کی تعمیر کیسے ممکن ہے؟

تیسرا واقعہ: غالباً 1993 کی بات ہے، سید یوسف صاحبؒ محمد جعفر صاحب اور ابوالنصر عابر صاحب کے ہمراہ مولانا ٹائمز آف انڈیا کے اڈیٹر گری لال جین جی سے ملاقات کے لیے ان کے گھر پہنچے۔ گری لال جی اسلام اور مسلمانوں سے متعلق متعصّبانہ نظریہ رکھتے تھے جو ان کے اخبار میں شائع ہونے والے اداریہ وغیرہ سے ظاہر ہوتا تھا۔ بہرحال جب یہ حضرات ان کے ہاں پہنچے تو خیر خیریت دریافت کی اور گفتگو آگے بڑھی۔ گری لال جی کی باتوں سے ان کے متعصّبانہ نظریہ کی جھلک صاف طور پر محسوس کی جارہی تھی۔ اسی دوران گفتگو میں انہوں نے اپنی بیٹی کا ذکر کیا جو اسلامی تاریخ پر تحقیق کرنا چاہتی تھی، کہا کہ میں نے اس کو بتایا کہ ایسی تاریخ پر کیوں تحقیق کرنا چاہتی ہو جس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ جس اسلام کے نام پر الگ ملک بنا آج اس کے دو ٹکڑے ہو چکے ہیں وغیرہ۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد مولانا نے پینے کے لیے پانی مانگا۔ کچھ دیر بعد ان کی وہی بیٹی پانی لے کر آئی۔ مولانا نے ان کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لیا اور اسی وقت اس لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھ کر خوب دعائیں دیں۔ پھر کیا تھا، لڑکی بڑی حیرت سے مولانا کو کچھ دیر تک تکتی رہی اور پھر دوڑ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنی ماں کے ہمراہ اس کمرے میں آئی جہاں یہ سب حضرات موجود تھے۔ گری لال جی کی اہلیہ کے ہاتھوں میں ضیافت کے لیے پھل اور مٹھائی وغیرہ تھے۔ ان کی اہلیہ نے کہا کہ آپ کے پاس سینکڑوں لوگ آتے ہیں لیکن کبھی کسی نے آپ کی بیٹی کو ایسی دعائیں نہیں دیں۔ اور آپ ہیں کہ ان کی ضیافت کا کچھ بھی انتظام نہیں کیا۔

اس صورت حال کی بنا پر مزید گفتگو کی گنجائش نکل آئی اور گری لال جی نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ دیکھئے میں جماعت اسلامی اور آر ایس ایس کو خوب اچھی طرح جانتا ہوں، ان دونوں تنظیموں پر ایمرجنسی کے دوران پابندی لگی تھی۔ میں اس ملک کا مستقبل سیکولرزم میں نہیں دیکھتا بلکہ اس کا مستقبل کسی مذہب سے ہی وابستہ ہوسکتا ہے۔ لہٰذا آپ جماعت کے لوگوں کو آر ایس ایس کے ذمہ داروں کے ساتھ گفت وشنید کرتے ہوئے کوئی لائحہ عمل اختیار کرنا چاہئے تاکہ ملک کا بہتر مستقبل یقینی بنایا جا سکے۔

گری لال جی کی جانب سے یہ بڑی غیر معمولی بات اور تجویز تھی۔ مولانا نے انہیں اسلام

سے متعلق کتابوں کے مطالعہ کا مشورہ دیا۔موصوف نے کہا کہ میں نے اسلام سے متعلق کتابیں پڑھی ہیں لیکن مجھے کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوسکی۔ پوچھے جانے پر کون سی کتابیں کہاں سے لاکر پڑھیں تو انہوں نے دہلی کے جامع مسجد بازار کا حوالہ دیا۔انہیں بتایا گیا کہ ہمارے پاس اسلام سے متعلق مستند کتابیں ہیں وہ ہم آپ تک پہنچائیں گے۔اس پر گری لال جی نے کہا کہ ضرور بلکہ کسی فرد کو اس کام کے لیے لگادیں اگر اسلام سے متعلق کوئی بات مجھے سمجھ آگئی تو آپ اس کا اثر میری تحریروں میں دیکھ سکیں گے۔ان تک کتابیں پہنچائی گئیں' چنانچہ جب انہوں نے کتابوں کا مطالعہ کیا تو اس کے بعد ان کی تحریروں میں اسلام کے خلاف باتیں دیکھنے کو نہیں ملیں۔

چوتھا واقعہ: 2003 کے اواخر کی بات ہے' کرناٹک کے سابق وزیر اعلی رام کرشنا ہیگڑے جی سے ملاقات کے لیے مولانا ان کی رہائش گاہ پہنچے۔اس وقت موصوف کی طبیعت بہت ہی ناساز تھی۔ جب آپ ملاقات کے لیے ان کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ اپنے بستر سے اٹھ نہ سکے۔مولانا حالت کی نزاکت دیکھ کر خود ان کے بستر کے قریب کھڑے رہے' مزاج پرسی کی' خیر خیریت دریافت کی۔ وہ صرف اپنے سر سے اشارہ کررہے تھے' کچھ کہنا ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔اس کے بعد مولانا نے ان کے ماتھے پر اپنا ہاتھ رکھا اور کہا کہ میں آپ کے اور میرے خالق اور پربھو سے آپ کی اچھی صحت کے لیے دعا کرتا ہوں۔ مولانا کا یہ کہنا تھا کہ ہیگڑے جی کی آنکھوں سے زاروقطار آنسو نکلنے لگے۔انہوں نے مولانا کا ہاتھ بہت دیر تک اپنے ہاتھ میں تھامے رکھا۔مولانا نے ان سے جانے کی اجازت چاہی اور نکلنے ہی والے تھے کہ ان کے گھر کے کسی فرد نے مولانا کا ہاتھ پکڑا اور دعا کی درخواست کی۔ مولانا ان کے ہمراہ گھر کے باہر تشریف لائے' اس دوران آپ نے دعوت کا احسن انداز سے ذکر فرمایا اور کہا کہ میں کنڑا زبان کی چند کتابیں بھیجتا ہوں آپ ان کو پڑھ کر سنائیں۔ اس واقعہ کے چند دنوں بعد رام کرشنا ہیگڑے جی کا انتقال ہوگیا۔

(۵) رابطہ عامہ

عوامی روابط سے متعلق مولانا کے اصول متعین تھے۔

1) پہلا یہ کہ کسی طے شدہ مقصد کے تحت ملاقات ہو۔

2) دوسرا یہ کہ وہ مقصد کسی متعین مسئلہ یا مسائل سے متعلق حل یا موقف پر مشتمل ہو۔

3) تیسرا یہ کہ مدعو یا مدعوئین کو قبل از وقت مطلع کرنا اور طے شدہ موقف یا اصولوں کی اچھی تیاری کرنا۔

4) اور چوتھا یہ کہ خود مدعو کے پاس جانے کا اہتمام کرنا اور بہت ہی ناگزیر ہو تب ہی مدعو کو اپنے ہاں بلانا۔

رابطہ عامہ کے تحت مولانا کی ملاقاتیں برائے نام ملاقاتیں نہیں ہوتیں بلکہ اقامت دین کا کوئی نہ کوئی پہلو؛ حالات اور ضروریات کے مطابق کسی نہ کسی پیغام کی وضاحت کے پیش نظر رہتی تھیں۔ ملی، مذہبی، سماجی اور سیاسی شخصیات سے روابط و تعلقات کی تقریباً نصف صدی سے زائد کی تاریخ ہے، اس دوران سینکڑوں ملاقاتیں ہوئی ہیں، آپ کی زندگی کے اس ایک پہلو پر بھی تحقیقی کام انجام دیا جاسکتا ہے جس سے نہ صرف رابطہ عامہ سے متعلق تفصیلات معلوم ہوں گی بلکہ وہ اصول اور طریقہ کار بھی واضح ہوگا جس کو آپ نے اختیار کیا تھا۔ علاوہ ازیں رابطہ عامہ کے ثمرات اور برکات کی تفصیلات بھی منظر عام پر آئیں گی۔

مولانا جب تک بنگلور میں رہے رابطہ عامہ کے لیے سید سراج الدین صاحبؒ اور شبیر احمد خان صاحب کو اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ کبھی کبھار عبدالمجید صاحبؒ بھی شریک ہوجاتے۔ جب آپ کا قیام مرکز میں رہا تب مولانا محمد رفیق قاسمی صاحب اور اعجاز احمد اسلم صاحب کے علاوہ حسب ضرورت دیگر مرکزی ذمہ داران کو اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے۔

بے لوث روابط و تعلقات کے بڑے غیر معمولی اور دیرپا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جب سید سراج الدین صاحبؒ کا انتقال ہوا تو ایک رفیق کے سامنے مولانا مفتی محمد اشرف علی صاحبؒ نے کہا کہ میرے اور جماعت کے درمیان کا رابطہ چلا گیا۔ یعنی کسی فرد جماعت کا ربط و تعلق، پوری جماعت کا ربط و تعلق سمجھا جاتا ہے۔ خیر جب 2009 میں مولانا کی اہلیہ کا انتقال ہوا تو بنگلور سے شہر رائچور تعزیت کے لیے تشریف لانے والوں میں سرفہرست امیر شریعت، مولانا مفتی محمد اشرف علی صاحبؒ تھے۔

رابطہ عامہ کے ثمرات میں سے مولانا کی اس خدمت کا بھی شمار کیا جاسکتا ہے کہ آپ نے

تقریباً45سال لوگوں کے درمیان ازدواجی رشتہ قائم کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ معلومات کے مطابق انجینئر محمد رفیع صاحب، رکن جماعت بنگلور کا رشتہ آپ نے 1971 میں کرایا تھا۔ محدود اندازہ کے مطابق چند ہزار رشتے تو ضرور ہوں گے جو مولانا کی زیر سرپرستی طے پائے۔ یہ سب کام آپ بڑی خاموشی سے انجام دیا کرتے، کبھی کہیں تشہیر نہیں ہوتی تھی۔ اس سلسلہ میں مولانا کا یہ معمول تھا کہ لڑکا اور لڑکی کے خاندان والوں کو آپس میں متعارف کراتے اور کہتے کہ جو جو معلومات چاہیے وہ ہم سے حاصل کرلیں لیکن فیصلہ آپ لوگوں کو خود کرنا ہے۔ مولانا تحدیث نعمت کے طور پر کہا کرتے تھے کہ جن جن رشتوں کی انہوں نے نشاندہی کی اور جو رشتے طے ہوئے، اس سلسلہ میں کبھی کوئی مسئلہ پیش نہیں آیا۔

(۲) شورائیت کا اہتمام

مولانا باہم صلح ومشورہ کا بہ کثرت اہتمام کیا کرتے تھے۔ بقول محمد جعفر صاحب:

"مولانا بڑی معمولی قسم کی باتوں پر بھی مشورے کے لیے ذمہ داران کو طلب کرتے تھے، ہمیں خود اس پر کبھی کبھی تکلف ہونے لگتا تھا، لیکن جب مولانا سے اس بات کا ذکر کیا جاتا کہ وہ چاہیں تو خود سے فیصلہ لے سکتے ہیں تو آپ فرماتے کہ مشورہ کرنے میں برکت ہوتی ہے"۔

اسلامی تحریک کے قائد کے لیے اپنے مامورین سے شفقت ومحبت کے ساتھ پیش آنے کے علاوہ ان سے باہم مشورہ لینے کا بھی حکم دیا گیا ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَ لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ....(سورہ آل عمران:۱۵۹)۔

(اے پیغمبرؐ) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ اگر کہیں تم تُند خو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمہارے گردوپیش سے چھٹ جاتے، ان کے قصور معاف کردو، ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو، اور دین کے کام میں ان کو بھی شریکِ مشورہ رکھو..

گویا شورائی نظام بھی اسی محبت کا پرتو ہے جس کے ذریعہ تحریک اور قائد تحریک سے متعلق فرد کی محبت کو قولی وعملی سانچے میں ڈھالنے میں مدد ملتی ہے۔ مشورہ سے کسی بھی معاملہ کی تہہ تک

پہنچنا' صحیح فیصلہ لینا اور اس سے برکت حاصل کرنا اپنی جگہ درست ہے' لیکن اس شورائیت کے عمل کے پیچھے امیر و مامور سے متعلق جو نفسیاتی پہلو کارفرما ہوتے ہیں وہ درحقیقت نصب العین کے حصول میں بڑے قطعی و فیصلہ کن مانے جاتے ہیں' جن پر بہرحال توجہ رہنی چاہئے۔

امیر و مامورین کے باہم مشورہ کرنے کے معنی ہیں:

☆☆ سمع وطاعت کے تحت امیر کی عزت اور اس کا احترام کرنا ہے۔

☆☆ دل سے تسلیم کرنا کہ تحریکی قیادت' اجتماعی قیادت ہے' ہر طرح کے تحکمانہ طرز عمل اور فرد کی اجارہ داری سے پاک۔

☆☆ قائد کا ساتھی رفقاء پر یقین واعتماد ہے۔

☆☆ ساتھی رفقاء' امیر کے خیر خواہ ہیں وغیرہ۔

اگر کسی مقام پر شورائیت کا نظم نہ ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ وہاں اسلامی اجتماعیت اپنی حقیقی روح سے خالی ہے۔ نہ امیر کا کوئی مقام ہے اور نہ ہی مامورین کی کوئی وقعت واہمیت۔

شورائیت کے سلسلہ میں مولانا کا خاص معاملہ یہ تھا کہ درپیش مسئلہ یا مسائل اچھی طرح واضح کرنے کے بعد......:

☆☆ پہلے ہی اپنا فیصلہ یا موقف ہرگز واضح نہیں کرتے تھے۔

☆☆ ہر ایک شریک کو بھرپور کہنے کا موقع دیتے۔

☆☆ نہ کسی کو بیچ میں ٹوکتے نہ ہی کسی دوسرے کو مداخلت کرنے دیتے۔

☆☆ ہر شریک کو اپنی باتیں رکھنے کا بھرپور موقع فراہم کرتے۔

☆☆ اپنی رائے یا مرضی کے مطابق فیصلے ہوں اس کی قطعی کوشش نہیں کرتے۔

☆☆ نہ ہی بنے بنائے ذہن سے رائے مشورے کے قائل تھے۔

☆☆ بلکہ جو اجتماعی رجحان بنتا اسی کے مطابق فیصلے کرتے۔

☆☆ کافی بحث وتمحیص کے بعد بنے اجتماعی ماحول اور رجحان کے خلاف فیصلہ نہیں سناتے تھے۔

☆☆ تمام تر مباحث اور کوشش کے باوجود اگر کوئی فیصلہ تحریکی نصب العین اور اس کے

متعینہ اصولوں کے خلاف ہوتا ہوا محسوس ہوتو مولانا' شرکاء پر دوبارہ غور وخوض کرنے کی ضرورت واضح کرتے۔

☆☆ فیصلہ لینے کے لیے آپ آخر وقت تک انتظار کرتے' جب سب کی رائیں آجاتیں اور گفتگو مکمل ہوتی' تب فیصلہ سنایا کرتے تھے۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ مولانا کے دور امارت میں فیصلہ سازی کا مرحلہ' ہر سطح پر قابل قبول رہا۔ یہ بات اور ہے کہ بعض ایسے تنظیمی معاملات جن میں مشورہ کی نہ ضرورت ہوتی نہ ہی دستوری لحاظ سے کوئی تقاضا' اس کے باوجود مولانا باہم مشورہ کا اہتمام کرتے تھے' اس پر کلام کیا جاسکتا ہے۔ بہر حال شورائیت کا اہتمام' مولانا کا بڑا نمایاں وصف تھا' جس سے جماعت کا داخلی استحکام یقینی ہوا اور مختلف ملی اور معاشرتی امور میں بڑی نمایاں تبدیلیوں کا محرک بنا۔ ملی اور برداران وطن کی تنظیموں اور اداروں سے متعلق مولانا کے تعاون کے حوالے سے جو باتیں منظر عام پر ہیں اور جو اوپر بیان ہوئی ہیں وہ اسی کی غماض ہیں۔ یوں تو شورائیت کی اہمیت وافادیت سے سبھی واقف ہیں اور کسی نہ کسی درجہ میں اس کا اہتمام بھی ہوتا ہے لیکن یہ بات قابل توجہ ہے کہ آج شوارئیت کا اہتمام اس کی روح کے مطابق کم ہی ہونے لگا ہے۔ اس پس منظر میں مولانا نے شورائیت کا اہتمام کرکے نہ صرف اس جانب سب کی توجہ مبذول کرائی ہے بلکہ اپنے وسیع تجربات کی روشنی میں وہ خدوخال اور اصول بھی پیش کیے ہیں جن کے تحت ہر سطح پر شورائیت کا نظم اس کی حقیقی روح کے ساتھ جاری وساری کیا جاسکتا ہے۔

(۷) تقسیم کار

مولانا نے جن تحریکی رفقاء میں صالحیت اور صلاحیت کا عنصر پایا' انہیں فوری آگے بڑھانے اور میدان کار فراہم کرنے کی حتی الوسع کوشش کی۔ اس میں محمد جعفر صاحب' مرحوم محمد اشفاق احمد صاحب' سید عبدالباسط انور صاحب' محمد اقبال ملا صاحب' انجینئر محمد سلیم صاحب' توفیق اسلم خان صاحب' شیخ مجتبٰی فاروق صاحب اس طرح کے کئی نام شمار کیے جاسکتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر حسن رضا صاحب "مولانا نے باصلاحیت نوجوانوں کی ایک کہکشاں تیار کی"۔ آپ کے دور امارت میں مقرر ہوئے امرائے حلقہ جات کی کارکردگی سے بھی اس بات کا بخوبی

اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ان میں سے اکثر امرائے حلقہ جات سے مستقل روابط رکھنے کے علاوہ انہیں اپنے ساتھ دوروں میں رکھتے۔مرکز میں مقیم رہے سکریٹری صاحبان کی کارکردگی سے بھی مولانا کے حسن انتخاب اوراپنے ساتھی ذمہ داران کی رایوں کے احترام کا اندازہ ہوتا ہے۔محمد جعفر صاحب، تنظیم کے لیے' مولانا سید جلال الدین صاحب' مولانا عبدالعزیز صاحبؒ اورمولانا عبدالرشید عثمانی صاحبؒ تربیت کے لیے' مولانا کوثر یزدانی صاحبؒ دعوت کے لیے' مولانا محمد عبدالقیوم صاحبؒ تنظیم وملی مسائل کے لیے' مولانا اعجاز احمد اسلم صاحب' رابطہ عامہ کے لیے' محمد اشفاق احمد صاحبؒ تعلیم کے لیے......ان حضرات کے تعاون اور کارکردگی کو بھلایانہیں جاسکتا۔

افراد کی تیاری اوران کا اپنی خداداد صلاحیتوں کے مطابق کام کرنا' اسی وقت ممکن ہے جب کہ ذمہ داریوں اور دائرہ کار کی وضاحت کے ساتھ ان کے لیے تقسیم کار بھی ہو۔مولانا اس سلسلہ میں بڑی احتیاط برتتے اور فرد کی قوت استعداد کے مطابق کاموں کی تقسیم عمل میں لاتے۔اجتماعیت میں فرد کی موثر کارکردگی اور قائد کا اثر انداز ہونا' دونوں اس امر سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ ہر ایک ذمہ دار پر واضح رہے کہ وہ کون ہے' کیا ہے اور اسے کیا کرنا ہے؟ مولانا کے اندازتقسیم کار سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی فرد کی موثر کارکردگی کے لیے دائرہ کاراوراختیارات کی وضاحت کے ساتھ جائزہ واحتساب بھی ضروری ہے۔تقسیم کار کی اس نوعیت کا اللہ کے رسول ﷺ کی سنت سے بھی علم ہوتا ہےاوردستور جماعت کی ان دفعات سے بھی جن میں ذمہ داریوں اوراختیارات سے متعلق واضح رہنمائی کی گئی ہے۔

تحریکی اصول واقدار

نصب العین سے وابستگی کا اولین تقاضا ہے کہ ہرفرد اپنی ذاتی اصلاح پر بھرپور توجہ دے۔ یعنی ہرفرد اپنی تربیت کا خود ذمہ دار رہے۔فرد کی اصلاح وتربیت پر ہمیشہ متوجہ رہنے کا جن امور سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے' وہ دراصل اس کے اصول واقدار ہیں جنہیں وہ شعوری طور پر اپناتا ہے'اوران کے عین مطابق جماعتی نصب العین کے حصول کے لیے سرگرم عمل رہتا ہے۔مولانا کی اصول پسندی میں بڑی لچک تھی۔نہ آپ نے اصولوں کے لیے ذاتی مفادات کوترجیح دی اور

نہ ہی متعینہ اصولوں کو دوسروں کی متفقہ رائے اور عام رجحان کے برعکس فوقیت دینے کا مزاج پایا تھا۔ کسی بھی اجتماعیت میں فرد کا یکسو اور اپنی وابستگی میں مخلص ہونا اس کی اسی لچکدار اصول پسندی سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ جو بات اہم ہے وہ یہی کہ فرد ہمیشہ اپنی سوچ وفکر اور مزاج کو اجتماعی مفاد کے تابع رکھے۔ جہاں اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے وہاں فرد بڑی خوش اسلوبی سے تربیتی منازل طے کرتا جاتا ہے اور وہ اجتماعیت بھی حقیقی معنوں میں وسعت اور معنویت اختیار کرتی جاتی ہے جس سے ایسے صالح افراد وابستہ ہورہتے ہیں۔ نصب العین کے لیے درکار یہ وہ یکسوئی ہے جس کا مطالبہ بڑا اہم اور دین اسلام کا سرچشمہ ہے۔ سیدنا ابراہیمؑ کے عظیم مشن کے دروازے امت مسلمہ کے سامنے' آپؑ کے اسی اعلان کے ذریعہ کھلتے ہیں جس میں یکسو ہونے کا بیان انتہائی جامع اور آسمانوں اور زمین جیسی وسعتوں والا ہے:

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ۔ (سورہ الانعام:۷۹)

میں نے تو یکسُو ہوکر اپنا رُخ اُس ہستی کی طرف کرلیا جس نے زمین اور آسمانون کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

اس ضمن میں کئی امور زیر بحث آسکتے ہیں' بلکہ مولانا کی نصف صدی سے زائد ذمہ دارانہ زندگی کے نقوش کسی نہ کسی اصول اور قدر سے مزین معلوم ہوتے ہیں۔ پچھلے صفحات میں اس ضمن کی گفتگو کا کچھ حصہ ملاحظہ کیا جاسکتا ہے جیسے نصب العین' تحریکی خدمات' اور شورائیت کے تحت زیر بحث امور وغیرہ۔ ان کے علاوہ چند امور ذیل میں درج ہیں۔

(۱) اقامت دین کے لیے یکسوئی

مولانا کے تایا خسر کے پاس 1933 تا1950 تک کے ترجمان القرآن کے شمارے تھے' آپ نے ان کا مطالعہ کیا' اس کے علاوہ دعوت (اس وقت اس کا نام الانصاف تھا' جس کے مدیر محمد اسحاق الہ آبادیؒ تھے) کے پرچوں کا بھی مطالعہ کیا۔ یہ پیش رفت تحریکی نصب العین سے وابستگی کے اولین اقدام میں سے تھی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ اشتراکیت کا خوب دور دورہ تھا' اور آپ کے ساتھی جو اس وقت عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں زیر تعلیم تھے' وہ سب

اشتراکیت پسند ہو گئے تھے جن سے کافی بحث ومباحثہ ہوا کرتا تھا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ایک دن جب میں فجر کی نماز کو اٹھا تو اچانک ذہن میں خیال آیا کہ یہ کمیونزم اور اشتراکیت کا ہر طرف جو زور ہے اور جس سے طلبہ بطور خاص متاثر ہیں' اس کا مقابلہ اگر کوئی کر سکتا ہے تو وہ صرف جماعت اسلامی ہے' یہ بات آپ نے رائچور کے عبدالعزیز صاحبؒ سے بھی کی' جو اس وقت اصلاح المسلمین کے صدر تھے۔ یہ 1951 کی بات ہے۔ اس کے بعد آپ نے تحریکی لٹریچر کا باضابطہ مطالعہ شروع کیا جس کا قدرے تفصیلی ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ مئی 1952 میں آپ جماعت کے متاثر بنے اور اس کے بعد ہمدرد (پہلے متفق وکارکن کے بجائے متاثر اور ہمدرد کی اصطلاحات تھیں)۔ جون 1957 میں آپ رکن جماعت بنے۔ 1951 سے گویا آپ نے اقامت دین کے نصب العین کے سفر کا آغاز کیا۔ حالات کے نشیب وفراز میں اپنا سفر جاری رکھا' نہ آپ تھکے اور نہ ہی ضعف طاری ہونے دیا۔ انتہائی پرآشوب حالات میں اپنا نصب العین سے تعلق مضبوط رکھا' اور یکسوئی برقرار رکھی۔ اس کا بخوبی اندازہ ان حالات کے اجمالی ذکر سے بھی کیا جا سکتا ہے جو مولانا کو مختلف مراحل میں درپیش رہے۔

(۲) ابتلاء وآزمائش' صبر واستقامت

1952 میں آپ نے جیسے ہی جماعت سے تعلق قائم کرلیا' ابتلاء وآزمائش کا آغاز ہو گیا۔ اس وقت کے حالات بڑے سنگین تھے کیونکہ سقوط حیدرآباد اور پولیس ایکشن کے نہایت ہی ہولناک حادثات اور خونریز واقعات کی یادیں ابھی تازہ تھیں۔ حیدرآباد دکن سے تین اضلاع بیدر' گلبرگہ اور رائچور' ریاست کرناٹک میں شامل کر لیے گئے تھے جس کے سبب ماحول کی سنگینی کسی نہ کسی درجہ برقرار تھی۔ ان حالات میں مسلمانوں کا اپنی شناخت باقی رکھنا اور دین پر چلنا تو دور' برائے نام اسلام سے وابستگی بھی بڑی غنیمت سمجھی جاتی تھی۔ اسلام پر چلنا اور چلنے کے لیے لوگوں کو متوجہ کرنا بڑا ہی غیر معمولی کام تھا۔ ان غیر موافق حالات اور مولانا کے خاندانی مسائل کے علاوہ آپ کے اپنے دوست ودیگر ساتھی کافی بحث وتکرار کرتے' الزامات لگاتے' بلکہ بسا اوقات کھلے عام آپ کی تضحیک کرتے تھے۔ لیکن آپ نے صبر کے ساتھ سب گوارا کرلیا۔ پھر جب مولانا نے امارت حلقہ کی ذمہ داری سنبھالی اس وقت ان حالات کی سنگینی بڑھنے

کے علاوہ بعض مسلمانوں کی جانب سے سخت مخالفتیں شروع ہوئیں۔ جماعت کو خلاف حق کہا جانے لگا اور اس سے وابستہ افراد کے لیے کفر وشرک کے فتوی لگنے لگے اور انہیں طرح طرح کے الزامات کا سامنا کرنا پڑا' مولانا فرماتے ہیں کہ یہ حالات تقریباً 10 تا 15 سال رہے۔ لیکن ان سب کے باوجود اقامت دین کا سفر پوری آب وتاب کے ساتھ جاری رہا۔

امیر حلقہ سے لے کر سکریٹری حلقہ کی ذمہ داری تفویض کیے جانے تک کا وقفہ 1958 تا 1984 کا ہے۔ اس دوران متذکرہ مخالفانہ ماحول کے مقابلہ کے علاوہ آپ کو کئی ماہ قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے سنت یوسفیؑ ادا کرنے کا موقع ملا۔ 1965 میں ہند و پاک جنگ' 1971 میں سقوط پاکستان اور قیام بنگلہ دیش' 1975 ایمر جنسی کے دوران مولانا کو ریاست کرناٹک کے مختلف مقامات کے جیلوں میں رکھا گیا۔ پھر جب 1984 میں آپ سکریڑی جماعت بنے اس وقت جماعت ایک سخت داخلی حالت سے دوچار تھی۔ جس کا تذکرہ اوپر گزر چکا ہے۔ جب آپ امیر جماعت بنے' 1992 میں بابری مسجد کی شہادت سے ملک کے حالات بڑے سنگین رخ اختیار کر گئے تھے۔ اس دوران انجام پائیں بیش بہا خدمات نہ صرف جماعتی نصب العین کی تقویت کا ذریعہ بنیں بلکہ مولانا سراج الحسن جیسے ایک مثالی قائد کے خدوخال بھی پیش کیے۔ امیر و مامورین کے درمیان ربط وتعلق اور مل جل کر کام کرنے کا جذبہ واضح کیا۔ اور یہ پیغام دیا کہ صبر وثبات کا پیکر بنے نصب العین کے لیے ہر حال ان تھک جدوجہد کیسے کی جاسکتی ہے۔ اور کیسے ہر فرد جماعت اِنفِرُوا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا (سورہ التوبہ:۴۱)۔ نکلو، خواہ ہلکے ہو یا بوجھل ..... کی جیتی جاگتی تصویر بن کر راہ خدا میں مصروف عمل رہ سکتا ہے۔

(۳) صحت مند فکر اور طرز عمل

حالات کے نشیب وفراز کا صبر واستقلال سے مقابلہ کرنے اور مقصد پر نگاہیں مرکوز رکھنے کا فائدہ یہ ہوا کہ دعوت اور اسلامی معاشرہ کی تعمیر وترقی سے متعلق سرگرمیاں انجام دینے میں بلا کی تیزی آگئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سخت حالات سے گزار کر کارکنان تحریک کو نصب العین کے لیے درکار ضروری اصولوں اور اقدار کی تفہیم وتشریح فرمادی۔ چنانچہ مولانا کی جدوجہد میں یہ بات بڑی نمایاں طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ ایمر جنسی کے بعد بنائے گئے حلقہ

کے میقاتی پروگرام کے پیش لفظ میں مولانا نے جو کچھ کہا' اسی حقیقت کی ایک صاف وشفاف تصویر ہے:

الحمدللہ! ایمر جنسی کے بعد جماعت کی بحالی سے متعلق دیگر ضروری امور سے نمٹتے ہی ہم اپنی اولین فرصت میں اپنے نصب العین کی سمت پیش قدمی کی طرف توجہ کرر ہے ہیں.... جماعت کو اپنے پانچویں میقاتی پروگرام کے آخری سال 1975 میں ایمر جنسی کی ابتلاء کا شکار ہونا پڑا جس کی وجہ سے نہ صرف یہ کام متاثر ہوا' بلکہ پونے دوسال کی مدت بھی اس طرح گزری کہ اس کے ذمہ دار اور کارکن قید وبند میں رہے یا باہر بھی رہے تو جماعت پر پابندیوں کی وجہ سے اس خصوص میں کچھ کرنے سے قاصر رہے۔لیکن ایمر جنسی کی ابتلاء میں کام کے کچھ دوسرے میدان ایسے سامنے آئے اور ایسے مواقع بہم پہنچائے کہ باہران کی کم ہی توقع کی جاسکی تھی۔اور اس پہلو سے ایمر جنسی کے دوران جو کچھ کام ہوا اور ہوسکا' اس کو بس اللہ ہی کا فضل سمجھنا چاہئے اور شائد اسی کام کو انجام دینے کے لیے قدرت نے ایمر جنسی کے سخت مرحلے سے جماعت کو گزارا۔ بہرحال اب جبکہ حالات معمول پر آچکے ہیں تو ہمیں ان نئے حالات میں اپنی دعوت اور نصب العین کے سلسلے میں حقیقت پسندانہ انداز میں وسعت اور فراخی اور زیادہ عزم وحوصلے کے ساتھ سوچنے اور کرنے کی ضرورت ہے۔ مجھے امید ہے کہ ہمارے احباب اور کارکن اسی ذہنی اور واقعاتی پس منظر میں میقاتی پروگرام کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کریں گے اور اس کی روشنی اور رہنمائی میں اپنی اپنی جگہ ان نشانوں کو حاصل کرنے کی کوشش کریں گے جو پروگرام میں مقرر کیے گئے ہیں۔

اس موقع پر میں اپنے احباب اور کارکنوں سے خاص طور سے کہنا چاہتا ہوں اور انہیں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ یہ وہ کم سے کم کام ہے جو میقاتی پروگرام کی شکل میں آپ کے سامنے رکھا گیا ہے اور جس کو بہرحال عمل میں لانا چاہئے ورنہ کام بھی وسیع ہے اور اس کا میدان اور اس کے مواقع بھی۔کوشش اس کی کرنی چاہئے کہ زیادہ سے زیادہ کیا جائے۔اپنے میقاتی پروگرام کا ہر ماہ عملی پہلو سے جائزہ لیتے رہیں اور حلقہ کے پروگرام کی روشنی میں یہ بھی دیکھتے رہیں کہ اس میں طے کیے گئے کاموں میں سے وہ کون سے کام ہیں جو آپ کے مقام پر انجام دیئے جاسکتے

ہیں اور ایسے کاموں کو اپنے پروگرام کا جز بنالیں اور کام کریں۔

غور وفکر، سعی وکوشش اور احتساب وجائزے کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے استعانت اور نصرت کی بھیک مانگئے اور اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کے لیے توبہ واستغفار کا اہتمام کیجئے۔ آیئے ہم سب اس کے حضور توبہ کریں۔ اور نئے عزم اور مضبوط ارادوں کے ساتھ کمر کس کر میدان عمل میں آگے بڑھیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائے۔ آمین (پیش لفظ، حلقہ کرناٹک کا میقاتی پروگرام، اپریل 78 تا اکتوبر 81)۔

(۴) ہندوستانی معاشرہ میں نفوذ کا طریقہ

دعوت کے ذیل میں مولانا کی ترجیحات واضح ہیں۔ آپ نے اپنی گفتگو اور خطابات وغیرہ کے ذریعہ ہمارے ملک کے معاشرہ کو بڑا منفرد قرار دیا ہے۔ ہندوستانی عوام کو حقیقت پسند اور نیک مزاج بتایا ہے۔ مسلسل کام سے تبدیلی کے امکانات کا برملا اظہار کیا ہے۔ اور اس غلط فہمی کو بارہا دور کیا ہے کہ ہندوستان، دارالحرب یا دارالکفر نہیں بلکہ یہ دارالدعوۃ ہے۔

ایک بار مولانا سے سوال کیا گیا کہ تحریک اسلامی کے ہندوستانی عوام میں نفاذ کی راہیں کیا ہیں؟ آپ نے جواب دیا:

"خدا پرستی، فلاح آخرت، انسان کی رہنمائی کے لیے خدائی ہدایت کی ضرورت اور رسالت کے ذریعہ اس کا انتظام، بندگی رب (کے علاوہ) اس کا مقصد زندگی، نظام زندگی، طریقہ زندگی اور راہ زندگی کی حیثیت سے تعارف کرایا جائے۔ انسانی اخوت اور مساوات، بے لاگ حق وعدل پر مبنی ایک خدا پرستانہ نظام حیات، ظلم وجبر، فتنہ وفساد اور ہر طرح کے امتیازات کو مٹانے کی ایک عالمگیر اور مقدس انبیائی اور انسانی تحریک کی حیثیت سے اس کو سامنے لایا جائے۔ اور میدان عمل میں آکر ایک تحریک اپنے اصولوں کو لیے ہوئے زندگی کی رہنمائی کرتی ہوئی آگے بڑھے۔ ظلم وجبر کی قوتوں سے کشمکش کرتی ہوئی آگے بڑھے، تو ہندوستان کے حق پسند، انسان دوست اور دبے کچلے ہوئے سارے پسماندہ عوام اس کی طرف لپکیں گے اور یہی چہار سو پھیلی ہوئی تاریکی شعاع امید بن جائے گی"۔ (ماخوذ: سووینیر، پہلی ریاستی کانفرنس، ایس آئی او، اے پی، نومبر 92)۔

جدہ، سعودی عربیہ کے اردو نیوز اخبار کے نمائندے نے مولانا سے یہ جاننا چاہا کہ کیا

ہندوستان کے متعدد مسائل کا حل سکیولرزم ہے؟ مولانا نے جواب دیا:

"ہم سیکولرزم کو نہ تو نسخہ شفاء سمجھتے ہیں نہ تمام مسائل کے حل کے لیے اس کو کوئی بہترین حل کے طور دیکھتے اور پیش کرتے ہیں اور نہ اس کے داعی ہیں۔ ہندوستان میں سیکولرزم کی جو تعریف کی جاتی رہی ہے اور اس کا جو مفہوم یہاں کے قومی لیڈروں نے عوام کو سمجھایا اور بتایا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہندوستان ایک کثیر المذاہب ملک ہے۔ یہاں ہر مذہب کے ماننے والے لاکھوں اور کروڑووں کی تعداد میں رہتے ہیں۔ انہیں مل جل کر اپنے مسائل کو باہمی مشوروں سے حل کرتے ہوئے اور ملک کا انتظام چلاتے ہوئے آگے بڑھنا ہے۔ مذہب کی بنیاد پر ایک دوسرے سے نفرت وتعصب اور سلوک اور برتاؤ میں کسی طرح کا امتیاز نہیں کیا جانا چاہئے۔ ملک کا دستور اگر چہ کسی خاص مذہب پر مبنی نہیں ہے اور نہ کسی جانب اس کا جھکاؤ ہے یہ مذہب کا منکر ہے نہ باغی بلکہ یہ مذہب کو احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اپنے مذہب پر چلنے اور اس کی پابندی کرنے کو ہر شہری کا بنیادی حق سمجھتا اور مانتا ہے۔ اس معاملے میں سارے مذاہب اور اس کے ماننے والوں کے درمیان کوئی فرق اور امتیاز نہیں کرتا۔ اور نہ اسے درست سمجھتا ہے۔ اس وضاحت کی روشنی میں ہم سیکولرزم کو ملک میں بڑھتی اور پھیلتی ہوئی فرقہ پرستی اور نفرت وتعصب کے زہر سے ہندوستان کو بچانے کی ایک مفید صورت سمجھتے ہیں۔ (ماخوذ: ذکری، دسمبر 1996)۔

(۵) خیر امت کی تیاری

پھر ملت میں اسلامی شعور کی بیداری اور اس میں داعیانہ جذبہ کے فروغ کی کوششیں، اقامت دین کا ایک مستقل حصہ بنی رہیں۔ بلکہ یہ بات واضح کی گئی کہ اقامت دین کا نصب العین، کسی گروہ یا جماعت سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ یہ مقصد تو ساری امت مسلمہ کا مقصد وجود ہے۔ جدہ کے اردو نیوز اخبار کے نمائندہ نے اس سلسلہ میں بھی مولانا سے سوال کیا تھا، آپ نے کہا:

"جماعت اسلامی ہند کسی خاص فرقے، گروہ یا ملت کی خدمت کے لیے قائم کی گئی کوئی جماعت نہیں ہے۔ وہ اپنے پاس ایک پیغام رکھتی ہے اور اس پیغام کو ہندوستان کے تمام

باشندوں تک پہچانے کا عزم کیے ہوئے ہے اور عملاً وہ کر بھی رہی ہے .....جماعت ملت اسلامیہ ہند کے اندر خیر امت ہونے کی حیثیت سے ایک داعیانہ شعور پیدا کرنے اور اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے مخلصانہ جذبہ کو پیدا کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی ہے۔اس بنیادی فکر کے عام ہونے کے نتیجے میں ان کے اندر ایک صحت مند سماجی شعور پیدا ہوتا جارہا ہے۔اور اپنی نئی نسل کی دینی تعلیم کی فکر اور عملی طور پر اس کے لیے مکاتب اور مدارس کے قیام کی کوششوں میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔اور پھر یہ کہ مجموعی حیثیت سے ملت میں جینے اور بامقصد زندگی گزارنے کا ایک نیا عزم وحوصلہ جنم لے رہا ہے۔اور کون نہیں جانتا کہ کسی گروہ میں جینے اور زندہ رہنے کا حوصلہ نہ ہوتو اسے کسی بھی عارضی، وقتی یا مصنوعی تدبیروں اور سہاروں سے زندہ نہیں رکھا جاسکتا۔ میرے نزدیک ملت کے اندر جو نیا جذبہ اور شعور بیدار ہورہا ہے یہ ایک بڑا حاصل ہے جو ملت کو ملنے جارہا ہے۔ ویسے ہم یہ نہیں سمجھتے اور نہ اپنے کام کے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار ہیں کہ یہ سب کچھ ہماری کوششوں ہی کا اثر ونتیجہ ہے بلکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ان نتائج کے برآمد ہونے میں ہماری کوششوں کا بھی دخل ہے"۔(ماخوذ ذکری، دسمبر 1996)۔

یہی وہ فکر تھی جس کی بنا پر امت کے کاز کے لیے جماعت اور افراد جماعت نے ہمیشہ وسعت نظر اور وسعت قلب کا مظاہرہ کیا ہے۔امت کے اتحاد اور اجتماعی مفادات کے حصول کے لیے آپسی ربط و تعلق کی اہمیت وضرورت بارہا واضح کی گئی، بقول ابوالمجاہد زاہد صاحبؒ:

ایک ہوجائیں تو بن سکتے ہیں خورشید مبین
ورنہ ان بکھرے ہوئے تاروں سے کیا کام بنے

جہاں بھی امت کا اجتماعی مفاد ہو وہاں جماعت نے بھرپور تعاون دیا ہے۔امت میں قائدانہ اوصاف کی آبیاری کے لیے راہیں ہموار کی ہیں۔ جہاں ضرورت محسوس ہوئی قائدانہ رول ادا کیا ہے۔ جماعت کے نزدیک ملی مسائل سے متعلق یہی موقف رہا کہ کسی مسلک یا تنظیم کی نمائندگی کی بجائے امت کے اجتماعی موقف کا ساتھ دینا ہی ملی مسائل کے پائیدار حل کا ذریعہ ہے۔اس لیے امت کے اجتماعی مسائل سے متعلق جماعت نے تنہا اقدام کرنے سے حتی الامکان گریز کیا ہے۔ چاہے بات مسلم پرسنل لاء کی ہو یا بابری مسجد کی۔اس پس منظر میں مسلم پرسنل لا بورڈ

اور مسلم مجلس مشاورت کے علاوہ مختلف ریاستوں میں بنے وفاق اوراداروں سے جماعت کے تعاون اوراشتراک کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہےاور مولانا مرحوم کی خدمات کوبھی۔

(۶) اقامت دین کی منزل کا حصول

سابق امیر حلقہ کرناٹک محمد اطہر اللہ شریف صاحب نے ایک انٹرویو لیتے ہوئے مولانا محمد سراج الحسن صاحبؒ سے سوال کیا تھا کہ گزشتہ نصف صدی سے زائد عرصہ کی کوششوں سے ہم اقامت دین کی منزل کے کتنے قریب پہنچے ہیں؟ مولانا نے جواب دیا:

"ہم نے کبھی یہ نہیں مانا تھا کہ چند سالوں میں اقامت دین کی منزل ہاتھ آئے گی۔اس وجہ سے نہ کبھی خواب میں سوچا کہ اقامت دین کی منزل بہرحال پا ہی لیں گے۔اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے ایک طویل مدت درکار ہے۔ ہمارا ملک بڑا وسیع وعریض ہے اس کی آبادی بڑی ہے۔یہاں مختلف مذاہب اور تہذیبوں کے ماننے والے لوگ رہتے رہیں۔ پھر اس ملک میں ایک طویل مدت تک مسلمانوں کا دور حکمرانی رہا ہے۔اس کے اثرات ونتائج کو سمجھنا ہوگا۔موجودہ دور مسلسل کام کرنے کا دور ہے۔اس یقین کے ساتھ کام کرنا چاہئے کہ ہمارے وطن عزیز میں امکانات بڑے روشن ہیں۔اور اگرحق آجائے تو ہندوستانی عوام لبیک کہنے میں دیر نہیں کریں گے۔ہمیں مختلف موقعوں سے اسلام اور مسلمانوں کے سلسلہ میں برادران وطن کا جو ریسپانس ملتا گیا اس سے یہ یقین اور پختہ ہوتا ہے۔حتیٰ کہ فرقہ پرست کہلائے جانے والے سخت جان لوگوں نے بھی اپنی رائیں بدل لیں۔اس کی بیسیوں مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ بہرحال اقامت دین کی منزل کو پانے کی ذہنیت کے بجائے اس کی راہ میں مستقل، بغیر رکے، بغیر تھکے اور بغیر جھکے کام کرنے کا مزاج ہوتو حالات بدل سکتے ہیں۔تن آسانی سے بچنا چاہئے۔قبولیت کے لیے وقت چاہئے، ہندوستان کا مزاج ایسا واقعہ ہوا ہے کہ مسلسل کام سے تبدیلی آئے گی۔کام جاری رکھیں۔مایوسی کی کوئی وجہ نہیں"۔

مولانا کے شخصی اوصاف

حسن اخلاق، مولانا کی شخصیت کا بڑا درخشاں پہلو ہے۔نمایاں اوصاف میں تعلق باللہ، شفقت و محبت، حسن ظن، امانت ودیانت، صبر، استقلال، ثابت قدمی، سادگی، رازوں کی حفاظت،

بے لوث جذبہ خدمت' افراد کے ساتھ یکساں معاملہ' ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے مشاورت' کسی بات پر اصرار کے بجائے حقیقت کی وضاحت پر اکتفا کرنا' زبان کی حد درجہ حفاظت' انسانوں کی خیر خواہی' شخصیت وقیادت سازی وغیرہ جیسے امور شامل ہیں۔مولانا کے ان اوصاف حمیدہ سے تقریباً سات دہوں کے دوران تین نسلوں نے استفادہ کیا ہے۔یہاں آپ کے بعض اوصاف کے ان عملی پہلوؤں کا بیان پیش نظر ہے جن سے بخوبی اندازہ ہوسکے کہ کسی مثالی شخصیت کے لیے مطلوبہ اوصاف کیا ہیں اور کن اعمال اور رویوں سے ان کا ظہور ہوتا ہے؟

(ا)قرب الٰہی کے عملی مظاہر

فرائض کی پابندی اور تہجد کے اہتمام سے متعلق مولانا کا طرز عمل معلوم ہے۔نفل روزوں کا نظم' بلاناغہ رمضان کے بعد شوال المکرّم کے چھ روزوں کا اہتمام۔مولانا فرماتے تھے کہ قید وبند کے دوران جیل میں بھی ستہ شوال کا اہتمام رہا۔آپ اپنے روزانہ کے معمولات' شب وروز ڈائری میں درج کرنے کا اہتمام کرتے تھے۔تادم حیات آپ نے دسیوں ڈائریاں بڑی پابندی سے لکھی ہیں۔ وہ اپنی ڈائری میں دن بھر کی مصروفیات درج کرنے کا آغاز یوں کرتے ہیں:

" صبح اٹھا' نماز تہجد کی چھ رکعت ادا کی' (کبھی چار رکعت کا ذکر ہے اور کبھی لکھتے ہیں کہ آج تہجد رہ گئی)' اہل خانہ کو جگایا' نماز فجر ادا کی........"۔ان امور سے ظاہر بات ہے اللہ سے قربت کا پہلو بڑا نمایاں ہوتا ہے۔لیکن اللہ سے قربت اسی وقت حقیقی مانی جائے گی جب کہ انجام دیے گئے نیک اعمال' شخصیت میں اچھے اخلاق بتدریج پروان چڑھانے کا ذریعہ بنیں۔اس ذیل میں مولانا کے حسن اخلاق کے وہ تمام پہلو شمار کئے جاسکتے ہیں جن سے ہر کوئی واقف ہے۔آپ کی عبادات' محبت وشفقت' عجز وانکساری' راہ خدا میں استقامت وغیرہ۔ یہاں دعا سے متعلق مولانا کے طرز عمل کا ذکر کیا جارہا ہے۔

قرب الٰہی کا ایک ذریعہ دعا ہے۔ دعا ایسی عبادت ہے جو اللہ تعالیٰ کا مستجاب ہونا ظاہر کرتی ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے قربت کا ویسے ہی اظہار کرتا ہے جیسے وہ یقین واعتماد کی کیفیت کے ساتھ اس سے رجوع ہوتا ہے۔ جب وہ سوال کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا جواب

دیتا ہے۔ دیگر عبادتوں میں مستجاب کا پہلو اس طرح واضح نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے کسی کی قربت کی پہچان یہ ہوگی کہ وہ دوسروں کو بھی قرب الٰہی کے ثمرات و برکات سے فیض یاب کرانے کی شعوری کوشش کرے۔ مولانا کی گزارشات میں عموماً جو بات شامل رہتی تھی وہ دعاؤں میں خیال رکھنے والی بات ہے۔ ہر ملنے والے سے، مرد و خواتین، چھوٹے بڑے، سب سے مولانا دعا کی درخواست کرتے اور اور دیگر ملنے جلنے والوں تک سلام اور دعا عرض کرنے کی گزارش کرتے۔ بلاشبہ دعا مانگنے والا اور جس کے لیے دعا مانگی جارہی ہے، دونوں رحمت الٰہی کے زیر سایہ آجاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے قربت کا یہ دہرا پہلو عموماً پیش نظر نہیں رہتا۔ مطلوب صرف یہ نہیں کہ بندہ، اپنے رب سے قریب تر ہوجائے، بلکہ مطلوب تو یہ ہے کہ بندہ جتنا اپنے رب سے قریب ہو، اتنا ہی اس کے بندوں سے بھی قریب ہوجائے اور انہیں بھی خدا سے قریب کرنے کی شعوری کوشش کرے۔ خدا سے قربت اور بندوں سے دوری، دراصل قربت نہیں خود خدا سے دوری کی علامت ہے۔ اسلامی قائد کا یہ بنیادی وصف ہوتا ہے کہ وہ مامورین کو اپنے اردگرد نہیں بلکہ رب سے جوڑے رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ حضرت ربیعہ بن کعب اسلمیؓ سفر اور حضر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپؓ حسب معمول رسول اللہ ﷺ کو تہجد کے وقت وضو کے لیے پانی دیتے ہیں۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں اے ربیعہ مانگو کیا مانگتے ہو؟ آپ نے پہلے ایسا کبھی نہیں پوچھا تھا، حضرت ربیعہؓ نے فوری عرض کیا کہ میں جنت میں آپ ﷺ کی رفاقت چاہتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر معاملہ ایسا ہے تو پھر کثرت سجدہ سے اپنے سلسلہ میں میری مدد کرو (فَأَعِنِّي عَلَى نَفْسِكَ بِكَثْرَةِ السُّجُودِ - مسلم)۔ یعنی اگر تمہیں جنت میں میری رفاقت پسند ہے تو اللہ تعالیٰ سے قریب ہوجاؤ، اور سجدہ ہی وہ ذریعہ ہے جس سے بندہ، اللہ سے قریب ہوجاتا ہے۔ جتنے زیادہ سجدے، اتنی زیادہ قربت۔

راہ خدا میں ان تھک جدوجہد اور جذبہ وجنون کی معراج بس ایسے ہی دہرے عمل سے ممکن ہے، جس کا ایک پہلو قرب الٰہی ہے تو دوسرا پہلو حسن اخلاق کے ذریعہ خدا کے بندوں سے جڑ جانا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا راتوں میں پیروں میں ورم آنے تک کھڑے رہنا اور دن

میں بندگان خدا کو بندگی رب کی دعوت دیتے دیتے اپنے آپ کو تھکا دینا' اور رب کا یہ کہنا:

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا(الکھف:٦)

اچھا، تو اے محمدؐ، شاید تم ان کے پیچھے غم کے مارے اپنی جان کھو دینے والے ہو اگر یہ اس تعلیم پر ایمان نہ لائے۔

دراصل وابستگان تحریک کے سامنے قرب الٰہی کی حقیقت کے ساتھ اس کے لیے مطلوبہ کردار بھی پیش کرتا ہے۔

(۲) بے لوث خادم

سَیِدُ الْقَومِ خَادِمُهُم یعنی قوم کا سردار' قوم کا خادم ہوتا ہے۔ بات تو بڑی موثر ہے لیکن سرداران قوم' خدام قوم بہت کم ہی ہوا کرتے ہیں۔ ادب واحترام اور منصب کے پروٹوکول کے نام پر وہ سب کچھ ہوتا ہے جس سے قائد اور مامورین کے درمیان خادم ومخدوم کے تعلق کا پتہ ہی نہیں چلتا' بلکہ جی حضوری اور بلاوجہ محنت ومشقت ظاہر ہوتی ہے۔ اسلامی قیادت اس ضمن میں بڑی مثالی رہی ہے۔ عموماً حضرت عمرؓ کے اس واقعہ کی مثال دی جاتی ہے جس میں مسجد اقصی کے سفر کے دوران اونٹ پر آپؓ اور آپ کے خادم کے باری باری بیٹھنے کا ذکر کیا جاتا ہے۔ یعنی امیر و مامورین کے درمیان مقام ومنصب کو لے کر رویوں سے کوئی امتیازی سلوک ظاہر نہیں ہوتا۔

مولانا نے کسی کو اپنی خدمت کے لیے مقرر نہیں کیا۔ حالانکہ آپ کے دور امارت کے آخری سالوں میں بار بار اسرار کیا جاتا کہ کم از کم سفر میں اپنے ساتھ کسی رفیق کو رکھ لیں، لیکن آپ کبھی آمادہ نہیں ہوئے۔ نہ کبھی دفتر حلقہ ومرکز میں نہ کبھی اپنے گھر میں کسی کو اپنی پسند کے حساب سے کھلانے پلانے کی گزارش کی۔ اتنی طویل مدت خدمات انجام دیں لیکن کبھی جماعت سے مشاہرہ نہیں لیا البتہ ضرورت کی حد تک سفر خرچ لینے پر اکتفا کرتے تھے۔ آپ کے ساتھ سفر میں رہنے کا بارہا موقع ملا' کبھی آپ نے اپنا تعارف امیر جماعت کی حیثیت سے نہیں کرایا' جب بھی ساتھی مسافروں سے بات چیت ہوتی اور تعارف کا موقع آتا تو کہتے کہ میں ایک خادم ہوں۔ پھر حسب موقع تحریکی خدمات کا ذکر کرتے۔

مولانا کی بے لوث خدمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ تقریباً 1962 سے آپ نے لوگوں کے آدھے سر کے درد (دردشقیقہ، مائیگرین) کا علاج کیا ہے۔ اور 1980 کے شروع سے بواسیر کا علاج کیا ہے۔ عام امراض کے علاوہ انتہائی پیچیدہ قسم کی تکالیف میں مبتلا لوگ بھی آپ کی دوا اور دعا سے شفایاب ہوئے ہیں۔ مولانا کی اس بے لوث خدمت سے مستفید ہونے والوں میں مختلف مذاہب کے مردوخواتین کی تعداد ہزاروں پر مشتمل ہے۔

(۳) منکسر المزاجی

مولانا کے مزاج میں عجز وانکساری بڑی نمایاں تھی۔ تحریک کے دور اول ہی سے ذمہ دارانہ حیثیت سے کام کیا اور نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ مختلف ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے گزرا، لیکن اس کے باوجود آپ کی طبیعت میں بے نیازی نہیں تھی بلکہ ہر چھوٹے بڑے سے سیکھنے سمجھنے کا مزاج آپ میں پایا جاتا تھا۔ مولانا کی جانب سے لکھے گئے ہزاروں خطوط میں بیشتر ان خطوط کے جواب ہیں جو عام کارکنوں اور نوجوانوں کی جانب سے لکھے گئے تھے۔

آپ صحیح بات معلوم کرنے کے سلسلہ میں بھی، علم اور جانکاری رکھنے والے رفقاء سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ مولانا محمد شفیع مونس صاحبؒ اور مولانا ابوالجاہد زاہد صاحبؒ سے اکثر الفاظ کے صحیح تلفظ کے سلسلہ میں گفتگو کرتے تھے جس کا ذکر محمد اشفاق احمد صاحبؒ نے بعض متعین الفاظ اور واقعات سے کیا ہے۔ جیسے جوق در جوق۔ عموماً جوق کو ج پر زبر کے ساتھ پڑھتے ہیں جبکہ صحیح تلفظ ج پر پیش کے ساتھ ہے۔ مولانا ایسے ہی جوق درجوق بہ تکرار کہا کرتے تھے۔ اسی طرح جدوجہد ہے۔ یہاں جہد میں ج کو عموماً زبر کے ساتھ پڑھا جاتا ہے جب کہ اصل میں اس کو پیش کے ساتھ پڑھنا چاہئے۔ مولانا اسی تلفظ کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ اس ضمن میں ایک اصلاح شدہ واقعہ بھی ہے۔ جیسا کہ ایک عام محاورہ ہے "یہ منھ اور مسور کی دال"۔ ایسا کہنا صحیح نہیں، یہ دراصل یوں ہے "یہ منھ اور منصور کی دار" ہے۔ یعنی کوئی منصور نامی شخص حق کے لیے دار یعنی پھانسی پر چڑھ گئے تھے۔ لہٰذا اگر کسی کے عزم وحوصلہ اور حق پر مر مٹنے کی بات پر سوالیہ انداز سے کلام کرنا ہو تو کہتے ہیں ..... یہ منھ اور منصور کی دار؟ جس کی بگڑی ہوئی صورت وہ ہے جس میں منصور کا بدل، مسور ہے۔

مولانا کی ہندی زبان بھی بڑی عمدہ تھی۔ اس کے الفاظ کی صحیح ادائیگی کے لیے مولانا ہندی جاننے والے رفقا سے استفادہ کرتے تھے جیسے ڈاکٹر محمد احمد صاحب اور مولانا کوثر یزدانی صاحبؒ وغیرہ۔

(۴) عزت نفس اور ستر پوشی

عزت نفس کا بھرپور لحاظ رکھنا اور لوگوں کی ستر پوشی کرنا' مولانا کا نمایاں وصف تھا۔ سب سے یکساں احترام کے ساتھ ملنا' بڑوں چھوٹوں سے مخاطبت میں جمع کا صیغہ استعمال کرنا' ان کے جائز مطالبات کے لیے کبھی 'نا' نہیں بولنا' کسی فرد کے مسئلہ کے حل کے بعد اسے احساس تک ہونے نہیں دینا کہ اس کا راز یا چھپی ہوئی بات معلوم ہوگئی ہے وغیرہ۔

آج ان خلاقی خوبیوں سے ہمارا معاشرہ خالی نظر آتا ہے۔ آئے دن دیکھتے ہیں کہ بے کس' مجبور اور بے سہارا لوگوں کی خدمت کر کے ان کی تصاویر عام کی جاتی ہیں' اور کسی کی غلطی یا عیب چھپانا مشکل ترین کام معلوم ہوتا ہے' پتہ نہیں ان اخلاقی خرابیوں سے ایک مثالی معاشرہ کی تعمیر کیسے ممکن ہوسکتی ہے؟ حالانکہ عزت نفس اور ستر مسلم' سے متعلق رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کی الگ الگ ضروریات کا ذکر کرتے ہوئے بشارتیں دی ہیں اور ترغیب دلائی ہے کہ ان امور پر سختی سے عمل پیرا ہوں:

مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُؤْمِنٍ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ الدُّنْيَا، نَفَّسَ اللَّهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ يَسَّرَ عَلَى مُعْسِرٍ، يَسَّرَ اللَّهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ، وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا، سَتَرَهُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ، وَاللَّهُ فِي عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِي عَوْنِ أَخِيهِ۔ (مسلم)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس آدمی نے کسی مسلمان کی دنیاوی مشکلات میں سے کوئی مشکل دور کی اللہ تعالیٰ اس کی قیامت کی مشکلات میں سے کوئی مشکل دور کردے گا، اور جس آدمی نے کسی تنگ دست کے لیے آسانی کی اللہ تعالیٰ اس کے لیے دنیا اور آخرت میں آسانی کردے گا، اور جس نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی اللہ تعالیٰ اس کی دنیا اور آخرت میں پردہ پوشی کرے گا اور جب تک کوئی بندہ اپنے بھائی کی مدد کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرتا رہتا ہے۔

اس تناظر میں مولانا کا طرزِ عمل بڑا عمدہ اور قابل تقلید معلوم ہوتا ہے۔ بلاشبہ آپ نے تحریکی اور معاشرتی امور میں ہزاروں لوگوں کے مسائل سنے اور انہیں حل کرنے کی کوشش کی لیکن کبھی کسی موقع پر کسی نام کے ساتھ کسی متعین واقعہ یا مسئلہ کا ذکر نہیں کیا' جہاں ضرورت پڑتی عمومی انداز سے گفتگو کرتے۔ اس ضمن میں آپ کا وہ مشہور قول مشعل راہ ہے کہ "ہمارے سینے رازوں کے قبرستان ہونے چاہئیں"۔ کسی کی عزت نفس اور ستر پوشی کا تعلق' دل کی پاکیزگی کے علاوہ زبان کے محتاط استعمال سے ہے۔ بلکہ داخلی ماحول کا غیبت' لایعنی گفتگو' شکوہ' شکایت' بدظنی اور ناراضگی سے پاک رہنا بھی انہیں امور سے تعلق رکھتا ہے۔ اس ضمن میں مولانا کے اخلاق حسنہ کے مختلف پہلوؤں کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

(۵) مقصد کے لیے دم آخر تک یکسوئی

محترم سید سعادت اللہ حسینی صاحب امیر جماعت منتخب ہونے کے کچھ دنوں بعد مولانا سے ملاقات کے لیے رائچور تشریف لائے تھے۔ ملاقات سے قبل مقامی رفقاء نے آپ کو مولانا کی صحت وغیرہ سے متعلق اپ ڈیٹ کیا۔ بتایا کہ مولانا کی سماعت متاثر ہے' کچھ باتیں یاد نہیں رہتیں۔ آپ کی ملاقات بس ملاقات ہوگی' متعین امور پر گفتگو ممکن نہیں وغیرہ۔ بہرحال بعد عصر' مولانا سے ملاقات کے لیے محترم امیر جماعت آپ کے گھر پہنچے۔ علیک سلیک کے بعد گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ مولانا پوچھتے رہے کہ کب آئے' کہاں سے آئے' سب کیسے ہیں وغیرہ۔ ملاقات کے چند منٹوں تک سب کو غالباً یہ احساس ہوگیا کہ ملاقات زیادہ دیر تک نہیں ہوسکے گی۔ بہرحال مولانا بہ تکرار وہی باتیں کرتے رہے۔ اسی دوران آپ نے محترم امیر جماعت سے پوچھا کہ واپسی کب ہے؟ انہوں نے کہا کہ مغرب پڑھ کر حیدرآباد واپسی کا پروگرام ہے۔ یہ سننا تھا کہ مولانا نے سب سے مخاطب ہوکر کہا کہ اگر آپ لوگوں کو زحمت نہ ہوتو میں محترم امیر جماعت سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ جیسے ہی یہ جملے ادا ہوئے' سارے رفقاء ایک دوسرے کو تکتے رہے' گویا یہ محسوس ہورہا تھا کہ جیسا کچھ سوچ سمجھ کر آئے تھے' معاملہ اس کے بالکل برعکس نکلا۔ غرض! تمام رفقاء گھر سے باہر صحن میں تشریف فرما ہوئے اور موجود اور سابق امیر جماعت محو گفتگو رہے۔ ان دونوں کے درمیان خاصے وقت تک گفتگو ہوتی رہی۔ پھر

مغرب کی اذان سے پہلے سب وہاں سے رخصت ہوئے۔

انتقال سے تقریباً ایک سال پہلے ہی سے مولانا کی طبیعت میں کافی اتار چڑھاؤ ہو رہا تھا۔ سماعت متاثر تھی اور یادداشت بھی کمزور ہوگئی تھی۔ ملاقات کرنے والوں سے باتیں تکرار کے ساتھ ہوتی تھیں۔ بولتے کم تھے' سنتے زیادہ تھے۔ لیکن سبھی ملنے والے رفقاء واحباب کا یہ تاثر تھا کہ جب بھی مقصد ونصب العین سے متعلق گفتگو ہوتی تو مولانا ہمہ تن متوجہ ہو جاتے' ایسا لگتا آپ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ باتوں میں روانی' مقصد کی وہی تڑپ' اخلاص وللّٰہیت سے کام کرنے کی تلقین ......اس وجہ سے ملنے والوں کو اپنی ملاقات پر مکمل اطمینان ہوتا تھا' شاید یہی وجہ ہے کہ انتقال سے پہلے تک مولانا سے ملاقاتوں کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح جاری رہا۔

مولانا کی مقصد کے لیے یکسوئی ضعیفی کی حالت میں بھی برقرار رہی۔ جب تک آپ میں قوت وتوانائی تھی، راہ خدا میں سرگرم عمل رہے اور جب ضعیفی کی اس عمر کو پہنچے تو اپنے قول سے مقصد کا حق ادا کرنے کی کوشش کی۔ کسی شخص کا دم آخر تک راہ خدا میں استقامت کا مظاہرہ کرنا اور مقصد کے لیے کبھی نہ رکنا اور نہ تھکنا' وقتی نہیں ہوتا بلکہ اس شخص کی سابقہ طویل جدوجہد کا پرتو ہوا کرتا ہے۔ زندگی بھر جس مقصد ونصب العین کے لیے کوشش کی تھی' اسی کے ثمرات وبرکات میں سے یہ بات ہوتی ہے کہ دم آخر تک قلب وذہن میں صرف مقصد ہی کی دھن سوار رہتی ہے۔ تادم حیات راہ خدا میں استقامت کا مظاہرہ کرنے والوں کے سلسلہ میں قرآن مجید دو جامع الفاظ وواضح کرتا ہے:

نہ وہ دل شکستہ ہوئے، نہ ہی انہوں نے کمزوری دکھائی۔ (سورہ آل عمران:۱۴۶)

نہ ان کے ارادوں اور حوصلوں پر کسی قسم کی کمزوری طاری ہوتی ہے اور نہ ہی راہ خدا میں کسی نہ کسی درجہ سرگرم عمل رہنے میں انہیں کوئی تھکان لاحق ہوتی ہے۔

عطا ہوئی ہے تجھے روز وشب کی بیتابی
خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی

(۶) نوجوانوں سے شفقت ومحبت

نوجوانوں سے ربط وتعلق میں مولانا کا بڑا خاص معاملہ تھا۔ کل ہند سطح پر طلبہ ونوجوانوں کی

تنظیم ایس آئی او کے قیام کے لیے دو مرحومین کا رول کبھی بھلایا نہیں جا سکتا' مولانا محمد شفیع مونس صاحبؒ اور مولانا محمد سراج الحسن صاحبؒ۔ ٹی کے عبد اللہ صاحب بھی ان کے بڑے ممد و معاون رہے۔ان حضرات کی جانب سے شمال اور جنوب کے حلقوں کے دورے اور نو جوانوں سے گفت وشنید کے لیے منعقدہ بڑی بڑی نشستیں اور اجتماعات اب تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔ تاریخ کے انہیں اوراق سے مولانا مرحومؒ کا نوجوانوں سے تعلق اور اس کی اصل روح معلوم ہوتی ہے۔ 1960 کے وسط سے لے کر تقریباً 35 سالوں تک مولانا نے نوجوانوں کو تحریک کے لیے تیار کرنے کی منصوبہ بند کوشش فرمائی ہے۔جبکہ 1960 تا1970 کا وہ دور بھی قابل غور ہے جس میں مولانا نے نوجوانوں کو جماعت میں رکن اور کارکن کی حیثیت سے شامل کر کے انہیں تحریکی قافلہ کا جانثار سپاہی بنایا ہے۔اگر یہ کہا جائے کہ اب جماعت اور ایس آئی او میں موجود 20 تا 60 یا65 سال کے عمر کے وابستگان' مولانا سے راست یا بالراست تربیت یافتہ ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

بیشتر نو جوانوں کے لیے مولانا کی شخصیت پدرانہ تھی' بڑے شفیق اور محبت کرنے والے' صلاحیتوں کو پہچان کرانہیں صحیح رخ دینے والے اور میدان عمل فراہم کرنے والے۔

تحریک اسلامی کی تاریخ کا یہ ایک سنہری باب ہے جو سراسر ایمان افروز اور محبت رسول ﷺ سے سرشار ہے۔ بڑوں کا اپنے سے چھوٹوں سے محبت کرنا اور چھوٹوں کا اپنے بڑوں کا ادب واحترام کرنا سراسر ایمان کے تقاضوں میں سے ہے۔رسول اللہ ﷺ نے ایک مثالی اسلامی معاشرہ کی تعمیر کے لیے بڑوں اور چھوٹوں کے درمیان خوشگوار تعلق کو بڑی تاکید کے ساتھ بیان فرمایا ہے:

مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيرَنَا، وَيَعْرِفْ حَقَّ كَبِيرِنَا، فَلَيْسَ مِنَّا۔

جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا اور بڑوں کا حق نہیں پہچانتا، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔(ترمذی)

مولانا نے نوجوانوں کی تربیت کا جو خاص طریقہ اختیار کیا تھا اس میں ذاتی روابط' دوروں میں ساتھ رکھنا' دفتر میں قیام کے لیے مدعو کرنا' ہر چھوٹے بڑے پروگراموں میں شرکت کے بعد

ان سے معلومات حاصل کرنا، جن امور کو اپنانا یا چھوڑ نا ضروری ہے ان کی نشاندہی اور بہ کثرت ان کی تکرار کرنا، خصوصی ملاقاتوں کے لیے وقت فارغ کرنا، حسب موقع نصیحت کرنا وغیرہ۔

ایک مرتبہ جب وہ امیر جماعت تھے، سید سعادت اللہ حسینی صاحب اور عبدالجلیل صاحب کے ہمراہ ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دوران گفتگو آپ نے جو نصیحت فرمائی اور جن امور کی جانب توجہ دلائی، ان کے حاصل کے طور پر یہ شعر سنا دیا:

کیف پیدا کر سمندر کی طرح

وسعتیں، خاموشیاں، گہرائیاں

یہ شعر اس قدر قلب و ذہن میں سما گیا کہ اگلے ماہ شائع ہونے والے رفیق منزل کے کور پیج پر یہی شعر درج تھا (اکتوبر 1999)۔

مولانا کی جن اخلاقی خوبیوں کو اختیار کرنے کی تاکید کی ہے ان کا ذکر وسعت قلب، وسعت نظر وغیرہ کے حوالے سے پچھلے صفحات میں ہو چکا ہے۔ان کے علاوہ اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط رکھنا، بے لوث خدمت کرنا، موقع کو غنیمت جاننا، ہر کام کی کامیابی پر اللہ ہی کا شکر ادا کرنا، اپنی اصلاح وتربیت کے لیے آمادگی پیدا کرنا اور ہر دم اس کے لیے تیار رہنا وغیرہ جیسے امور قابل ذکر ہیں۔اور جن امور سے بچنے کی تاکید کرتے ان میں نفس کو غرور وتکبر سے پاک رکھنا، خود پسندی، منصب کی خواہش، ذاتی تربیت سے بے نیازی، اجتماعیت میں رہتے ہوئے انفرادیت پسند بننا، جماعت کو ذاتی مفادات کے لیے بروئے کار لانا، جماعتی مقصد کے علاوہ کسی اور کام میں سرگرم ہو جانا، اپنی رایوں پر اسرار کرنا، صرف اپنی ہی سوچ وفکر کو صحیح سمجھنا، دوسروں کی آراء کا احترام نہ کرنا وغیرہ۔

اس ضمن میں مولانا کا خاص انداز یہ تھا کہ جو رفیق جماعت جس سطح کا ہے اس کے سامنے ان امور کی اسی مناسبت سے وضاحت فرماتے۔اگر معاملہ کسی منصبی ذمہ دار سے متعلق ہو تو نہ صرف ان امور کی وضاحت کرتے بلکہ تاکیداً کہا کرتے کہ "ذاتی اصلاح وتربیت کا کام مشکل ہے، جو لوگ دوسروں کی اصلاح وتربیت کے لیے کوشاں ہیں ان کا اپنی ذاتی اصلاح پر توجہ دینا مشکل تر ہے"۔

بڑوں اور چھوٹوں کے درمیان اس معنوی تعلق کا احیاء وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ بزرگوں اور نوجوانوں کے درمیان بڑھتے فاصلوں کی وجہ سے آج ملک کا بیشتر حصہ نوجوانوں کی مثالی تحریکی خدمات سے خالی نظر آتا ہے۔ اس تعلق کا احیاء نوجوانوں میں حرکت وعمل کی روح پھونکنے کا ذریعہ بن سکتا ہے ان کی صالحیت اور فکری بالیدگی کے لیے راہیں ہموار کرسکتا ہے اور ملک وملت کی تعمیر وترقی کے لیے ان کے تاریخ ساز کارنامے یقینی بنا سکتا ہے۔

آج جب کہ مولانا ہمارے درمیان نہیں رہے ان سے محبت ولگاؤ کے بارے میں غور کیا جائے تو یہ پہلو ابھر کر سامنے آتا ہے کہ قیادت' دراصل شجر ہائے سایہ دار کی طرح ہونی چاہیے کہ جو بھی اس سے قربت اختیار کرے' مستفید ہوجائے اس کی دنیا روشن ہوجائے۔ امیر وما مورین کے درمیان سمع وطاعت کے درست اور چست نظم کے پیچھے یہی استفادہ کا پہلو فیصلہ کن محرک کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر قیادت' اپنے مامورین کے لیے علمی' فکری' عملی اور اخلاقی پہلوؤں سے استفادہ کے مواقع فراہم نہ کرے تو قیادت سے محبت تو دور آپسی تعلقات کا' معمول کے معیار پر بھی رہنا مشکل ہوجاتا ہے۔

امیر وما مورین کے درمیان اس استفادہ کے تعلق پر غور کریں تو بخوبی معلوم ہوجاتا ہے کہ کیوں حضرات صحابہ کرامؓ اللہ کے رسول اللہ ﷺ سے محبت کا برملا اظہار کیا کرتے تھے اور کیوں ان کی زبانوں پر فداہ امی وابی - میرے ماں باپ آپ پر قربان - کے الفاظ جاری ہوجاتے تھے؟

جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ

ڈاکٹر سلیم خان، رکن مرکزی مجلس شوری جماعت اسلامی ہند

جانے والے کبھی نہیں آتے، جانے والوں کی یاد آتی ہے۔ جب کوئی ہمارے بیچ سے چلا جاتا ہے تو اس کی یاد بہت آتی ہے۔ مولانا سراج الحسن کے وفات کی خبر سے یادوں کے خاموش سمندر میں گویا ایک تلاطم برپا ہوگیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھا جائے اور کسے چھوڑ دیا جائے۔ مولانا کا مسکراتا چہرہ آنکھوں میں آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں چھوڑو ان سب باتوں کو' کچھ کام کرو کام'، لیکن دل ہے کہ مانتا نہیں۔ ایسے میں جب کہ انسانی دماغ شل ہوجائے اور قلم منجمد ہوجائے تو انسان کیا کرسکتا ہے؟ کل شام سے اعظم شہاب کا اصرار ہے کہ کچھ لکھو لیکن اگر قوت اظہار سلب ہوجائے تو انسان کیا کرے۔ اسٹیج سے ہٹ کر مولانا کو پہلی بار بنگلور میں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ کرناٹک کے اندر ایس آئی او بہت مضبوط تھی اور ایس آئی ایم کا کام نہیں کے برابر تھا۔ چند مقامات پر کچھ رابطے تھے جن کو استوار کرنے کے لیے میں بنگلور گیا تو سب سے پہلے امیر حلقہ (کرناٹک: جماعت اسلامی ہند) سے ملنے کے لیے ان کے دفتر پہنچ گیا۔

مولانا سراج الحسن صاحب سے ملاقات ہوئی تو طبیعت بحال ہوگئی۔ انہوں نے اپنی گرمجوشی اور وسعت قلبی سے دل موہ لیا۔ وہ ایسا زمانہ تھا کہ لوگ ایس آئی ایم کو جماعت کا باغی اور نافرمان قرار دے رہے تھے لیکن مولانا سراج الحسن کے نزدیک اس کا شائبہ تک نہیں تھا۔ انہوں نے دفتر حلقہ میں قیام کی پیشکش کی۔ اس وقت دفتر میں حلقہ کی شوریٰ کی نشست ہورہی تھی اس میں ساتھ لے گئے اور دیگر ارکان سے ملاقات کرائی۔ مولانا کی اعلیٰ ظرفی نے ایس آئی ایم اور ایس آئی او کے درمیان کی دیوار کو پلک جھپکتے ڈھا دیا۔ اس کے بعد مولانا مرکز جماعت دہلی میں سکریٹری کے طور پر آئے تو وہاں کمال سنجیدگی کا ماحول تھا۔ ان کی آمد کے

بعد پہلی بار مرکز جماعت میں ناشتے کے دوران دہلی کے پاپے اور مولانا کے لطیفے مشہور ہونے لگے۔ برسوں تک آنے جانے کے باوجود جو لوگ تکلف برتا کرتے تھے وہ کھل کر ہنسنے بولنے لگے۔ یہ نوجوان نسل کے لیے نہایت خوشگوار تبدیلی تھی۔

مولانا سراج الحسن صاحب کے کندھوں پر امیر جماعت کی ذمہ داری آئی اور انہوں نے ہم جیسوں کو جماعت کا رکن بنالیا۔ اس بیچ جماعت کا مرکز چتلی قبر سے نکل کر ابوالفضل منتقل ہو چکا تھا۔ اُس وقت کاروباری سلسلے میں دہلی جانے کا موقع ملا تو سب سے بڑی خواہش مولانا سے ملاقات کی تھی۔ استقبالیہ پر پوچھ ہی رہا تھا کہ کیا امیر جماعت سے ملاقات ہوسکتی ہے؟ پیچھے سے ایک شفیق ہاتھ شانے پر آگیا۔ مڑ کر دیکھا تو مولانا نے سلام میں پہل کی اور معانقہ کیا۔ یہ بات تصور سے پرے تھی کہ کوئی سربراہِ جماعت اپنے ایک نئے رکن کا ایسا پرتپاک خیر مقدم بھی کرسکتا ہے۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گئے۔ چند لمحات کے اندر امیر اور مامور کا فرق ختم ہوگیا۔ ایسی انکساری اور بے تکلفی کہ جس کا تصور بھی محال تھا۔ کتابوں میں پڑھا تھا کہ بزرگوں کی صحبت سے روح سرسبز و شاداب ہوجاتی ہے۔ اس کا عملی تجربہ ہوگیا۔ اس ملاقات کی خوشبو آج بھی قلب کے کسی گوشے میں تروتازہ ہے۔

ممبرا میں ارکان کا ایک اجتماع میرے گھر سے پیدل فاصلے پر تھا۔ میں نے امیر مقامی سے پوچھا کہ مولانا کو اپنے گھر لے جاؤں وہ بولے اگر وہ جانا چاہیں تو میں کون ہوتا ہوں روکنے والا؟ مولانا سے کہا چلئے میرے گھر پر آرام کیجیے تو بولے نہیں یہیں ٹھیک ہے۔ پوچھا کیوں؟ تو جواب دیا: تمہارے گھر والوں کو زحمت ہوگی۔ میں نے بتایا کہ گھر پر کوئی ہوگا تو زحمت ہوگی۔ بچے اپنی امی کے ساتھ نانا نانی کے گھر چھٹیاں منارہے ہیں۔ مولانا راضی ہوگئے۔ میں نے انہیں خواب گاہ میں آرام کرنے کے لیے کہا اور خود ہال میں آکر لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ باہر آئے اور مجھ کو اندر جاکر سونے کا حکم دیا۔ میں نے پوچھا آپ کہاں آرام کریں گے؟ تو کہنے لگے میں یہاں باہر والے کمرے میں (زمین پر) ٹھیک رہوں گا، تم اپنے بستر پر جاکر سوجاؤ۔ میں بولا یہ نہیں ہوسکتا۔ وہ اصرار کرنے لگے تو میں نے پوچھا کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں رات بھر جاگتا رہوں؟ اس پر وہ خاموشی سے اندر چلے گئے۔ اس کے بعد

میں گھوڑے بیچ کر سو گیا لیکن مجھے نہیں پتہ کہ وہ اندر سو سکے یا نہیں؟

قرآن مجید کا مراٹھی ترجمہ ہوا تو اس کا اجراء کرنے کے لیے امیر جماعت مولانا سراج الحسن صاحب ممبئی تشریف لائے۔ ممبئی میں کے سی کالج کا ہال بالکنی تک بھرا ہوا تھا۔ اس جلسہ میں مراٹھی کے بہت بڑے ادیب یو ایم پٹھان، معروف صحافی ارون سادھو اور ایک جج صاحب کے علاوہ مشہور معروف لوگ اظہار خیال کر رہے تھے۔ میں نے نظامت کرتے ہوئے کچھ مقررین پر تبصرہ کر دیا۔ درمیان میں مغرب کی نماز کا وقفہ ہوا تو مولانا نے امیر مقامی سے کہلوا دیا کہ سلیم کو تبصرہ کرنے سے منع کر دو۔ میں نے امیر مقامی سے کہا یہ نہیں ہوگا آپ اگلے حصے کی نظامت کسی اور کے سپرد کر دیں۔ وہ بولے نہیں ایسا کرنے سے مولانا ناراض ہو جائیں گے۔ کس شقی القلب کے لیے ممکن تھا کہ مولانا سراج الحسن صاحب جیسے شفیق بزرگ کی دلآزاری کرے؟ بات اس وقت ختم ہوئی تو آج یاد آ گئی۔

مہاراشٹر کے امیر حلقہ کا انتخاب ہونا تھا۔ مولانا مرکز سے نگرانی کے لیے تشریف فرما تھے۔ اس مجلس میں ہمیشہ باغ و بہار رہنے والی شخصیت کو نہایت سنجیدہ دیکھا۔ دن بھر بحث چلتی رہی۔ مختلف لوگ اپنی رائے کچھ احتیاط اور کچھ بے احتیاطی کے ساتھ رکھتے رہے۔ مولانا پر کمال سنجیدگی طاری تھی۔ ساری کارروائی کے دوران انہوں نے کوئی دخل اندازی نہیں کی۔ ہر ایک کو کھل کر بولنے کا موقع دیا اور خود چپ چاپ ساری باتیں لکھتے رہے۔ مولانا کی جوشیلی تقاریر اور ہلکے پھلکے لطیفوں سے لطف اندوز ہونے والے ہم جیسے لوگوں کو نہایت خشک تنظیمی بحث میں مولانا کی غیر معمولی دلچسپی نے بے حد متاثر کیا تھا۔ نشست کے بعد تنہائی میں یہ پوچھنے پر کہ مولانا جن دو افراد پر سارے لوگوں نے گفتگو کی ان دونوں نے تیسرے فرد کا نام کیوں پیش کیا؟ مولانا اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کر حکمت و موعظت کے ساتھ بولے بہت زیادہ سوچنا اچھا نہیں ہے گویا کہہ رہے ہیں 'بہت زیادہ گمان کرنے سے بچو بعض گمان گناہ ہوتے ہیں'۔ پھر اس کے آگے سوال کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

مولانا سراج الحسن صاحب کی حیران کن مقبولیت کا سراغ نبی کریم ﷺ کی اس حدیث میں ملتا ہے کہ ایک شخص نے رسول اکرمؐ کی خدمت میں آ کر عرض کیا: یا رسول اللہؐ! مجھے کوئی ایسا

عمل بتلائیے کہ جس کے بجا لانے سے اللہ تعالیٰ بھی مجھ سے محبت کرے اور لوگ بھی محبت کریں۔ یہاں پر اللہ سے محبت کی توفیق کا مطالبہ نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا تقاضا ہے۔ کائناتِ ہستی میں عظیم ترین سعادت یہ ہے کہ بندے کا ربِ کائنات کے ساتھ محبت کا رشتہ قائم ہو جائے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ازخود اپنے بندے سے محبت کرنے لگے۔ اس کیفیت کا اندازہ محبت کرنے والے دل کے سوا کوئی اور نہیں لگا سکتا۔ کسی بندے سے اللہ تعالیٰ کتنی محبت کرتا ہے یہ بھی ہم نہیں جان سکتے لیکن اس سے بندے کس قدر محبت کرتے ہیں اس کا اندازہ بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے۔ اس حوالے سے مولانا سراج الحسن صاحب قابلِ رشک شخصیت حامل تھے۔ آپ ﷺ نے اپنے صحابی کے استفسار کا جواب یہ دیا کہ: ''دنیا سے بے رغبت ہو جاؤ'' اللہ تعالیٰ تم سے محبت فرمائے گا' اور لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس سے بے نیاز رہو، لوگ تم سے محبت کریں گے''۔

دنیا سے بے رغبتی اور لوگوں سے بے نیازی پر درس و تقریر تو بہت آسان ہے لیکن اس کو اپنی رگ و پے میں بسا لینا بہت مشکل ہے۔ مولانا سراج الحسن نے اس کا جو عملی نمونہ پیش کیا ہے ملاحظہ فرمائیں۔ امیر جماعت کا انتخاب ہو رہا تھا۔ چوتھی مرتبہ مولانا سراج الحسن کے منتخب ہو جانے کا قوی امکان تھا۔ ایسے میں مولانا نے اپنی معذرت اس طرح پیش کی کہ 'میں نے اپنی زندگی میں جماعت کے کسی فیصلے سے سرمو انحراف نہیں کیا۔ اس لیے آپ لوگ مجھے مجبور نہ کریں۔ میں گھر جاکر اپنی والدہ کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ براہِ کرم میری معذرت قبول کرلیجیے'۔ یہ اس شخص کے الفاظ ہیں جس نے رضائے الٰہی کی خاطر اپنی جوانی دین کی سربلندی میں جھونک دی۔ 40 سالوں تک جماعت کے ذریعہ دین کی خدمت کرنے کے بعد وہ اپنی والدہ کی خدمت کے لیے کمال انکساری کے ساتھ رخصت طلب کر رہا ہے۔ اخلاص وللّٰہیت کی عظیم مثال قائم کر کے مولانا محترم مرکز سے یوں رخصت ہوئے کہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

حیدرآباد میں ارکان جماعت کے اجتماع کا دوسرا دن تھا۔ مولانا سراج الحسن اپنی علالت کے باوجود آکر نیچے عام ارکان کے درمیان بیٹھ گئے۔ ہم جیسے لوگوں کو پتہ چلا تو پروانہ وار ان کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ ان سے کہا جانے لگا کہ مولانا آپ اسٹیج پر چلیے۔ مولانا انکار کرتے

رہے۔ میرا پروگرام نہیں ہے۔ میں تو بس شرکت کے لیے حاضر ہوں۔ اپنے ارکان سے ملنے کی خاطر آیا ہوں۔ لوگ نہیں مانے ان کو اسٹیج پر لے گئے۔ تقریر کے لیے کہا تو خرابی صحت کے باوجود مختصر تذکیر میں یہ کہہ دیا کہ شاید یہ ہماری آخری ملاقات ہو۔ ان کے الفاظ سچ نکلے اور ہم جیسے دور دراز کے عقید تمندوں کو اس کے بعد مولانا سے شرف ملاقات نصیب نہیں ہوا۔

عبداللہ جاوید صاحب نے مولانا کے ہسپتال میں داخل ہونے کی خبر دی تو طبیعت بوجھل ہوگئی۔ محمد صدیق قریشی صاحب نے ویڈیو کے ساتھ لکھا کہ زہر جسم میں پھیل گیا ہے تو اسے دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ دعا پر اکتفاء کرلیا اور چند دن بعد پھر عبداللہ جاوید صاحب نے بتایا مولانا آئی سی یو سے نکل کر عام وارڈ میں آگئے ہیں۔ اس کے بعد گھر آنے کا مژدہ بھی آگیا۔ ہم لوگوں نے اللہ کا شکر ادا کیا مگر یہ خوشی دیرپا ثابت نہیں ہوئی جلد یہ مژدۂ جانکاہ بھی وارد ہوگیا کہ مولانا سراج الحسن اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ مولانا رضی الاسلام صاحب نے چراغ کے گل ہونے کی بات بھی لکھی لیکن دل کہتا ہے کہ سب غلط ہے۔ اگر ایسا ہے تو دل کے نہاں خانے میں یہ روشنی کیوں ہے؟ مولانا کا جسد خاکی جمعہ کو ڈھائی بجے سپرد خاک کردیا گیا لیکن سراج الحسن نام قلب و ذہن میں منور ہے اور رہے گا۔ مولانا کی دلفریب مسکراہٹ میں پوشیدہ غلبۂ دین کی تڑپ اس شعر کی مصداق ہمارے ساتھ رہے گی ۔

جلا ہوں عمر بھر سوزِ نہاں میں
رہا ہوں مثلِ گل میں اس جہاں میں

سخن دل نواز، جاں پرسوز!

محمد عنایت اللہ اسد سبحانی، معروف اسلامی اسکالر

قوم کے کسی رہنما، یا کسی میر کارواں کی تین بنیادی صفات ہوتی ہیں، جن کا تذکرہ شاعر مشرق نے بڑے خوب صورت انداز میں کیا ہے: ع

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے

ان میں سے پہلی صفت، یعنی نگہ کی بلندی، جسے قائدانہ بصیرت، یا قائدانہ فہم وفراست بھی کہہ سکتے ہیں، یہ بہت ہی نایاب صفت ہے، جو سیکڑوں ہزاروں لیڈروں، رہنماؤں میں کسی ایک کو حاصل ہوا کرتی ہے۔

یہی وجہ ہے قومیں زیادہ تر اپنا سفر اندھیرے میں طے کرتی ہیں، کسی دیدہ ور رہنما کے نہ ہونے کی وجہ سے مدتوں بھٹکتی رہتی ہیں، وہ اپنی منزل کی طرف پیٹھ کیے ہوئے بگٹٹ بھاگ رہی ہوتی ہیں، اور منزل ان کی بے بصیرتی پر ماتم کر رہی ہوتی ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اسلامی تحریکات اور مسلم جماعتوں اور تنظیموں کا حال بھی ایسا ہی ہوتا ہے، وہ بڑے جوش وجذبے سے قائم کی جاتی ہیں، مگر عام طور سے بلند نگاہ قیادت میسر نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنی ہی جگہ پر آگے پیچھے ہوتی رہتی ہیں، وہ اپنے قیام کے دن جس جگہ کھڑی ہوتی ہیں، آخر تک وہیں کھڑی رہ جاتی ہیں!

یہ کتنی دردانگیز صورت حال ہے! ع

یہ کیسی منزل ہے کیسی راہیں کہ تھک گئے پاؤں چلتے چلتے
مگر وہی فاصلہ ہے قائم جو فاصلہ تھا سفر سے پہلے

ایسے حالات میں ہم اسی کو غنیمت جانتے ہیں کہ ہمارے رہنما دل نواز اور پُر سوز شخصیت کے مالک ہوں، کیونکہ یہ دونوں صفتیں گرچہ پہلی صفت کی طرح نایاب نہیں ہیں، مگر کم یاب ضرور ہیں۔

آج کل ہماری ملت کو دل نواز اور پُرسوز قیادتیں بھی بڑی مشکل سے حاصل ہو پاتی ہیں۔ایسی قیادتیں بڑی مشکل سے مل پاتی ہیں، جو بلند مقاصد کے لیے بکھرے ہوئے دلوں کو جوڑنے، اور جوڑے رہنے کا ہنر جانتی ہوں۔

سابق امیر جماعت اسلامی ہند مولانا سراج الحسنؒ صاحب بفضلہٖ تعالی ان دونوں صفات سے متصف تھے۔کوئی ان کا موافق ہو یا مخالف، وہ اس بات کا انکار نہیں کرسکتا کہ مولانا کے اندر غیر معمولی شان دل نوازی تھی،ان سے جو بھی ملتا تھا،وہ ان کا گرویدہ ہوجاتا تھا۔وہ کسی کی دل شکنی یا دل آزاری کرنی نہیں جانتے تھے۔وہ ہر ملنے والے کو اپنی شفقتوں کی چادر اڑھا دیتے تھے۔

وہ ملت کے نوجوانوں کو تو سر پر بٹھاتے تھے،اور انہیں ولولوں سے سرشار کردیتے تھے، ایس آئی او کے نوجوان تو ان پر جان دیتے تھے، کیونکہ وہ انہیں جہد و عمل کے لیے للکارتے،اور ان کے رگ و پے میں بلند عزائم کی بجلیاں دوڑا دیتے تھے۔

راقم الحروف کو بھی اس کا بارہا تجربہ ہوا۔وہ جب بھی ان سے ملا،ان کی خوئے دل نوازی سے متاثر ہوا۔

یہاں ایک واقعہ کا ذکر کیا جاتا ہے، جو ان کی اسی خصوصیت کی عکاسی کرتا ہے۔یہ واقعہ اس وقت کا ہے، جب راقم الحروف کی مشہور تصنیف (حقیقت رجم) منظر عام پر آچکی تھی،اور وہ بہت سے علمی حلقوں میں موضوع بحث بنی ہوئی تھی۔

اگر کچھ لوگ اسے خراج تحسین پیش کر رہے تھے،تو ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی، جو اس کے خلاف شمشیر بے نیام بنی ہوئی تھی! اور مصنف کے خلاف فتوے بازی کی مہم چلا رہی تھی!

اس وقت راقم الحروف جامعۃ الفلاح بلریا گنج سے وابستہ تھا، اور وہاں تدریسی فرائض انجام دے رہا تھا۔

انہی دنوں جماعت کے کسی اہم پروگرام کے تحت جماعت کے کچھ ذمے داران جامعۃ الفلاح تشریف لائے ہوئے تھے، جن میں امیر جماعت اسلامی مولانا سراج الحسنؒ صاحب بھی تھے۔

مولانا نے اسی موقع پر مجھ سے فرمایا: سبحانی صاحب! آپ سے مجھے کچھ گفتگو کرنی تھی، کس وقت آپ کو فرصت ہوگی؟

گفتگو بس ہمارے اور آپ کے درمیان ہوگی، اس میں کوئی تیسرا شخص نہیں ہوگا۔

مولانا! آپ جس وقت فرمائیں، میں حاضر ہوں، آپ کوئی وقت بتا دیجیے، میں آپ کی قیام گاہ پر حاضر ہو جاؤں گا۔

تو اسی وقت چلے چلتے ہیں، آپ سے بڑی اہم گفتگو کرنی ہے، اس وقت ہم فارغ ہیں، اور شاید آپ بھی فارغ ہی ہوں گے۔

اس وقت ہم لوگ نماز عصر سے فارغ ہوئے تھے، اور جامعۃ الفلاح کی مسجد سے باہر نکل رہے تھے۔ چنانچہ ہم دونوں ایک کمرے میں داخل ہوگئے، جہاں مولانا محترم کا قیام تھا۔

ہم دونوں دو کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ مولانا بہت ہی مشفقانہ انداز میں لب کشا ہوئے:

سبحانی صاحب! میں آپ سے ایک بات کہوں گا، آپ برا تو نہیں مانیں گے؟

برا ماننے کا کیا سوال ہے؟ یہ میری عزت افزائی ہے کہ آپ نے میرے لیے اپنا قیمتی وقت فارغ کیا، آپ ہمارے امیر اور محبوب قائد ہیں، آپ جو بات بھی فرمائیں، آپ کو فرمانے کا حق ہے، آپ جو کچھ فرمائیں گے، ہمارے بھلے کے لیے ہی فرمائیں گے۔

امیر محترم نے فرمایا: سبحانی صاحب! عموما آپ کی کتابیں اور آپ کی تحریریں بہت پسند کی جاتی ہیں، میں بھی آپ کی تحریریں بڑے شوق سے پڑھتا ہوں، مگر آپ کی نئی کتاب (حقیقت رجم) ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ کو یہ کتاب لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کتاب پر بہت سے لوگوں کو اعتراض ہے۔ دوسروں کو میں کیا کہوں؟ خود ہماری جماعت کے اندر بہت سے لوگ اس کتاب پر برہم ہیں!

میرا مشورہ ہے کہ آپ ہمیشہ مثبت چیزیں لکھیں، اختلافی بحثوں میں اپنا وقت نہ ضائع کریں!

میں نے عرض کیا: امیر محترم! اختلافی بحثوں، یا اختلافی مسائل سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے، لیکن اسلامی قوانین، جو قرآن پاک میں صاف صاف مذکور ہیں، ان میں علمائے کرام اور فقہائے عظام سے جو غلطیاں ہوئی ہیں، ان کی اصلاح کون کرے گا؟

ان کی اصلاح تو ضروری ہے۔ انہیں اختلافی مسائل کہہ کر ٹال دینا تو کسی طرح مناسب نہیں ہوگا۔

اگر علمائے کرام کسی غلط بات پر اتفاق کرلیں، جو صریح قرآن کے خلاف ہو، تو کیا کسی قرآنی اسکالر کے لیے جائز ہوگا کہ وہ اس پر خاموشی اختیار کیے رہے؟

امیر محترم نے فرمایا: سبحانی صاحب! کیا ضروری ہے کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہی صحیح ہو؟ اس کا بھی تو امکان ہے کہ جمہور علماء کی ہی بات صحیح ہو، اور آپ کو کچھ غلط فہمی ہو رہی ہو۔

میں نے عرض کیا: امیر محترم! سزائے رجم کے سلسلے میں علماء کرام سے جو غلطی ہوئی ہے، وہ اتنی واضح ہے کہ حیرت ہوتی ہے، اتنی بڑی غلطی کیسے ہوگئی، اور پھر اس پر علمائے کرام کا اتفاق کیسے ہوگیا!

امیر محترم نے فرمایا: تو اتنی بڑی اور اتنی واضح غلطی علمائے کرام سے کیسے ہوگئی؟ اس کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟

میں نے عرض کیا: اس غلطی کی وضاحت کے لیے ہمیں بڑی تفصیل میں جانا پڑے گا، جس کا یہاں موقع نہیں ہے، اگر آپ ناچیز کی کتاب (حقیقت رجم) کا مطالعہ کریں، تو ساری باتیں مدلل انداز میں آپ کے سامنے آجائیں گی۔

اس سلسلے میں مختصر بات یہ ہے کہ قرآن کی ایک آیت جو اپنے مفہوم میں سورج کی طرح روشن تھی، اس روشن آیت کو کمزور، بلکہ گھڑی ہوئی روایتوں کی روشنی میں، یا ان کے زیر اثر ہوکر سمجھنے کی کوشش کی گئی، جس کی وجہ سے سارا معاملہ درہم برہم ہوگیا، اور دشمنان اسلام کو اسلامی شریعت کا مذاق اڑانے کا موقع ہاتھ آگیا!

امیر محترم نے فرمایا: تب تو آپ نے (حقیقت رجم) لکھ کر بڑا زبردست کام کیا

ہے۔لوگوں کو اس کام کی قدر کرنی چاہیے۔

میں نے عرض کیا، ہماری قوم کی بیماری یہ ہے کہ وہ علمی کتابوں کا مطالعہ نہیں کرتی، نہ حقیقت حال کو سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ افواہوں اور پروپیگنڈوں کے پیچھے دوڑنے لگتی ہے۔عوام کا معاملہ بھی یہی ہے، خواص کا معاملہ بھی یہی ہے۔

ٹھیک یہی صورت حال مولانا سید ابوالاعلیٰؒ مودودی کے ساتھ بھی پیش آئی، انہوں نے اقامت دین کی تحریک قائم کی، کتنا زبردست کام انہوں نے کیا تھا، مگر کتنے لوگوں نے ان کا ساتھ دیا؟

ان کے خلاف کیسا طوفان اٹھایا گیا، اور کس کس طرح ان کی تواضع کی گئی!

ہماری گفتگو یہاں تک پہنچی تھی، کہ مغرب کی اذان شروع ہوگئی، اور ہم لوگ مسجد کی طرف روانہ ہوگئے۔

ہماری یہ گفتگو بڑے ہی پرسکون اور خوش گوار ماحول میں ہوئی، شروع سے آخر تک مولانا کا انداز بہت ہی ٹھہرا ہوا، اور بڑا مشفقانہ تھا، اور ہماری زبان پر اقبال کا یہ شعر رواں تھا۔ ع

نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو
رزم ہو، یا بزم ہو پاک دل و پاک باز

مولانا سراج الحسنؒ صاحب کی گفتگوؤں اور تقریروں میں بڑا سوز ہوا کرتا تھا، انہوں نے کئی سال پہلے حلقۂ مشرقی یوپی کی ایک کانفرنس میں جو شہر الہ آباد میں منعقد ہوئی تھی، مسئلۂ کشمیر پر ایک نہایت موثر، اور نہایت سلجھی ہوئی تقریر کی تھی، جس کا ایک ایک جملہ دل کو چھو رہا تھا، اور لوگوں کے درمیان اس کا کافی چرچا رہا۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا سراج الحسنؒ صاحب کے اندر بڑی خوبیاں تھیں، جن کا احاطہ یہاں مقصود نہیں ہے، بہت سے لوگ جو مجھ سے زیادہ ان سے قریب رہے ہیں، وہ ان شاء اللہ ان کی زندگی کے ایمان افروز، اور سبق آموز پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔ اللہ تعالی ان کے درجات بلند فرمائے۔ اور جنت الفردوس میں انہیں صالحین کی معیت نصیب فرمائے۔ آمین

اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی

ڈاکٹر حسن رضا، چیرمین اسلامی اکیڈمی، نئی دہلی

سراج الحسن صاحب مرحوم کے انتقال کو اب ایک ہفتہ سے زیادہ ہوگیا۔کولہے کی ہڈی پہلے ہی ٹوٹ چکی تھی، 12 اپریل کو خبر ملی کہ اب سازِ ہستی کا آخری تار بھی ٹوٹ گیا۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔دوسرے دن بعد نماز جمعہ اس سازِ بے آواز کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ابھی شاید کفن بہت میلا نہیں ہوا ہوگا اور کافور کی بو بھی باقی ہوگی۔اللہ بہتر جانتا ہے کس کے ساتھ بعدِ مرگ کیا معاملہ ہوتا ہے۔کیا عجب کہ جب تک اللہ چاہے کفن پوری طرح صاف شفاف اور اس میں خوشبو باقی رہے۔جس شخص نے دامنِ دل کو ہمیشہ سنبھال کر رکھا اور بندگان خدا کے لیے کبھی اسے میلا ہونے نہیں دیا اور جو ثیابك فطهر پر قابل رشک حد تک عمل پیرا رہ کر محبت کی خوشبو بکھیرتا رہا اس کے لیے عالم برزخ میں رحمت خداوندی کے آثار نمایاں ہونے لگیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔دعا ہے کہ اللہ ان کی قبر کو نور رحمت سے بھر دے! آمین۔

آگے کے مرحلے پردۂ خفا میں ہیں۔کسی کو نہیں معلوم کہ مرنے والا کن مراحل سے کب اور کیسے گزرتا ہے، ہاں اتنا معلوم ہے کہ سوال و جواب کا ایک مرحلہ آتا ہے جب دو فرشتے مرحومین کے پاس آتے ہیں گویا فرسٹ انفارمیشن رپورٹ درج ہوتی ہے پھر مرنے والے کے ساتھ اس کی نیتوں اور اعمال کی رپورٹ کے مطابق معاملہ کیا جاتا ہے۔یہ سوچتے ہی اچانک خیال آیا کہ جب فرشتے سوالنامہ لے کر ان کے پاس حاضر ہوئے ہوں گے تو مرحوم نے اپنی تمام بے سروسامانی اور ناتوانی کے باوجود معانقہ کے لیے اپنے والہانہ انداز میں دست و بازو کو پھیلا دیا ہوگا لیکن جلد ہی منظر کو بھانپ کر ٹھٹھک گئے ہوں گے، تب ندا آئی ہوگی کہ گھبراؤ نہیں، تمہاری انسانیت نوازی اور محبت سے لبریز اداؤں کو شرف قبولیت بخشی گئی اور تمہارے

لیے جنت میں ایک خاص دریچہ ''اخوت ومحبت'' کے نام کا کھول دیا گیا ہے۔ قیامت تک اس کی ٹھنڈی ہوا اور خوشبو سے تمہاری روح معطر رہے گی۔

واقعی سراج الحسن صاحب کی یہی ادائے دلنوازی ان کو ہم عصروں میں سب سے زیادہ ممتاز کرتی تھی۔ ہر چھوٹے بڑے، امیر غریب، اپنے پرائے، کے لیے دل کے دروازے کو اس طرح وا رکھنا، والہانہ پن کے ساتھ بغل گیر ہونا اور روحانی شفقت کے ساتھ پر تپاک استقبال سے نہ تھکنا اپنے اندر شانِ محبوبیت رکھتا ہے۔ ان کا یہ معاملہ چند خاص افراد کے ساتھ نہیں تھا بلکہ سبھوں کے لیے ان کی یہی شان دلربائی تھی۔ ذمہ داران جماعت ہوں یا آفس کے پیون و کلرک۔ لیڈر ہوں یا عامی، کوئی اہل علم ہو یا ناخواندہ، اہل جاہ ومنصب ہوں یا میاں جمن اور صلو، سب کے ساتھ برابر گرم جوشی۔ مساوات اور ایمانی اخوت سے برابر ملتے رہنا۔ آج سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ تہذیبِ نفس اور شائستگیِ قلب کی وہ کون سی منزل تھی جس پر مولانا سراج صاحب مرحوم فائز تھے۔ نمی دانم چہ منزل بود۔

مرحوم کی اس ادا کو بعض لوگ ملاقات کا بس ایک ذاتی زاویہ، نجی پروٹوکول کی رچی بسی ادا، یا پھر سادہ طبیعت اور ملنساری کی ایک بھلی عادت سمجھتے تھے۔ لیکن میرے خیال میں بات اتنی سی نہیں ہے؛ ایسے لوگوں کو ذرا سوچنا چاہیے کہ مصروفیت کی مصنوعی چادر میں لپٹے ہوئے اس عریاں دور میں جب فاصلے کو نبھانا ہی ملنے کا ہنر سمجھا جاتا ہے، ایک اللہ کا بندہ رائج الوقت اخلاقیات کے برعکس پرجوش وپرتپاک انداز سے کیوں ملتا رہا اور شہر شہر قریہ قریہ اخوت کی جہانگیری سے سب کو کیوں لذت آشنا کرتا رہا؟ حالانکہ انہیں معلوم تھا کہ اس دورِ بے وفا میں ہر آن گلابی رہنے کے لیے کتنا گرم گرم خونِ جگر صرف کرنا پڑتا ہے اور اس کا بھی بخوبی اندازہ تھا کہ۔

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملوگے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

بہرحال ان کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو یہی دل کے چشمے سے ابلتی ہوئی محبت کی فراوانی تھی جس کا بھرپور اظہار ان کی پہلی نظر، پہلی ملاقات اور والہانہ بغل گیر ہوکر ان کے نرم کشادہ، کوشن نما چوڑے چکلے پاک دل اور پاک باز سینے سے ہر شخص کو ہوتا تھا جو ان سے ملا ہو

اقبال کے تصور عشق کی ایک جھلک ان کے کردار میں پاتا تھا۔

عشق کی مستی سے ہے پیکر گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام

انسانی تعلقات کو ایک دوسرے پہلو سے بھی دیکھنے کی کوشش کیجئے ہر شخص کی زندگی میں انسانی تعلقات کا ایک تجربہ ہوتا ہے اسی تجربے سے وہ رشتے کو برتنے کا مزہ لیتا ہے۔ایک سطح ملنے کی وہ ہوتی ہے جس میں ایک دوسرے سے ادھار توقعات کو وصول کرنے کی تمنا ہوتی ہے اسی میں ناآسودہ امیدوں کا ڈوبتا ابھرتا سلسلہ جاری رہتا ہے، آرزوں کا ادل بدل یا خواہشوں کا لین دین بھی ہوتا ہے کچھ راہ ورسم کی مجبوری بھی ہوتی ہے۔ ملنے کی اس سطح سے وہ ادا نہیں پنپ سکتی جو سراج الحسن کا عام وطیرہ تھا اس کے لیے تو بھر پور دھڑکتا ہوا دل چاہیے۔ یاد رہے ہر دھڑکنے والی چیز کو دل نہیں کہتے ایک عمر بیت جاتی ہے گوشت کے اس لوتھڑے کو دل بنانے میں اقبال نے غلط نہیں کہا ہے۔

قطرۂ خونِ جگر، سِل کو بناتا ہے دل

تب پیکر ِگل یعنی حضرت انسان میں وہ تابناکی آتی ہے جس کا اظہار ایک دوسرے سے ملنے جلنے میں ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس سے بھی ملتا ہے جو اس سے کٹتا ہے اس کو بھی دیتا ہے جو اس کو نہیں دیتا ہے۔ وہ عفو درگزر سے کام لیتا ہے اگر چہ لوگ اس کے ساتھ ظلم روا رکھتے ہیں۔ یہی سیرت ہے جس کو اسلامی اخلاق، داعیانہ کردار اور انبیائی اسوہ کہتے ہیں جس پر مرحوم فائز تھے، جس کی بعد از مرگ آج بھی لوگ گواہی دے رہے ہیں۔ ملاقات میں شان دلربائی اور رشتوں میں شان جمال صرف خودی کی نگہبانی سے پیدا نہیں ہوتی ہے اس سے آگے کی ایک منزل ''بے خودی'' ہے، اس کے رموز سے بھی آشنائی ضروری ہے۔اس وقت مرکز میں اور بھی قابل قدر ذمہ داران جماعت تھے، بعد میں بھی آتے گئے وہ سب لذت خودی سے آشنا تھے لیکن انسانی رشتوں میں جو ایک مقام ''بے خودی'' سے پیدا ہوتا ہے اس پر سراج الحسن صاحب مرحوم فائز تھے۔

آخر کیا بات ہے کہ کسی کا خط آجائے اور جب تک جواب نہ دیں قرار نہیں ہوتا تھا؛ تمام

مصروفیات اور ہنگامہ ہائے گو بہ گو یعنی تنظیمی دورے کے عین درمیان سفر میں بھی روز موصول ہونے والے خطوط کا جواب اسی دن دے دیتے تھے۔ کسی نے اپنی پریشانی، دکھ، تکلیف اور مصیبت کا ذکر کیا، دعا کی درخواست کی تو اس کو لکھ لیتے تھے، تہجد میں خصوصی طور پر دعا کرتے پھر اس کو دلاسہ دیتے، اپنی دعا کا ذکر کرتے اور امید دلاتے کہ اللہ تمہاری پریشانیوں کا ازالہ کرے گا۔ ذاتی مسائل، مشکلات، شادی بیاہ، امراض، کاروبار سب میں مونس وغم گسار رہے۔ مشورے دیتے، مدد کرتے، رشتہ تلاش کرتے۔ مناسب معلوم ہوتا تو دونوں سے رابطہ کرادیتے۔ پوری انسانیت خدا کا کنبہ ہے اور خدا واسطے اس کو اپنا کنبہ بنالینا بہت مشکل ہے لیکن وہ اس مشکل کو اپنے لیے آسان بنا چکے تھے، یہی ان کی عظمت کا راز تھا۔

کسی سے بے وفائی یا گلۂ جفا کرتے ہوئے میں نے انہیں نہیں دیکھا بلکہ ہر ایک کے ساتھ ملنے میں ایک احساس تکمیل سے لبریز اور پرسکون پایا۔ وہ دوسروں کی چھوٹی چھوٹی باتوں اور ضرورتوں کا خیال رکھتے تھے۔ بڑے چھوٹے ہر ایک کے ساتھ ایسا فدویانہ اسلوب کہ ؎
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینے کو۔

شوریٰ کے اجلاس کے لیے آمد ہو یا اجلاس کے بعد شرکاء کی واپسی ہو، وہ امیر جماعت ہوتے ہوئے، پوری طرح فکر مند رہتے تھے۔ بلکہ ان کی فکر مندی قابل دید ہوتی، کہیں کسی کی ٹرین لیٹ نہ ہو جائے، کون کس وقت پہنچے گا، کس کو کب جانا ہے، کون ڈرائیور چھوڑنے جائے گا، 2 بجے رات ہو، 4 بجے کا سویرا، دن میں قیلولہ کا وقت ہو، یا 12 بجے دن کی بھیڑ بھاڑ سب کے جانے کی خبر خود رکھتے تھے بلکہ ایک طرح کا اضطراب رہتا تھا۔ پھر اس کے لیے سہولت کی ہر ممکن کوشش بھی کرتے تھے۔ کس جماعت کا امیر اتنا فکر مند رہتا ہے؟ بلکہ بعض تو اس کو کسر شان اور منصبی آداب سے فروتر کام سمجھتے ہوں گے لیکن مرحوم میں رفقاء کے لیے ایک ممتا والی فکر مندی، پدرانہ شفقت، بھائی جیسا اضطراب، گہرے دوست والی تڑپ صاف جھلکتی تھی۔ شوریٰ کے اجلاس کی تاریخ کی اطلاع کے ساتھ ایک مشفقانہ مشورہ اکثر دیتے تھے کہ رانچی سے ڈاکٹر احمد سجاد صاحب کے ساتھ ریزرویشن کرائیں۔ اس زمانے میں رانچی سے ایک ٹرین بڑی سخت جان جموں توی چلتی تھی۔ ہم لوگ بھی ساتھ آنے میں عافیت محسوس کرتے تھے، مولانا کے

مشورے سے یاددہانی ہوجاتی تھی۔ سفر میں رفیق کی معیت کے فوائد بتاتے اور واپسی کا پروگرام بھی اس طرح بنانے کی تاکید کرتے کہ دونوں ہم سفر ہوں۔ شفیع مونس مرحوم نے اپنے انٹرویو میں جو ''جماعت اسلامی ہند کے 60 سال'' میں موجود ہے، فرماتے ہیں کہ ''سراج الحسن صاحب کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ ان سے سب خوش رہتے تھے۔ کسی کو ناگواری نہ ہو اس معاملے میں وہ سب سے زیادہ کامیاب رہے۔'' مرزا غالبؔ کو ان کی صحبت نصیب ہوجاتی تو یہ مصرعہ واپس لے لیتے ؎

ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

مولانا مودودیؒ کا کتابچہ ''اسلامی تزکیہ نفس'' مجھے بہت پسند ہے۔ مولانا نے حسن سیرت کے عنوان سے لکھا ہے کہ ''خدا کی راہ میں کام کرنے والے لوگوں کو عالی ظرف اور فراخ حوصلہ ہونا چاہیے، ہمدردِ خلائق اور خیر خواہ انسانیت ہونا چاہیے، کریم النفس اور شریف الطبع ہونا چاہیے، خوددار اور خوگر قناعت ہونا چاہیے، متواضع اور منکسر المزاج ہونا چاہیے، شیریں کلام اور نرم خو ہونا چاہیے۔''

اس کو پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ سراج الحسن صاحب ان خوبیوں کے کاربن کاپی تھے اور ان خوبیوں کو انہوں نے اپنی ذات میں اتار لیا تھا چنانچہ جذبے کی معصومیت، طبیعت میں لینت، شخصیت میں حلاوت، مزاج میں شیرینیت، رویئے میں ریشم کی نرمی اور آنکھوں میں جھانکتی ہوئی معصومیت اور مروت کے ساتھ ''عمل پیہم'' کے ایک نمایاں وصف کا اضافہ کردیجئے تو جو دل آویز پیکر ابھرے گا وہی سراج الحسن صاحب کی اصل شخصیت تھی۔

مرحوم دیکھنے میں بھی بسطۃ فی الجسم والحلم کے پیکر تھے۔ محبت سے سرشار چوڑا چکلا کشادہ سینہ، ناز و نعم میں پلا ہوا توانا دوہرا اور اوسط قد سے تھوڑا نکلتا ہوا بھرا بھرا صحت مند جسم، جس سے متانت و وجاہت نمایاں تھی۔ گول چہرہ سانولا گندمی رنگ، ناک نقشے میں مردانہ موزونیت اور اس پر بھرپور اور پرنور داڑھی؛ چشمہ کے پیچھے سے جھانکتی، مسکراتی، کبھی حال دل کہتی ہوئی آنکھیں۔ چال ڈھال میں ایک میانہ روی، بول چال میں بے تکلفی اور دل آویزی، حیدرآبادی شیروانی اور ٹوپی ان کی شخصیت کی وجاہت کو نکھار کر دیدہ زیب بنا دیتی۔ ان کے ہاتھ میں عصا

ایک پرعزم شخصیت کا استعارہ بن جاتا تھا۔ان کو مرکز کے رہائشی کمرے میں بھی دیکھا، کئی بار دیر تک وہیں ملنے کا اتفاق ہوا، وہاں بیٹھ کر گپ شپ ہوئی، خان صاحب والا لطیفہ ان کے رہائشی کمرے ہی میں سنا تھا کہ آدم خان، موسی خان، عیسی خان سب پٹھان تھے؛ اگر آدم علیہ السلام خان نہ ہوتے تو اللہ میاں نے جس طرح جنت سے زمین پر پھیکا تھا، ہڈی پنجڑی سب ٹوٹ کر برابر ہو جاتی، وہ تو خان صاحب تھے کہ صحیح سالم کھڑے رہ گئے۔ وہ خود خان تھے اس لیے اس لطیفے کو بیان کرکے معصوم ادا کے ساتھ خوب ہنستے۔کئی دفعہ کمرے میں ٹی وی دیکھتے ہوئے لنگی بنیائین اور گول ٹوپی میں چھوٹی گردن کے ساتھ کچھ زیادہ گول مٹول اور بے تکلف لگتے تھے۔ان کے سلسلے میں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ حالات وواقعات سے پورا اثر لیتے تھے۔ بہت حساس تھے۔ایک دفعہ کمرے میں ٹی وی پر جیسے ہی دلی کا درجہ حرارت سنا تو ان کو ٹھنڈک لگنے لگی، فوراً اٹھے ایک قمیض سوئٹر ڈالا اور باہر نکل کر احباب کو کہنے لگے ارے بھئی! ذرا ٹھنڈک کا خیال رکھیے، سردی بڑھ گئی ہے اور پھر کمرے میں جا کر ٹی وی دیکھنے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ بچپن کے بعض سخت واقعات نے انہیں بے حد حساس اور تأثرات کے ساتھ لاشعوری خوف میں مبتلا کر دیا ہے۔

وہ زندگی میں انفرادی واجتماعی تاثرات کو بھی بہت اہمیت دیتے تھے۔چناں چہ ذات ہی نہیں ذات کا سایہ بھی درست رہے۔ تنظیم کا داخلی ماحول ہی نہیں اس کی پرچھائیں میں بھی توازن رہے۔اس کی بھی فکر رکھتے تھے یقیناً اس کے مثبت کے ساتھ منفی پہلو بھی ہیں۔منفی پہلو وہاں سے شروع ہوتا ہے جب اصل کی فکر تو نہ ہو صرف پرچھائیں کو سنوارا جانے لگے۔مولانا کی نگاہ اس معاملے میں جماعت کے مثبت پہلو پر ہمیشہ ٹکی رہی اور اس میں وہ بہت کامیاب رہے۔ بڑی بات یہ کہ ہر حال میں مولانا بڑے مطمئن، بے ریا، بے تکلف، خوش اخلاق اور منکسر المزاج تھے۔بعض لوگ شیروانی ٹوپی اور ڈائس پر کچھ اور ہوتے ہیں خلوت میں کچھ اور، بلکہ ''چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند''۔ابھی تحریکی لوگوں میں یہ کمزوری نہیں پنپی ہے؛ یہ تب ہوگا جب ہم اپنے آپ کو، اپنی جماعت کو، اپنے لیڈروں کی تصویر کو گلوریفائی کرنے لگیں گے اور ذمہ داران جماعت بھی آہ سحر گاہی اور نفل روزوں سے غافل ہو جائیں

گے۔روزہ تن پروری سے بچانے اور من پروری میں لگانے کا تیر بہدف نسخہ ہے۔

یاد رہے جس کے نامہ اعمال میں کوئی ایسا عمل نہیں ہے جس کا گواہ صرف اللہ ہے تو شیطان اس کا بیڑا غرق کر کے رہے گا۔ وسواس الخناس کے پاس توحید سے ہٹانے کے لیے اور کیا حربہ ہے؟ بس یہی تین: پہلا احساس کبریائی، دوسرا جذبہ ٔریاکاری اور تیسرا خیال حسد کاری۔ اس کا توڑ بھی تین ہے یعنی احساس عبودیت سے پیدا ہونے والی عاجزی وانکساری، دوسرے اخلاص وللّٰہیت اور تیسرے نمبر پر سارے انسانوں کے لیے سچی خیر خواہی یہی توحید، رسالت اور آخرت کا نقد ثمر ہے۔ غور کیجئے تو کردار سازی میں توحید یعنی خدا شناسی کا شجر خود شناسی کا پھل دیتا ہے، عاجزی وانکساری اس پھل کے مزے کو کہتے ہیں آخرت پر ایمان کا پھل اخلاص ہے، اسی طرح رسالت پر ایمان کردار سازی کا قابل اعتماد ماڈل فراہم کرتا ہے حضرت محمد ﷺ رحمۃ للعالمین اور ناصح امین تھے۔ یہاں یہ بھی واضح رہے کہ امین تو پیغام رسالت کے پہلو سے ہے اصل تو وہ زمین والوں کے لیے خیر خواہی کا آسمانی ماڈل اور اسوہ ہیں۔ ہر شخص کو انہی تین نکتوں پر پرکھ کر دیکھنا چاہیے کہ اس نے توحید، رسالت اور آخرت کے شجر سے اخلاق کے کتنے میٹھے پھل اپنی جھولی میں سنبھال کر رکھے ہیں۔ مولانا سراج الحسن صاحب مرحوم کی جھولی اس پہلو سے بہت مالا مال تھی، ان کے عجز و نیاز، لینت ونرمی، خاکساری وفروتنی کی قسم کھائی جا سکتی ہے ؎

زمیں کی طرح جس نے عاجزی وخاکساری کی
خدا کی رحمتوں نے اس کو ڈھانپا آسماں بن کر

یہ خدا کی رحمت کا سایہ ہی تھا کہ اللہ نے ہندوستان کے جنوب کے ایک حلقے ریاست میسور اور کرناٹک میں امارت حلقہ کی حیثیت سے نوجوانی ہی میں ان کو خدمت کا موقع دیا چنانچہ انہوں نے کامل 26 برس، 1958 سے 1984 تک، اپنی جوانی کے ماہ وسال لگادیے۔ اخلاص للّٰہ کی کیفیت تو ان لوگوں سے دریافت کیجئے جو ان کی خلوت وجلوت سفر وحضر نرم گرم کے برسہا برس گواہ رہے ہیں سب نے یہی بات مجھ سے کہی کہ مولانا تہجد کا اہتمام ہر حال میں کرتے تھے حتیٰ کہ ٹرین میں بھی اپنے وقت پر بیدار ہوتے، غسل کرتے اور نماز میں کھڑے ہو جاتے۔ وہ

جو اقبال نے لکھا ہے۔

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آداب سحر خیزی

مولانا سراج الحسن مرحوم آداب سحر خیزی کے بڑے پابند اور اس معاملے میں چاق چوبند اور مستعد تھے۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ ہر کام بڑے اہتمام، اخلاص اور پوری توجہ سے کرتے تھے۔ ہر کام کے تین مدارج ہیں، آخری منزل احسان ہے، مرحوم اپنے ہر کام کو احسان کی منزل پر پہنچ کر انجام دیتے تھے۔

مولانا دردسر کے علاج کے طور پر کچھ کلمات پڑھ کر پھونکتے تھے۔ یہ کام جس محبت، تعلق، دلچسپی اور لگاؤ سے کرتے تھے، مریض کو آدھا فائدہ اسی سے ہو جاتا تھا۔ بہت سے لوگوں نے بتایا کہ مولانا کے اس جھاڑ پھونک سے فائدہ ہوا۔ مجھے بھی دو تین بار اس مرحلے سے گزرنا پڑا لیکن میرے گناہوں کی وجہ سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ مولانا بڑی بیتابی سے ہر بار پوچھتے کچھ کم ہوا۔ لیکن میں انکار کرتا جاتا۔ آخر کار از راہ مروت چپ رہ گیا اور حیدر آبادی انداز سے کچھ اس طرح سر ہلایا کہ ہاں نہیں دونوں مفہوم نکلتا ہے۔ پھونکتے ہوئے مولانا کا لطف وکرم قابل دید ہوتا، اصل میں اس کا ذکر اس لیے کیا کہ بڑے آدمی کی شناخت یہ ہے کہ اس سے ملنے کے بعد بڑائی کے سارے مصنوعی سانچے ٹوٹ جائیں اور ایک نیا فطری، اصلی فریم نگاہوں کے سامنے آجائے جس سے خود کو بھی بڑا بننے کا ذوق پیدا ہو۔ سراج الحسن صاحب اپنے ملنے جلنے والوں میں اپنی عاجزی وفروتنی کے ذریعے بڑا ہونے اور بننے کا احساس پیدا کر دیتے تھے۔

امیر جماعت کی ذمے داری سے پہلے مرکز جماعت میں وہ سکریٹری رہے اس وقت یعنی 1984 سے 1990 تک انہوں نے پورے ہندوستان کا بہت تفصیلی دورہ کیا اور جماعت کی یونٹوں اور وابستگان کا بھر پور جائزہ لیا۔ اس سے پہلے کسی مرکزی سکریٹری نے شاید اتنا بھر پور دورہ نہیں کیا تھا۔ پہلے پہل اسی دورے کے سلسلے میں رانچی میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ جائزے کے دورے میں مرکزی ذمہ داروں میں کبھی کبھی آفس بالا سے وابستگی کی جھلک اور خود

آرائشی پیدا ہوجاتی ہے لیکن میری ان سے یہ ملاقات انتہائی بے تکلفی کے ساتھ مشفقانہ فضا میں ہوئی جیسے دو پرانے شناسا بہت دنوں سے بچھڑنے کے بعد اطمینان سے مل رہے ہوں، سب باتیں تو یاد نہیں ہیں ہاں اتنا یاد ہے کہ رانچی سے رخصت کرنے کے لیے ہم لوگ بس اسٹینڈ گئے تھے اور وہاں دیر تک انتظار کرنا پڑا تھا، سراج الحسن صاحب مرحوم کبھی ہمارے کندھے کا سہارا لیے ہوئے اور کبھی اپنی بانہوں کو ہمارے گلے میں ڈال کر اپنا پن اور شفقت کا احساس دلاتے ہوئے رفقائے رانچی کا شکریہ اور اپنے تأثرات بیان کر رہے تھے، کسی مرکزی ذمے دار کے ساتھ یہ بے تکلفی اور رفاقت میں ایسی وارفتگی پہلی دفعہ میرے تجربے میں آئی تھی چناں چہ ان سے ملاقات کے بعد ایک خوشگوار احساس سے دوچار رہا۔

ان کا وہ ملک گیر دورہ بہت قیمتی تھا۔ بہت افسوس ہے کہ ان کے اس دورے کی تفصیلی رپورٹ مرتب ہوکر طبع نہ ہوسکی، انہوں نے جو کچھ مرکزی شوریٰ میں پیش کیا وہ بھی اب طاق نسیان ہوگیا، اس وقت ہندوستان کی تاریخ ایک نئی کروٹ لے رہی تھی، ایمرجنسی کے تجربے سے ملک گزر چکا تھا، ہندوتوا فورسیز سے وابستہ افراد اقتدار میں شریک ہوکر اس کا مزہ چکھ چکے تھے، ہندو فاشزم ایک نئے دور میں داخل ہو چکا تھا۔ تحریک اسلامی کی پہلی نسل ایک ایک کر کے اللہ کو پیاری ہورہی تھی، اور جو موجود تھے ان کے قویٰ مضمحل ہو رہے تھے۔

بہرحال مولانا سراج الحسن صاحب مرحوم تحریک اسلامی ہند کی دوسری نسل کے پہلے امیر تھے۔ ان کے بعد تقریباً 30 برس تحریک کی قیادت دوسری نسل کے سینئر لوگوں میں رہی۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً 57 برس تھی اور تاریخ نے جو کام ان کے سپرد کیا تھا انہوں نے اس کو بحسن وخوبی انجام دیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ تحریکی زندگی میں ہمہ وقتی خدمات انہوں نے اعزازی طور پر انجام دیں۔ شاید اس پہلو سے ان کا کوئی ثانی نہیں ہے جس نے پوری تحریکی زندگی ہمہ وقتی اور اعزازی خدمت انجام دی ہو۔ حالانکہ نرم گرم حالات سے وہ بھی گزرتے رہے۔ جب وہ مرکز میں سکریٹری مقرر ہوئے، اس وقت ان کی معیشت تنگ تھی اس لیے کہ کاشتکاری اور معاشی سرگرمیاں ان کا مرکز توجہ نہیں رہ سکی تھیں۔ صاحب جائیداد تھے اور قناعت بھی تھی لیکن تنگی ہونے لگی تو مولانا ابواللیث صاحب نے جماعت اسلامی کے ہمہ وقتی کارکنوں کے ضابطے

کے مطابق کفاف کی پیشکش کی لیکن انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کرلی کہ مولانا اب تک جس کھیت سے مالک کھلا رہا تھا آپ بزرگ ہیں دعا فرما دیجیے کہ اس میں اللہ برکت دے اور اسی سے ہمارے رزق کا انتظام کرتا رہے۔

جس وقت امارت کی ذمے داری ان کے سپرد کی گئی اس وقت جماعت اسلامی ہند کا سب سے بڑا داخلی چیلنج پاور پالٹکس یعنی الیکشن میں جماعت کا رول تھا۔ 1977 میں ایمرجنسی کے بعد جو الیکشن ہوا تھا اس میں اضطرار کی دلیل پر ارکان جماعت کو ووٹ دینے کی اجازت دی گئی تھی لیکن نظام باطل کو چلانے کے لیے جو انتخابات ہوتے ہیں اس میں امیدوار کو منتخب کرنے میں شرکت جائز ہے یا نہیں، اگر جائز ہے تو کب، کن شرائط کے ساتھ شریک ہونا جائز ہے اس مسئلے میں شدید اور بنیادی اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ بعض کے نزدیک صرف حالتِ اضطرار میں جائز تھا کچھ لوگوں کے نزدیک یہ حکمت عملی کا مسئلہ تھا، بعض اس کو عقیدے سے جوڑ رہے تھے۔ بہرحال تحریک میں اپنے قیام کے بعد پہلی دفعہ اس کی بنیادی حکمت عملی، موجودہ نظام کے ساتھ عملی رویہ اور جماعت کے مجموعی سمت سفر اور پالیسی کے بارے میں اتنا شدید اختلاف ابھر کر سامنے آیا تھا اور عمودی طور پر پوری جماعت دو حصوں میں منقسم لگ رہی تھی۔ ایمرجنسی کے بعد آل انڈیا سطح پر طلبہ کی دو تنظیمیں وجود میں آ چکی تھیں۔ تحریکی فکر کے اعتبار سے دونوں کا سر چشمہ ایک تھا لیکن تنظیمی ہیئت اور دستور کی بعض دفعات کے سلسلے میں پوری طرح اتفاق نہ ہو سکا جس کی وجہ سے بہت سارے قیمتی اور باصلاحیت نوجوانوں کے حسن شباب سے جماعت محروم رہ گئی اور جوش شباب میں وہ لوگ بھی ایک نیا ویرانہ آباد کرنے میں لگ گئے۔ طلبہ تنظیم کے لیے جو سہ نفری کمیٹی بنی تھی اس کے کنوینر بھی سراج الحسن صاحب ہی تھے، جناب شفیع مونس صاحب اور ٹی کے عبداللہ صاحب اس کمیٹی کے ممبر تھے۔ بہرحال سراج الحسن نے جماعت اسلامی ہند کو انتہائی نازک موقع پر ٹوٹنے سے صاف بچا لیا۔ یہ کام انہوں نے کیسے انجام دیا یہ گہرے مطالعے کا موضوع ہے لیکن ایک بات بہت واضح ہے کہ مرحوم کے اندر اعلی درجے کا حلم، بردباری، نیازمندی کے ساتھ انتہا درجے کی لینت، مشاورت اور دلنوازی تھی۔ اور جب امارت و قیادت میں یہ خوبیاں جمع ہو جائیں تو سمجھ جائیے کہ ایسا کارواں بہت خوش نصیب ہے۔ لاکھ حکیم سر بجیب

ایک کلیم سر بکف۔ میں اقبال کے اس شعر میں ایک حلیم سر بکف کہتا ہوں ابراہیم علیہ السلام کو اسمٰعیل علیہ السلام کی بشارت دی گئی اس کی صفت پر غور کیجئے:

ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی کہ رب ھب لی من الصالحین۔ بشارت دی گئی:فبشرناہ بغلام حلیم ۔حلیم جامع صفت ہے اس میں صبر وحکمت، تسلیم ورضا، شرافت ومتانت، اعلیٰ ظرفی اور استغنا سب شامل ہے۔اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس صفت سے متصف ہونے کے کیا معنی ہیں۔ پھر سراج الحسن صاحب کی زندگی کے واقعات سنئے تو آپ اعتراف کریں گے کہ واقعی آپ شریف النفس، معتدل مزاج، خلیق اور حلیم تھے۔اور اس خوبی میں بحیثیت مجموعی اپنے ہم عصر ذمہ داروں میں سب سے زیادہ نمایاں تھے۔ ابتدائی دور میں رائچور کی پوری ٹیم آپ کے ذاتی اعتماد پر جماعت اسلامی میں آگئی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ صفت ابتدا ہی سے پروان چڑھ رہی تھی۔

ایک واقعہ یاد آرہا ہے ووٹ پر چند شرائط کے ساتھ ارکان جماعت کے لیے پابندی ختم کرنے کے شوریٰ کے فیصلے کی تفہیم کے لیے دفتر حلقہ بہار پتھر کی مسجد تشریف لائے تھے۔ ارکان جماعت وذمے داران جماعت کی تفہیمی نشست تھی۔ارکان آپ کی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھے، ایک جذباتی اور منفی ماحول تھا، غصے اور جذبات میں ایک پڑھے لکھے پروفیسر رکن نے واپس جاؤ(Go Back) تک کہہ ڈالا۔سراج الحسن صاحب گویا کان بہرا کیے ہوئے بیٹھے رہے، پھر خود ہی امیر حلقہ کو تجویز دی کہ میں دفتر حلقہ کی قیام گاہ میں ذرا آرام کر لیتا ہوں آپ لوگ مشورہ کر کے جو فیصلہ کریں مجھے بتا دیجئے تاکہ اس پر عمل کرسکوں، ساتھ ہی ساتھ یقین دلانے کی کوشش کی کہ جذبات میں جو باتیں آپ لوگوں کی طرف سے آئی ہیں ان کا کوئی برا میں نے نہیں لیا ہے، میری طرف سے آپ حضرات بالکل بے فکر اور مطمئن رہیں، اجتماعی زندگی میں نرم گرم باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ پھر اوپر کمرے میں جاکر اطمینان سے سو گئے۔ بعد میں امیر حلقہ نے جاکر بیدار کیا اور پھر پروگرام اطمینان اور ڈسپلن کے ساتھ آپ کے حلیمانہ اور کریمانہ رویے کی وجہ سے انجام پذیر ہوا، ورنہ آپ مرکزی سکریٹری کی حیثیت سے دورے پر گئے تھے، گستاخی اور نظم وضبط کی خلاف ورزی کرنے والوں کو دستور جماعت میں اخراج کی دفعہ

پڑھ کر سنا سکتے تھے۔

سراج الحسن صاحب نے اپنے پورے دور امارت میں بحیثیت امیر جماعت دستور، ضابطہ اور قانونی بنیاد پر تحریک نہیں چلائی، اس کام کے لیے انہوں نے قیم جماعت جناب محمد جعفر صاحب کا تقرر بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا اور جناب شفیع مونس صاحب کو نائب امیر کی حیثیت سے تنظیمی فیصلے اور قانون وضوابط کی پابندی کی نگرانی کا کام سپرد کر دیا تھا۔اور خود سارا تحریکی کام جذبہ دل کی حرارت، نگاہوں کی مروت اور احساس رفاقت کی لطافت سے انجام دیتے رہے۔کاموں کی اس طرح تقسیم کی اور اس کے لیے ایسے افراد کا انتخاب کیا کہ تحریک اور نظم، دل اور دماغ، عملی اور احوالی حالات و معاملات سب کے تقاضے بحسن وخوبی انجام پاتے رہیں۔ چنانچہ فیصلوں کے نفاذ میں وہ نائب امیر جماعت شفیع مونس صاحب مرحوم اور قیم جماعت محمد جعفر صاحب پر بھر پور اعتماد کرتے تھے۔ان کے بعد ڈاکٹر عبدالحق انصاری صاحب مرحوم اس روایت اور آداب کو نیک نیتی کے ساتھ ملحوظ خاطر نہیں رکھ سکے، جس کے نتائج بعد میں سامنے آئے۔اصل میں سراج الحسن صاحب کو اللہ نے ایک بڑی نعمت عطا کی تھی، وہ اپنی کمزوری سمجھتے ہی نہیں اعتراف بھی کرتے تھے، ان کو اپنی ذات کا پورا عرفان تھا وہ کبھی بر خود غلط نہیں ہوئے، وہ اپنی حدود کو ٹھیک ٹھیک سمجھتے تھے، ان کا علم کتابی نہیں سب تجرباتی اور وجدانی تھا۔ان کے پاس وہ علم نہیں تھا جو عہد غلامی میں قوموں کا علمی مذاق پست ہو جانے کی وجہ سے آقا کی سند پر تسلیم کیا جاتا ہے، سرٹیفیکٹ کے پہلو سے تو وہ میٹرک پاس بھی نہیں تھے۔ بہر حال سند ایک چیز ہے اور علم ومعرفت کی جو روشن لکیر ہے اس کی سمجھ دوسری چیز ہے۔سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اپنا اور ساتھ کام کرنے والوں کی خوبیوں اور خامیوں کا پورا استحضار رکھتے تھے جس کا کبھی کبھی معصومانہ اظہار بھی کر دیتے تھے۔چناں چہ مشاورت ان کے اجتماعی فیصلوں کی اصل بنیاد تھی۔انہوں نے مرکز میں شوری کو دستور جماعت کے تقاضے کے طور پر انجام نہیں دیا بلکہ اجتماعی امانت، تکریم بنی آدم، فیصلے کی ذمہ داری اور عنداللہ اس کی جوابدہی کی سطح پر برتا۔یہ معمولی بات نہیں ہے، بقدر پیمانہ تخیل ہر دل میں ایک سرور خودی ہوتا ہے جو بیمار ہونے کی صورت میں خود رائی، خود پسندی اور خدا جانے کیسی کیسی کیفیت میں ڈھلتا بنتا سنورتا اور بگڑتا

رہتا ہے؛ جس میں مبتلا ہو کر انسان اجتماعی فیصلے میں بے احتیاطی کرتا ہے اور بعض دفعہ دستور کی دفعات اور اختیارات کا سہارا لے کر اپنی پسند کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ سراج الحسن صاحب مرحوم نے ہمیشہ اجتماعی فیصلے میں اپنے دستوری اختیارات اور تقررات کو بھی شورائیت کا پابند رکھا، اپنی رائے کو بھی فقط ایک رائے کی حیثیت دے کر اکثریت کی رائے کے مطابق اپنی رائے کے خلاف فیصلہ کیا۔ اجتماعی زندگی میں یہ ظرف اور عجز آسان نہیں ہے۔ ان کے بعد مرکز میں ذمے داروں کے تقررات میں مشاورت بطور ثواب بھی دیکھا ہے۔ سراج الحسن صاحب نے اپنی اسی خوبی کی وجہ سے ووٹ کے فیصلے میں شوری پر عمل کیا لیکن تحریک کی عام فضا میں اپنی شخصیت کا وزن کسی ایک رائے کی طرف اس طرح نہیں ڈالا کہ ان سے مختلف رائے رکھنے والوں میں کوئی نفسیاتی فاصلہ اپنے امیر جماعت سے محسوس ہو۔ وہ اختلاف رائے سے بلند تمام متوسلین تحریک کے لیے یکساں بازوئے محبت کو پھیلا کر رکھنے والے تھے، جو بہت مشکل کام ہے۔ ہم خیالی کی قربت کا احساس بڑا فطری ہے لیکن بے خیالی میں اختلاف رائے رکھنے والوں سے دوری کا سبب بھی بن جاتا ہے۔ اکثر وہ اپنی تقریر میں یہ شعر پڑھتے تھے۔

دھیرے دھیرے آئے گا ان کو خیال

دھیرے دھیرے بے خیالی جائے گی

سراج الحسن صاحب تقریر بھی دل پذیر کرتے تھے۔ امارت کے بعد انہوں نے ہندی زبان بھی سیکھی اور پھر پریم چند کی ہندی میں تقریر کیا کرتے تھے۔ ان کی تقریر تفہیمی انداز، تذکیری اسلوب، تجرباتی اور تاریخی مواد سے بھرپور ہوتی تھی۔ ان کے خطابات میں تاریخی شعور اور ادبی ذوق نمایاں طور پر جھلکتا تھا۔ الفاظ اور جملے میں ایک سجاوٹ، تراش خراش اور ہم آہنگی ہوتی تھی۔ مترادفات کا استعمال بھی کرتے تھے۔ عبدالعزیز صاحب مرحوم والی گھن گھرج اور آواز کا بہت اتار چڑھاؤ نہیں تھا؛ عبدالقیوم بھائی اور محمود خان صاحب بھی کامیاب عوامی خطیب تھے۔ لیکن سراج الحسن صاحب کے خطابات میں بعض باتیں، کچھ نکتے، چند جملے یاد رہ جانے والے بھی ہوتے تھے جن کو وہ خاص زور دے کر ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتے تھے۔ تقریر کے بعد بڑی معصومیت سے ہم جیسے معمولی اور جونیئر ساتھیوں سے پوچھتے کہ گفتگو ٹھیک

تھی نا؟ اس میں کمزوری کا دخل نہ تھا جو پیشہ ور مقرر میں ہوتی ہے بلکہ ایک سادگی اور بھولا پن تھا۔ بھولے پن پر مجھے یاد آیا کہ میں نے عالم اور عارف دونوں کا بھولا پن دیکھا تھا۔ البتہ عاشق کا بھولا پن صرف سنا تھا، کبھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ مولانا سراج الحسن صاحب مرحوم کو تحریکی، تنظیمی، سماجی، انسانی اور خدا کے ساتھ رشتوں کو برتتے دیکھا تو اندازہ ہوا کہ عاشق کا بھولا پن یہی ہے، جس کا اقبال نے ذکر کیا ہے کہ ؎

تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

اس شعر میں ''سادگی'' بھولا پن ہی کا دوسرا نام ہے۔ جب انسان خدا کے ساتھ اور تمام انسانی رشتوں میں تعلق کی انتہا کو پہنچ کر جینا چاہتا ہے تو اس سے جو ادا پنپتی ہے اس میں ایک معصومیت، سادگی اور بھولا پن ہوتا ہے۔ یہ بات سراج الحسن صاحب مرحوم میں موجود تھی۔ اسی لیے ان کی بعض اداؤں پر ''دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے'' کا گمان ہوتا تھا اور بعض باتیں غیر ضروری لگتی تھیں۔

یہ سچ ہے کہ مرحوم نے اپنے پورے دور امارت میں اپنے کو سبھوں کے لیے یکساں دستیاب اور قابل حصول رکھا اور حفظِ مراتب کا خیال بھی۔ مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب مرحوم سے تو وہ اس طرح ملتے تھے کہ ان کا سر ان کے سینے پر جھکا ہوتا تھا۔ میں نے اس انداز سے ملتے ہوئے خود دیکھا ہے۔ ٹی کے عبداللہ صاحب کی ذہانت، علمی صلاحیت، اور استدلال کی قوت کے قائل تھے، بڑی قدر کرتے تھے، ووٹ کے سلسلے میں ان کی رائے سے اتفاق بھی کرتے تھے۔ اسی طرح شفیع مونس صاحب کی رائے اور فیصلے کا احترام کرتے تھے، ووٹ دینے کے فیصلے کے زبردست حمایتی ارکان اور ذمہ داران مونس صاحب سے شکوہ سنج ہو جاتے کہ ضابطے کے نام پر وہ فیصلے پر عمل درآمد کی راہیں تنگ کرتے ہیں لیکن سراج الحسن صاحب دونوں رجحان اور اس کے جذباتی ہم نواؤں کو اپنے اعتماد میں لینے کا سلیقہ جانتے تھے۔ تحریک اسلامی میں امیر جماعت کی آخری حیثیت ہوتی ہے منصب کی اس نزاکت کی وجہ سے اس کی ذاتی شخصیت اور نجی رویہ بھی بہت اہمیت رکھتا ہے اس بات کو سمجھنے کے لیے مولانا امین احسن اصلاحی

کے خط کے اس جملے کو بغور پڑھئے جو انہوں نے رکنیت سے استعفاء دیتے ہوئے مولانا مودودی کو لکھا تھا کہ بدقسمتی سے اب آپ پر بھی اعتماد باقی نہیں رہا۔ قیادت کا رویہ قابل اعتماد رہنا اور اس کے لیے خصوصی اہتمام کرنا کہ ارکان کے اعتماد کو ٹھیس نہ لگے بڑے دل گردے کی بات ہے۔ ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندا۔

سراج الحسن صاحب کو اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، درجات کو بلند کرے، انہوں نے اس دھواں دھواں اور گرد آلود ماحول میں کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جس سے رایوں کے اختلاف یا اس سے پیدا ہونے والی کمزوریوں کی وجہ سے کسی کے اعتماد کو ٹھیس لگے۔ انہوں نے تحریکی احباب اور عام ارکان جماعت کو ان کی کمزوریوں کے ساتھ گلے لگائے رکھا۔ اسی کو شفقت پدری کہتے ہیں اور اسی سے وہ ادا جنم لے سکتی ہے جس کو قرآن نے واخفض جناحك سے تعبیر کیا ہے۔ کیا کہا جائے اس معاملے میں مرحوم یکتائے روزگار تھے۔

دوسرا کام انہوں نے یہ کیا کہ آل انڈیا دورے کے نتیجے میں جو ذرہ جہاں نظر آیا اس کو آفتاب و ماہتاب بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ اس طرح اپنے امیر کی طرف سے قدردانی کی فضا نے پورے ہندوستان میں ابھرتے ہوئے نوجوانوں میں آگے بڑھ کر ذمہ داریاں انجام دینے کا حوصلہ پیدا کیا اور دیکھتے دیکھتے حلقہ اور مرکز میں ذمہ داروں کی ایک کہکشاں سجا ڈالی۔ آپ جماعت اسلامی ہند کے اجلاس شوریٰ کی روداد پڑھ جایئے، شروع سے لے کر 1990 تک شرکاء میں بس ارکان شوریٰ کا نام ملے گا لیکن نومبر 1990 کی شوریٰ سے پیٹرن بدل جاتا ہے اور مدعوئین خصوصی کی ایک اچھی تعداد شریک اجلاس ہوتی ہے، اسی میں جناب احمد علی اختر صاحب بہار، جناب کے صدیق حسن صاحب کیرالہ، جناب اقبال ملا صاحب، حکیم مظفر حسین صاحب، جناب عبدالقدوس لطیفی صاحب، جناب عبد الغفور صاحب، جناب عبدالرقیب صاحب اور ڈاکٹر رئیس الدین صاحب۔ اسی طرح وقفے وقفے سے مختلف علاقائی شخصیتوں کو اجلاس شوریٰ میں مدعو کرتے، مجھے یاد نہیں غالباً 1994 سے مرکزی مجلس شوریٰ کا رکن ہوں لیکن اس سے پہلے سراج الحسن صاحب کی پہلی میقات میں کئی دفعہ مدعو خصوصی کی حیثیت سے شریک اجلاس رہا ہوں۔

ان کی امارت سے پہلے قائم مقام امیر جماعت کی حیثیت سے زیادہ تر مولانا سید عروج قادری صاحب ذمہ داری سنبھالتے تھے، نائب امیر جماعت کی گنجائش دستور میں نہیں تھی۔ بعد میں دستور میں ترمیم کی گئی اور سراج الحسن صاحب نے تین نائب امراء کا تقرر کرکے تنظیم کو استحکام بخشا۔ تنظیم اور شورائیت کی سطح پر نئے اقدام کے ساتھ انہوں نے شعبہ دعوت کو نئی آب وتاب دے کر متحرک کیا اور مرکز میں شعبہ جاتی نظام میں دعوت کو ایک نمایاں کام کے طور پر انجام دیا جانے لگا۔ مجھے یاد ہے، آدی باسیوں میں دعوتی کام کی آل انڈیا ذمہ داری انہوں نے مجھ پر ڈال دی۔ حالاں کہ میں رانچی میں قیام پذیر تھا۔ ان ہی دنوں میں نے گجرات، راجستھان، مہاراشٹر اور مختلف ریاستوں کے آدی باسی حلقوں کا دورہ کیا تھا اور اس کی رپورٹ پیش کی تھی۔ بعد میں میری تجویز پر آدی باسیوں میں کام کا شعبہ شعبۂ دعوت میں ضم کردیا گیا اور میں نے سبکدوشی حاصل کرلی۔

فرد ہو یا جماعت، فکر، عمل اور جذبہ تین بنیادی جہتیں ہیں۔ سراج الحسن صاحب نے جماعت اسلامی ہند کو عمل اور جذبے کی جہت سے سرگرم عمل اور تازہ رکھنے کی بھرپور کوشش کی اور اس میں وہ کامیاب بھی رہے۔ دعوت کو انہوں نے بنیادی ہدف بنایا۔ ان ہی کے دور میں دھارمک جن مورچہ اور MPJ جیسے فورم بنے؛ بابری مسجد کے انہدام پر جماعت اسلامی پر پابندی لگی؛ وہ ذاتی طور پر قطر کے دورے میں ایکسیڈنٹ کے شکار ہوئے، پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی؛ لیکن بڑی ہمت، حوصلے اور جذبے کے ساتھ تحریکی کارکنوں کو ہم قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھایا۔ نئے فکری چیلنجز پر مرکزی اسٹڈی گروپ تشکیل دیا۔ اس کے اجلاس بھی ہوئے۔ طویل المیعاد منصوبہ بنانے کی کاوش اور پہل بھی اس وقت ہوئی لیکن اس سطح پر کوئی قابل ذکر پیش رفت نہ ہوسکی۔ اسی دور میں مرکز کے مشورے سے ڈاکٹر عبدالحق انصاری صاحب مرحوم کے ذریعے علی گڑھ میں CRSG کا بھی قیام عمل میں آیا۔ چنانچہ تیسری میقات تک حالات کی نئی تبدیلیوں سے نظریاتی سطح پر جو سوالات ابھر رہے تھے، ان میں احساس تشنگی بڑھنے لگا۔ مولانا سراج الحسن صاحب مرحوم پر لقوے کا اثر ہوچکا تھا۔ اس کے بعد وہ اندر سے کمزور پڑنے لگے۔ حساس آدمی تھے اور تأثرات بھی قبول کرتے تھے۔ چنانچہ پیرالیسس اٹیک نے بہرحال ان پر خاص اثر

ڈالا۔ چناں چہ انہوں نے ایک دفعہ چاہا کہ امارت کی تبدیلی کا وہی تجربہ کریں جو مولانا ابواللیث صاحب مرحوم نے ان کے ساتھ کیا تھا۔ انہوں نے چھ ماہ کی تعطیل پر ایک جواں سال امیر حلقہ کو قائم مقام امیر جماعت کی حیثیت سے مرکز بلانے کی تجویز شوریٰ میں رکھی، لیکن بات اتفاق رائے تک نہ پہنچ سکی۔ وہ چاہتے تھے کہ تحریک اب عوامی بنے، علمی مباحث کی دلدل میں نہ پھنس جائے۔ انہوں نے دعوتی اور عوامی سطح پر جو سرگرمی پیدا کی تھی، وہ آگے بڑھے؛ غیر مسلموں سے عمومی روابط بھی مضبوط ہوں؛ ملکی سطح پر جماعت کی تصویر ایک عوامی تحریک کی ہو، جس میں ہر سطح کے لوگ شریک ہوں لہٰذا ان کے بعد ایسا امیر ہو جو متحرک، فعال، سیاسی رابطے، سماجی تعلق اور عوامی رشتے کو سرسبز وشاداب رکھنے والا ہو؛ تنظیمیت کم ہو عوامی پن زیادہ آئے۔ لیکن جماعت اسلامی ایک نظریاتی اور فکری تحریک ہے۔ اس کا تنظیمی ڈھانچہ بھی عوامی نہیں ہے، اس لیے داخلی تقاضے کچھ اور مطالبہ کرر ہے تھے۔ جماعت اسلامی شخصیت کے بل پر نہیں چلائی جاسکتی ہے یہ تو ایک نظام فکر پر یا نظم کے اصول پر ہی چل سکتی ہے۔ چنانچہ آپ کے بعد ڈاکٹر عبدالحق انصاری صاحب اور ان کے بعد مولانا جلال الدین عمری صاحب کو ان کی علمی شخصیت اور ان پر عام اعتماد کی وجہ سے امیر جماعت منتخب کیا گیا۔ یہ الگ سوال ہے کہ سراج الحسن صاحب کے دور میں علمی وفکری محاذ پر جو تشنگی پیدا ہوئی تھی اس کی کتنی تلافی بعد میں یہ دونوں کر سکے، یہ گہرے جائزے کا موضوع ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ سراج الحسن صاحب نے تحریک اسلامی کو عملی سطح پر متحرک اور جذبے کی سطح پر توانا رکھا اور اہل علم کو آگے بڑھانے کی بھرپور کوشش کی۔ تاکہ علم وفکر کا محاذ بھی کمزور نہ ہونے پائے۔

مامور نامہ

(امیر جماعت اسلامی ہند، مولانا سراج الحسن صاحبؒ سے ایک کارکن نے کیا سیکھا)

سید تنویر احمد، سکریٹری جماعت اسلامی ہند

1995 عیسوی کی بات ہے۔ مولانا محمد سراج الحسن صاحب، امیر جماعت اسلامی ہند تھے۔ اس دوران محترم ایس امین الحسن، موجودہ نائب امیر جماعت اسلامی ہند، طلبہ تنظیم اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن آف انڈیا (ایس آئی او) کے کل ہند صدر ہوا کرتے تھے۔ ان دنوں اللہ نے مجھے موصوف کے سکریٹری کی حیثیت سے خدمت انجام دینے کا موقع عطا کیا تھا۔ اسی سال میرا نکاح ہوا تھا۔ نکاح کے چند ماہ بعد مولانا محترم سے مرکز جماعت اسلامی ہند میں ملاقات ہوئی۔ مولانا عشاء بعد پابندی سے بی بی سی کی اردو اور ہندی سروس سنا کرتے تھے۔ میں نے ایک دفعہ مولانا سے ان کی ہندی میں بلاغت کا راز پوچھا تھا تو آپ نے کہا تھا کہ "میں ایک عرصہ دراز سے بی بی سی کی ہندی سروس پابندی سے سنتا ہوں"۔ خبروں کی نشریات کے وقت مولانا کے حجرے میں کسی کو داخل ہونے کی اجازت کم ہی ملتی تھی لیکن یہ شرف مجھے حاصل تھا کہ میں ان اوقات میں بھی مولانا سے ملاقات کرلیا کرتا تھا۔ اس شرف کا حصول اس طرح ہوا کہ ایک دفعہ میں مولانا کے کہنے پر کچھ خرید کر ان کے حوالے کرنے اس وقت پہنچا تھا جو کہ عموماً ممنوع تھا۔ اس دن مولانا نے مجھے کمرے میں داخلے کی اجازت دی تھی اس پر مجھے خوشی ہوئی۔ مولانا نے کہا کہ میں بیٹھ جاؤں، نشریات کے اختتام پر بات کریں گے۔ میں نے موقعے کو غنیمت جان کر مولانا کے پیر دبانا شروع کیے۔ مولانا نے منع کیا، میں نے اصرار کیا۔ ویسے مولانا کے ایک خادم بھی اس خدمت کو انجام دیتے تھے، لیکن یہ سعادت مجھے بھی حاصل ہوتی رہی۔ مولانا اس طرح کی خدمت برسرِ عام بہت کم قبول کرتے تھے۔

جماعت اسلامی سے وابستہ علما و معززین کی شخصیت میں ہم نے دیگر علما و معززین کے مقابل میں یہ واضح فرق دیکھا ہے۔خدمت کے متمنی علما پر ایک نجی مجلس میں مولانا سجاد نعمانی نے بڑا سخت کہا تھا ''آج کے ہمارے اکثر علما کا مشغلہ مطالعہ نہیں، خدمت کروالینا ہوتا ہے''۔مولانا محمد محمود خاں صاحب، جماعت اسلامی ہند کرناٹک کے امیر حلقہ تھے۔مجھے یاد ہے کہ میں نے ان کا درسِ قرآن پہلی بار بعد نمازِ فجر، مسجد شاہ خاموشی بیدر میں سنا تھا۔غالباً 1981 کی بات ہے مولانا نے سورہ بقرہ کی آیات کا درس دیتے ہوئے یہودی علما کی بے راہ روی کا تذکرہ کیا تھا۔انہوں نے اس وقت وہی بات کہی تھی جواب مولانا سجاد نعمانی صاحب نے کہی تھی۔فرق یہ ہے کہ مولانا محمد محمود خاں صاحب یہودی علما کی پستی کا ذکر کر رہے تھے۔ایک نے ماضی بیان کیا تو دوسرے نے حال کی تصویر کشی کی۔

بات ہو رہی تھی میری شادی کے بعد مولانا محمد سراج الحسن صاحب سے ملاقات کی۔مولانا نے حسب معمول عشاء کے بعد آنے کو کہا۔میں پوری چاہت کے ساتھ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔مولانا بی بی سی پر خبریں سن رہے تھے، میں خاموش بیٹھا رہا۔نشریات کے اختتام کے بعد گفتگو کا آغاز ہوا۔مولانا نے میری شادی کی تفصیلی روداد سنی، درمیان میں بعض دیگر امور پر بھی بات ہوتی رہی۔مولانا نے گفتگو کے دوران یہ احساس ہونے نہیں دیا کہ وہ مجھ سے تفتیش کر رہے ہیں، اس کا احساس تو مجھے بعد میں ہوا تھا۔بغیر کسی منفی احساس کے میں اپنے ہیڈ کوارٹر، دفتر ایس آئی او پہنچا۔رات گذری بات گذری، لیکن در اصل بات نہیں گذری تھی۔دوسرے دن ظہر کی نماز کے بعد مولانا نے کہا کہ میں آج بھی عشاء کے بعد ان کی خدمت میں حاضری دوں۔عشاء کے بعد مولانا کے کمرے میں پہنچا۔مولانا نے جب گفتگو کا آغاز کیا تو احساس ہونے لگا کہ وہ بات گذری نہیں ہے، بلکہ جاری ہے۔آپ نے نہایت ہی عمدہ الفاظ اور پیرائے میں کہا کہ ''اسلامی جدو جہد میں جو مصروف رہتے ہیں، ان پر افراد کی گہری نگاہیں ہوتی ہیں ۔یہ دراصل اللہ کی ان پر رحمت ہوتی ہے''۔مولانا مودودیؒ کا وہ فقرہ دہرایا کہ ''لوگ ہمیں مانجھتے ہیں''۔پھر آپ نے شفقت بھرے لہجے میں کہا کہ ''تنویر میاں، آپ کی شادی کے حوالے سے آپ کے اور آپ کے دوستوں کے درمیان شیطان حائل ہوا

تھا، کچھ غلط فہمیاں پھیلا رہا تھا۔اجتماعیت میں شیطان کا یہ بڑا حربہ ہوتا ہے کہ وہ رفقا کے درمیان دوری پیدا کرتا ہے،غلط فہمیاں پیدا کرتا ہے،الفت اور محبت کو کم کرتا ہے،اس سے باہمی تعلقات متاثر ہوتے ہیں اور اجتماعیت کمزور ہوتی ہے۔میں نے مولانا سے دریافت کیا کہ ''مولانا کس نے شکایت کی ہے اور شکایت کیا ہے''۔مولانا نے نہ تو معترض کا نام بتایا اور نہ ہی اس امر کا اظہار کیا جس پر اعتراض کیا گیا تھا۔

چند ماہ بعد ایک دوسرے ذمہ دار کی کم حکیمانہ انداز سے اس فرد کا نام اور مضمون دونوں نا چاہتے ہوئے بھی معلوم ہو گئے (اگر وہ بھی اس مضمون کو پڑھ رہے ہیں تو میں ان سے معذرت چاہتا ہوں)۔ان سطور کو تحریر کرنے سے پہلے میں نے میرے اس بہی خواہ کا نام ظاہر کرنے کی اجازت چاہی جنہوں نے ذمے داران کو خطوط تحریر کیے تھے، انہوں نے بلا تعمل اجازت دی،اس لیے کہ ان کا مقصد منفی نہیں، مثبت تھا۔ہمارے یہ دوست اس زمانے میں ایس آئی او کے ممبر تھے۔جناب یوسف عبدالرحیم اب رکن جماعت اور ساتھ ہی صحافی ،ادیب اور شاعر ہیں۔میرے ایک اور دوست نے لکھا تھا،رکنِ جماعت ہونا ہی بڑا تعارف ہے۔یوسف عبد الرحیم ،یوسف بیدری بھی ہیں۔ان کا میرے متعلق جماعت کے ذمے داران کو خط لکھنا،یوسف صاحب کی بے باکی اور دوست کی اصلاح کے جذبے کا ایک مظہر تھا،تو مولانا سراج الحسن صاحب کا رویہ ایک مثالی قائد کا تھا،لیکن انہوں نے یوسف بھائی کا نام ظاہر نہیں کیا تھا۔

مولانا کے اس رویے کے مظاہر آج مختلف سطحوں کے ذمہ داران کا انداز جدا جدا ہوتا ہے۔اکثر معاملات میں میں نے دیکھا کہ جو فرد شکایات کرتا ہے اس کی شکایت کو حق تسلیم کر لیا جاتا ہے اور جس کے متعلق شکایت کی جاتی ہے اسے قصوروار مان لیا جاتا ہے۔شکایت کرنے والے سے الزام کے دلائل حاصل کرنے کے بجائے، جس کے متعلق شکایت کی گئی ہے اس سے اس کی معصومیت کے دلائل پوچھے جاتے ہیں، یہ غیر اسلامی ہے۔ہاں البتہ ہمارے پولس تھانوں کا اصول ہے،اس کا تعلق معاملہ فہمی سے بھی ہے۔مولانا کے اس رویے کو میں نے سورہ یوسف میں حضرت یوسفؑ کے رویے کی روشنی میں پایا۔یوسفؑ جب مصر میں اپنے بھائیوں سے تقریباً 40 سال بعد ملتے ہیں،تو ان کے بھائی نادم ہو جاتے ہیں،لیکن یوسفؑ اپنے بھائیوں

کو ان کا جرم یاد دلانے کے بجائے صرف اتنا کہہ دیتے ہیں کہ ''میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان شیطان نے فساد ڈال دیا تھا''۔شیطان کے حملے کو اکثر ہم افراد سے جوڑ دیتے ہیں۔ تحریکات اسلامی میں شیطان کا حملہ باہمی تعلقات کو بگاڑنے اور بنیان مرصوص میں رخنہ ڈالنے کے لیے ہوتا ہے، اس کا ادراک قائدین اور کارکنان دونوں کو ہونا چاہیے۔میں نے مولانا کے اس رویے سے بہت سیکھا ہے، اسے نمونہ بنایا۔جماعتی زندگی ہو کہ معاشی تگ و دو کا میدان، اس رویے کو اپنانے سے مثبت نتائج حاصل ہوئے ہیں۔

مجھ پر اللہ کے انعامات میں سے ایک انعام یہ ہے کہ رحمٰن ورحیم نے مجھے چار سال مولانا سراج الحسن صاحب کی امارت میں جماعت اسلامی ہند کی طلبہ تنظیم ایس آئی او کے نیشنل سکریٹری کی حیثیت سے خدمت کرنے کی توفیق عطا کی۔اس دوران مولانا سے کافی قربت ہوئی۔قربت کی وجوہات میں سے، دو اہم وجوہات یہ بھی تھیں۔اول میرا تعلق کرناٹک کے شہر بیدر سے تھا، جو رائچور سے قریب قدیم نظامی سلطنت کا ایک اہم مقام ہے۔اپنے علاقے اور مقام کی کشش اور لگاؤ ایک فطری چیز ہے۔اسلامی کلچر میں وطن سے محبت کی اعتدال کے ساتھ اجازت ہے۔مکہؓ سے اللہ کے رسولؐ کا لگاؤ ثابت ہے، لیکن اسلام اس محبت کو بت بنانے اور نیشنلزم میں تبدیل کرنے کی سختی سے مخالفت کرتا ہے۔دوسری وجہ ہم نے یہ تصور کی تھی کہ مولانا کے ایک اہم رفیق اور شاگرد جناب محمد فہیم الدین صاحب کے ہم شاگرد تھے۔مولانا جب بھی بیدر تشریف لاتے مولوی فہیم الدین صاحب کے گھر قیام فرماتے تھے۔فہیم الدین صاحب سابق رکن شوریٰ جماعت اسلامی ہند کرناٹک، بیدر میں ایک عرصہ دراز تک جماعت اسلامی کا چہرہ تھے، مولانا فہیم صاحب کو بہت محبوب رکھتے تھے۔دکن کے کلچر میں اگر بزرگ حضرات کسی سے محبت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، تو ان کے نام کے ساتھ ''میاں'' لگاتے ہیں۔مولانا کو ہم نے کئی بار ''فہیم میاں'' کہتے سنا تھا۔فہیم صاحب ہمارے استاذ ہیں۔مولانا سے ہمارے استاذ کی محبت ہمیں بھی بھلی لگتی تھی، بلکہ فخر بھی ہوتا تھا۔جب بھی میں بیدر سے دہلی جاتا تھا اور مولانا کا دہلی میں قیام رہتا تھا تو میں اول وقت مولانا سے ملاقات کر لیتا تھا۔مولانا بیدر کے چند رفقا کے بارے میں ضرور دریافت فرماتے تھے، ان میں سے سب سے پہلے جناب محمد فہیم الدین

صاحب کا ذکر ہوتا تھا۔فہیم الدین صاحب کو ہم مولوی صاحب (بلکہ مولی صاحب) کہتے تھے اور کہتے ہیں ۔آپ ہی کے ذریعہ ہمیں ایس آئی او اور جماعت اسلامی سے تعارف ہوا تھا۔تحریک کے لیے مولوی صاحب کی لگن کا تذکرہ مولانا فرماتے تھے ۔مولوی صاحب کے علاوہ جن حضرات کے تعلق سے مولانا معلومات حاصل کرتے تھے، ان میں جناب محمد عنایت خاں صاحب (ڈپٹی تحصیل دار) جناب محمد شوکت علی صاحب اور جناب شاہ صدیق محی الدین قادری صاحب (المعروف بی۔ڈی۔اوصاحب) تھے۔ان حضرات کے نام مولانا ہمیں خطوط بھی دیا کرتے تھے ۔اس لحاظ سے ہم مولانا کے قاصد کی خدمات بھی انجام دے چکے ہیں اور ان حضرات کے خطوط مولانا کے نام ہوتے تھے ،جنہیں ہم بیدر سے لے جایا کرتے تھے ۔ان میں سے میں نے زیادہ خطوط جناب شاہ صدیق محی الدین قادری صاحب کے بیدر سے مولانا کی خدمت میں پیش کئے تھے ۔وہ زمانہ ڈیجیٹل شہریت کا نہیں تھا،تحریر شدہ خطوط ہی کمیونی کیشن کا اہم ذریعہ تھے ۔مولانا ایک متعین وقت خطوط لکھا کرتے تھے ۔مختصر پیغام کے لیے پوسٹ کارڈ،مختصرطویل کے لیےان لینڈ لیٹر اورطویل کے لیے لفافہ۔اس دور میں جماعت کے ذمے دار بیت المال کا اتنا خیال رکھتے تھے کہ جوتحریر پوسٹ کارڈ میں سما سکتی تھی اسکے لیے نہ توان لینڈ لیٹر کا استعمال ہوتا تھا اور نہ ہی لفافے کا۔ویسے لفافے کا استعمال بہت محتاط سے کیا جاتا تھا، اس لیے کہ اس کی قیمت ان دنوں زیادہ تصور کی جاتی تھی ۔ بیت المال کے حوالے سے یہ ذمہ دارانہ روش جماعت اسلامی کے قائدین کا خاصہ ہے ۔خلافت کا کام ختم ہوتے ہی بیت المال کے پیسوں سے جلنے والے چراغ کا گل کردینے کی عظیم سنت عمرؓ کی جھلکیاں آج بھی موجود ہیں۔

زمان ومکان کی تبدیلی سے اس کی کیفیت میں تبدیلی تو ہوئی ہے لیکن اسپرٹ (روح) کی لوکو تحریک اسلامی نے جلائے رکھا ہے ۔پوسٹ کارڈ اور لفافے کے ذکر سے تحریک اسلامی کے ایک اور قائد کا عمل یاد آ گیا۔مولانا محمد محمود خاں صاحب، جب امیر حلقہ کرناٹک تھے ان کا ایک دلچسپ معمول تھا،صبح 10 بجے کے قریب پوسٹ مین ڈاک دفتر حلقہ میں ڈال دیتا تھا،ڈاک میں پوسٹ کارڈ اور لفافے بھی ہوتے تھے ۔مولانا لفافوں کو ایک پتلی چھری (چاقو) سے، جو اسی کام کے لیے نے بنائی تھی ، بڑے سلیقے سے کھولتے تھے ۔لفافوں کو کھولنے کے بعد انہیں الٹا

کر دیتے تھے اور دوبارہ اسے کارآمد لفافہ بنا دیتے تھے، پھر ان لفافوں کو استعمال کرتے تھے۔لفافہ سازی کا یہ عمل مولانا بڑی دلچسپی سے کرتے تھے۔میں مولانا کے اس عمل میں ہاتھ بٹاتا تھا۔میری دلچسپی ڈاک ٹکٹوں میں ہوتی تھی۔ مجھے انہیں جمع کرنے کا شوق تھا۔میرے اس ذوق کی مولانا ہمت افزائی بھی کرتے تھے۔اگر کوئی خط بیرون ملک سے آتا تو اسٹامپ نکال کر میرے لیے رکھتے تھے۔موجودہ نسل اس شفقت کے سرور سے محروم ہے۔مولانا محمود خاں صاحب اور مولانا سراج الحسن صاحب کی خوب بنتی تھی۔مولانا محمود خاں صاحب صرف لفافوں کو دوبارہ استعمال کر کے بیت المال کی بچت نہیں کرتے تھے، بلکہ اور بھی طریقے اختیار کرتے تھے۔دفتر حلقہ میں دودھ ، پاکیٹ کا خریدا جاتا تھا،نندنی دودھ۔دودھ کی پاکیٹ بھی مولانا بڑے سلیقے سے کھولتے تھے۔دفتر کے انتظامات پر جناب عبدالرزاق صاحب مامور تھے۔انہیں بھی مولانا نے سکھایا تھا کہ پاکیٹ کیسے کھولا جائے۔خالی پاکیٹوں کوایک ڈبے میں بڑے سلیقے سے رکھا جاتا تھا۔ایک بڑی مقدار میں پاکیٹ جمع ہونے پر مولانا نے مجھ سے کہا''تنویر میاں ان پاکیٹ کو لے جاؤ،اوینیو روڈ کی ابتدا جہاں سے ہوتی ہے ایک کباڑی کی دکان ہے، وہاں فروخت کر کے آؤ''۔میں بڑی چاہت سے اس کام کوانجام دیتا تھا،ایسا شائد میں نے دو تین بار کیا،کل 60 روپے جمع ہو گئے تھے۔مولانا محمود خاں صاحب نے کہا''چلو اوینیو روڈ چلتے ہیں، وہاں سے ایگل (eagle) کا تھرمس خریدتے ہیں ،دفتر میں تھرمس نہیں ہے''۔دودھ کے پاکیٹوں سے مولانا محمود خاں صاحب نے تھرمس خریدا تھا،شاید یہ مولانا سراج الحسن صاحب کی محبت کا بھی نتیجہ تھا۔

ہم ایسا محسوس کرتے تھے کہ مولانا ہمیں بہت چاہتے ہیں اور ایسا ہر رفیق محسوس کرتا تھا، یہی قائد کا کمال ہوتا ہے۔جماعت کا ہر فرد سمجھے کہ میرا امیر مجھے بہت چاہتا ہے،میری بات سنتا ہے۔اللہ کے رسولؐ کی سیرت کا یہ ایک اہم پہلو تھا۔ایک محفل میں ام مکتومؓ جو نابینا صحابی تھے حاضر ہوتے ہیں۔آپؐ صحابی رسولؐ کی طرف ویسے متوجہ نہیں ہوئے جیسا کہ ہونا چاہیے تھا،اس پر سورہ عبس کا نزول ہوتا ہے۔1992 میں قاضی حسین احمد ،امیر جماعت اسلامی پاکستان سے ملاقات کے لیے ان کے دفتر میں ہم بیٹھے تھے ،ساتھ میں عبدالجبار صدیقی

صاحب ، جواس وقت ایس آئی او کے کل ہند صدر تھے ، بھی ان کے ساتھ تھے ۔قاضی صاحب اپنے کیبین میں کسی سے گفتگو فرمار ہے تھے ۔ایک دیہاتی شخص دیہاتی انداز میں ایک تھیلے میں مالٹا (سنترہ) کے ساتھ دفتر میں داخل ہوتا ہے، کندھے پر سے تھیلا اتار کر نیچے رکھتا ہے ۔قاضی صاحب کے سکریٹری اس سے چند معلومات دریافت کرتے ہیں ۔وہ والہانہ محبت بھرے لہجہ میں کہتا ہے ''جی! وہ میرا امیر ہے، میں اس سے ملنے آیا ہوں'' ۔دیہاتی انداز میں محبت کے اس اظہار کو، الفت کے پیمانوں میں ناپنا مشکل تھا۔سکریٹری نے ہم سے معذرت چاہتے ہوئے کہا کہ ''یوں تو باری آپ کی ہے ،لیکن میں انہیں ملاقات کے لیے اندر بھیجنا چاہوں گا'' ۔وہ صاحب بڑی بے تکلفی سے تھیلے کے ساتھ اندر داخل ہوا ،قاضی صاحب سے ملاقات کی ، مالٹا حوالے کیا اور باہر نکل گیا، بعد میں ہم داخل ہوئے ۔ مالٹا اتنے میٹھے نہیں تھے، لیکن فوری کھٹّے انگور اور اللہ کے رسول کے رویہ کا تذکرہ ، مالٹاؤں کو میٹھا بنا دیا۔امیر و مامور کا یہ اخلاص بھرا تعلق جماعت کو طاقتور بناتا ہے ۔بقول محترم خرم مراد صاحب ، ایک اور ایک دو نہیں گیارہ ہو جاتے ہیں ۔ مامورین کے تئیں امیر کا التفات وہ رومانی کیفیت پیدا کرتا ہے جو جماعتوں کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا دیتا ہے ۔مولانا سراج الحسن صاحب کسی سے ملاقات کرتے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مولانا کی ان سے برسوں پرانی دوستی ہے ۔گرم جوشی میں فرد کا سماجی ،معاشی اور روحانی مرتبہ حائل نہیں ہوتا تھا۔صرف body language سے ہی شفقت کا اظہار نہیں کرتے ، بلکہ گفتگو سے بھی اس کا ثبوت پیش کرتے تھے ۔گفتگو کے دوران وقفے وقفے سے تفصیلات کے لیے سوال بھی کر بیٹھتے تھے،اس سے کہنے والا یہ تاثر لیتا تھا کہ مولانا میری بات غور سے سن رہے ہیں ،اس سے کہنے والے میں اعتماد پیدا ہوتا ہے ۔body language ،لب و لہجہ ،اسلوب اور سننے کی صلاحیت، قائد کے اجزائے ترکیبی میں سے اہم ہیں ۔جن کی شخصیت میں مذکورہ خصوصیات ہوتی ہیں، وہ بڑے خوش قسمت ہوتے ہیں اور جو ان سے ملتے ہیں وہ بھی اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتے ہیں ۔وہ ازواج خوش بخت ہیں جن کے زوجین میں یہ خصوصیات ہوتی ہیں ۔روکھے سوکھے رویے تعلقات باہمی کو کچے دھاگوں سے باندھتے ہیں ۔تحریک اسلامی، ہر اس فرد کا تزکیہ چاہتی ہے، جو اس سے جڑ جاتا ہے ۔تزکیہ سنجیدگی ،روکھے پن اور اجڑے تیور

کا نام نہیں ہے۔تزکیہ میں یہ بھی شامل ہے کہ ''بوڑھیا سے کہا جائے ،بوڑھی عورتیں محبت میں داخل نہیں ہوتی ہیں' نواسوں کو ایک ہاتھ میں اٹھا کر خطبہ جمعہ دیا جائے'' عائشہؓ کو پیٹھ پیچھے سے حبشیوں کی کشتی دکھائی جائے' پیٹ پر دو پتھر باندھے جائیں'' پتھر کھا کر پھول برسائے جائیں'' آدھی رات کے بعد خدائے بزرگ سے بھیک مانگی جائے'' قرض لے کر مہمان نوازی کی جائے، مسکرائیں اور صدقہ کا ثواب پائیں۔

جنہیں اللہ رتبہ دیتا ہے ،ان میں دو الگ الگ رویے دیکھے جا سکتے ہیں۔ایک سیرت پاک سے آشنا اور دوسرا رویہ نفس کا اسیر۔ پہلے گروپ کے قائدین کہیں داخل ہوتے ہیں تو لوگ ان سے ملاقات کے لیے امنڈ پڑتے ہیں۔جیسے شمع پر پروانے۔دوسرے بدبخت وہ ہوتے ہیں جنہیں آتے دیکھ کر لوگ یا تو دور بھاگتے ہیں یا با ادب اپنے اپنے مقام پر کھڑے ہو جاتے ہیں یا پھر بادل ناخواستہ ملاقات کر لیتے ہیں۔مولانا کی شخصیت پہلے گروپ کے چنندہ شخصیات میں ہوتی ہے۔دفتر ہو کہ مسجد ،اجتماعات ہوں کہ اسفار، رفقا مولانا سے ویسے ہی اشتیاق رکھتے تھے جیسا کہ حق تھا۔

امت ایک جسد ہے۔تحریک امت کا ایک نمائندہ گروہ ہے۔تحریک کے کارکنان ایک خاندان کی طرح ہیں۔مولانا رفقا کے ذاتی ،معاشی اور خاندانی مسائل سے واقفیت بھی رکھتے تھے اور حل کرنے میں دلچسپی بھی دکھاتے تھے۔ایک نمایاں مثال رفقا کے لڑکے اور لڑکیوں کے رشتہ لگانے میں مولانا کی دلچسپی تھی۔آج یہ خدمت بھی مارکیٹ کا ایک حصہ بن گئی ہے۔مولانا نے اپنی زندگی میں ہزاروں رشتے لگائے تھے ،رشتہ لگانے کا انداز بھی الگ تھا۔آج کل رشتے لگاتے نہیں، رشتوں کی مارکیٹنگ ہوتی ہے۔درمیان والے صاحب، جنہیں مشاطہ (حالانکہ یہ مونث ہے اور اس کے لغت میں معنی بناؤ سنگار کرنے والی عورت کے ہیں) کہا جاتا ہے وہ اپنی مارکیٹنگ اسکلس marketing skills کا سہارا لے کر رشتہ فروخت کرتے ہیں۔

مولانا کہتے کہ ''میرا کام تعارف کروانا ہے۔باقی آپ لوگ آپس میں معلومات حاصل کر لیں، مطمئن ہو جائیں اور طے کریں''۔ایک امیر اور یہ کام کرے۔مولانا مودودیؒ کے طفیل ہم نے دین کا جامع تصور حاصل کر لیا ہے۔سمجھا کہ دین میں دوئی نہیں بلکہ روحانیت دنیا کے سمندر

پر سفر کرے اور دنیا روحانیت کے پنکھوں پر اڑے۔اس شعور کو تحریک اسلامی نے بیدار کیا۔ لیکن تحریک سے وابستہ کارکنان میں ایک دوسرے انداز کی دوئی در آگئی ہے۔تحریکی کام الگ،نجی یا کسی کی ذات سے متعلق کام الگ،تحریکی کام کی ادائیگی لائق تحسین،دیگر کاموں میں مدد''وقت کا ضیاع''سمجھا جاتا ہے۔مولانا رفقا کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں بھی تعاون فرماتے تھے۔دورے پر جاتے تو رفقا سے پوچھتے دہلی سے آپ کے لیے کیا لاؤں۔بالخصوص کرناٹک اور آندھراپردیش کا دورہ کرتے تو یہاں کے قدیم رفقا کے فرمائشوں کا کافی خیال رکھتے تھے۔اس زمانے میں رفقا مولانا سے سوٹ کیس (اٹیچی)،کوکر،میکسر mixture اور کتابیں وغیرہ کی فرمائش کرتے تھے۔مولانا ان فرمائشوں کی تکمیل بڑی چاہ سے کیا کرتے تھے۔ایک دفعہ مولانا نے مجھے طلب کیا،کہا تنویر میاں،جامع مسجد کے پاس مینا بازار جا کر 9 نمبر(غالباً)دکان سے ایک 40 روپے والا ایک لیڈیز پرس (بیگ) لے آؤ۔پھر وضاحت بھی فرمادی کہ کرناٹک کے ایک رفیق نے اپنی اہلیہ کے لیے اسے منگایا ہے۔اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ رفقا اپنے امیر سے کتنا بے تکلف بھی تھے۔مولانا انفرادی ملاقاتوں میں رفقا کی معاشی کیفیت کا ضرور علم حاصل کرتے تھے۔مقروضوں کی قرض سے خلاصی کے لیے جتن کرتے تھے۔

ڈیل کارنیگی جس نے شخصیت سازی پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔وہ لکھتا ہے کہ کسی کو اس کے نام سے پکاریں تو تعلقات میں مٹھاس پیدا ہوتی ہے۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ آداب کا خیال رکھے بغیر نام لیں۔اردو میں جناب،محترم،صاحب بلکہ تحریکی حلقوں میں مولانا عام ہیں۔اب کارپوریٹ کلچر میں تو صرف نام لیا جاتا ہے۔جبکہ انگریزی میں ایک ایسا لفظ ہے جو کیا بچے،کیا جوان اور کیا بوڑھے سب کے لیے کارآمد ثابت ہوجاتا ہے اور وہ ہے مسٹر۔مولانا سراج الحسن صاحب کو اللہ تعالیٰ نے ناموں کو یادرکھنے کے معاملہ میں غیر معمولی حافظہ سے نوازا تھا۔کبھی ہم عنایت اللہ خاں صاحب کہتے تو مولانا کہتے نہیں،وہ عنایت خاں صاحب ہیں۔ رفقا کے نام اور یہاں تک کہ رفقا کے بچوں کے نام بھی یادرکھتے تھے۔جب کوئی رفیق ملاقات کے لیے آتا تو مولانا ان کا مکمل نام صاحب لگا کر لیتے۔آپ نے بھی محسوس کیا ہوگا کہ اگر کوئی بڑا آدمی آپ کا نام لے کر آپ کو مخاطب کرے تو آپ کے اندر خوشی کے جذبات جنم لیتے

ہیں۔ٹیم ورک (اجتماعیت) میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ہم آپس میں رفقا کے نام یاد نہیں رکھتے ،ضرورت پڑنے پر پوچھتے ہیں ''معاف کرنا آپ کا مکمل نام کیا ہے''۔ایسا پوچھا جاتا ہے جیسے کہ انہیں آدھا یاد ہے۔1982 میں جب میں بنگلور پوسٹ گریجویشن کے لیے منتقل ہوا تو جماعت کے ایک ذمہ دار نے اسی طرح مجھ سے پوچھا تھا کہ آپ کا مکمل نام کیا ہے؟اللہ انہیں غریق رحمت کرے۔ہم نے لطف لینا چاہا۔ان سے پوچھ لیا''چاچا،آپ آدھا ہی بتا دیں ہم پورا کرلیں گے''۔

ایک دفعہ بین الاقوامی شہرت یافتہ سائنس داں جناب ڈاکٹر رینک نذیر احمد، حال مقیم امریکہ کی ایک محفل میں مولانا سراج الحسن صاحب کا ذکر خیر ہوا۔ایک صاحب نے کہا کہ مولانا کے اندر نام یادرکھنے کی skill صلاحیت بلا کی ہے۔انہوں نے اپنا تجربہ بھی بیان کیا۔اس پر گفتگوشروع ہوئی کہ ناموں کوکس طرح یادرکھا جائے۔ڈاکٹر رینک نذیر صاحب نے ناموں کو یادرکھنے کا اپنا ایک تجربہ بیان کیا تھا۔وہ ایک دفعہ خلیل زاد، جوامریکہ میں افغانستان کے سفیر تھےان کے دفتر میں بیٹھے تھے۔اس دوران ایک اور صاحب گراں قدر حاضر ہوئے۔خلیل زاد نے دوران گفتگوان صاحب کا تقریباً دس بارنام لیااور نام سے مخاطب کرتے رہے،وہ صاحب چلے گئے۔ڈاکٹر رینک نذیر صاحب نے خلیل زاد سے پوچھا کہ آپ نے دوران گفتگو ان صاحب کا نام بار بار لیتے رہے،کیاراز ہے؟خلیل زاد نے کہابار بارنام لینے سے گفتگو میں تاثیر پیدا ہوتی ہے،تعلقات میں پختگی ہوتی ہےاور نام یادہوجاتا ہے۔مولانا کا بھی کچھ اسی طرح کا عمل تھاویسے حافظہ اللہ کی نعمت ہے۔

نام کہہ کر مولانا جب معانقہ کرتے تو ایک عجیب روحانی کیفیت حاصل ہوتی تھی۔مولانا دراز قد تھے،ہم جب ملتے تو بغل گیرنہیں ہو پاتے تھے۔مولانا اپنے سینے سے ہمیں لگاتے ''سینے سے لگانا''اردو کامشہور محاورہ ہے۔اس کا مطلب ہمیں گہرائی کے ساتھ اس وقت سمجھ آیا تھا جب مولانا نے ہمیں سینے سے لگایا تھا۔ہمیں دوشخصیات سے معانقہ بڑا روحانی محسوس ہوا تھا،اول مولانا محمد سراج الحسن صاحب اور دوم محترم سید علی شاہ گیلانی سے۔مولانا کے گلے لگانے کے انداز کوکئی لوگ یاد کرتے ہیں۔غیرمسلمین بھی مولانا کے اس انداز سے وارفتہ ہو

جاتے تھے۔

''دھارمک مورچہ'' کا قیام غالباً 1993 عیسوی میں ہوا تھا۔اس مورچہ کی ایک اہم شخصیت سوامی اگنیوش کی بھی تھی ۔ان دنوں سوامی جی اور مولانا کی گلے ملتی تصویر بڑی مقبول ہوئی تھی ۔مختلف ہندی اخبارات نے اسے شائع کیا تھا۔فورم فار ڈیموکریسی اینڈ کمیونل امیٹی'FDCA' کے سلسلے میں ایک بار مرحوم ابوعنصر عابد صاحب کے ساتھ سوامی جی سے ملاقات کے لیے ہم پہنچے۔سوامی جی نے مولانا کے خلوص، پیار، محبت، شخصیت، وجاہت، ہندی دانی اور مولانا کے گلے ملنے کی بڑی تعریف کی۔

مولانا سے جو ایک بار ملتا مولانا کا ہو جاتا تھا اور مولانا اس کے۔مولانا دوستی اور تعلقات کو خوب نبھاتے تھے۔غالباً 1998 کی بات ہے،ان دنوں جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ صاحب ایم پی کا قیام بنگلور میں تھا۔ ہر نئے سال کے آغاز میں مولانا مرکزی مکتبہ اسلامی کی ڈائری 'شب وروز' اور مکتبہ ہی کا ایک کیلنڈر احباب کو تحفتاً پیش کرتے تھے۔ایسے تحفوں کو ہم نے مولانا کے نمائندے بن کر کئی معززین کی خدمت میں پیش کیا تھا،ان ہی میں سے ایک جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ صاحب بھی تھے۔دونوں کی شباہت میں تھوڑی سی یکسانیت تھی ۔ویسے مولانا کا چہرہ زیادہ تو ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے ملتا تھا۔اس وقت ابراہیم سلیمان سیٹھ صاحب نے کہا تھا کہ ''یہ غالباً دسویں ڈائری ہے جو مولانا سراج الحسن صاحب کی میرے پاس ہے''۔بڑے احترام کے ساتھ اسے حاصل کیا،کہا کہ مولانا میرے محسن ہیں ۔میں کئی سیاسی وملی امور میں مولانا سے مشورہ کرتا ہوں ۔معززین مولانا کے اس تحفے کو بڑے احترام سے قبول کرتے تھے۔میں نے جنہیں مولانا کا یہ تحفہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کی تھی وہ ایک لمبی فہرست ہے۔اس میں جناب سید شہاب الدین سے لے کر جناب میر مقصود علی خاں (ایم پی وایڈیٹر روزنامہ سالار) اور اسی اخبار کے چیف ایڈیٹر جناب علی حفیظ صاحب شامل ہیں ۔تعلقات کو بنائے رکھنے کا گُر مولانا کے پاس بڑا مؤثر تھا۔اونچی اونچی شخصیات مولانا سے باعزت بے تکلف ہو جاتی تھیں۔ایک دفعہ کشمیر کے مشہور ایم پی سیف الدین سوز صاحب مرکز تشریف لائے تھے۔

سیف الدین سوز صاحب کی شخصیت ہندوستان کی سیاست میں تاریخی ہے۔اٹل بہاری واجپائی کی حکومت 13 مہینوں بعد 17 / اپریل 1999 میں ان ہی کے ایک مخالف ووٹ سے گر گئی تھی ۔اس وقت یہ جموں کشمیر نیشنل کانفرنس کے بارامولہ حلقہ لوک سبھا سے ممبر آف پارلیمنٹ تھے۔ پارٹی سے بغاوت کی تھی اور واجپائی سرکار اکثریت ثابت نہیں کرسکی تھی ، یہ ڈیموکریسی کا کمال ہے۔ایسا بھارت کی اب تک کی تاریخ کا پہلا واقعہ ہے۔سوز صاحب بعد میں ہیرو بن گئے۔کانگریس میں شمولیت اختیار کرلی ،مرکزی وزیر رہے، پروفیسر تھے اچھا بولتے تھے۔مولانا سے بڑی بے تکلفی تھی ۔ان کے ساتھ ہمیشہ ان کا حفاظتی دستہ ہوتا تھا۔جب جماعت کے کیمپس میں داخل ہوئے اور مولانا سے ملاقات کے لیے مولانا کی آفس میں حاضر ہوئے تو مولانا بڑی گرم جوشی کے ساتھ ان سے بغل گیر ہوئے ۔اور پوچھا کہ ''آپ کا حفاظتی دستہ کہاں ہے''؟ سوز صاحب نے بڑی بے تکلفی سے جواب دیا ''میں جماعت کے کیمپس میں اپنے آپ کو گھر سے زیادہ محفوظ سمجھتا ہوں'' ۔مولانا بھی ان کے جواب سے خوب محظوظ ہوئے۔

مولانا وطن سے محبت کا اظہار اپنی تقاریر میں بڑے جذباتی انداز میں کرتے تھے۔میں نے مولانا کی پہلی تقریر 1980 عیسوی میں بیدر کے عثمان گنج میں سنی تھی ۔ پروگرام عوام الناس کے لیے تھا۔عثمان گنج میں غیر مسلم سناروں کی دکانیں تھیں۔ویسے یہ مارکیٹ کا علاقہ تھا۔ ''میرے وطن عزیز کے بھائیو، میرے وطن کو ایشور نے خوب نعمتوں سے مالا مال کیا ہے''۔ اسی تقریر میں ہم نے آپ کو کہتے سنا تھا ''راستہ میں اگر ہم دیکھیں کہ کوئی کانٹے بچھائے ہیں تو ہم بھی تھوڑے اور کانٹے ڈال دیں تو راستہ کانٹوں سے ہی بھر جائے گا۔ہم کانٹے ڈالنے والے نہیں بلکہ کانٹے صاف کرنے والے ہیں''ایک اور جملہ بڑا دل کو موہ لینے والا آپ نے کہا تھا۔ ''ہم جانوروں کو تو پانی پلاتے ہیں ، پرندوں کو دانے ڈالتے ہیں،لیکن اپنے جیسے انسان اپنے بھائی کو دھتکارتے ہیں''۔آیئے ایک ایسے دیش کا نرمان کریں جو بھوک ،خوف سے آزاد ہو، جہاں پریم کی ندیاں بہتی ہوں۔ پروگرام ختم ہوا لوگ مولانا سے ملاقات کے لیے اسٹیج کی طرف بڑھ رہے تھے، اسی بھیڑ میں ایک فرد تھا لمبی داڑھی ،ڈھیلہ کرتا اور پاجامہ ہم اس سے واقف تھے ۔اس لیے کہ وہ ہمارے والد بزرگوار کے دوست تھے۔ برجپال سنگھ،شہر میں آر ایس

ایس کا چہرہ۔ مولانا کی نظر برجیال سنگھ پر پڑی تو آپ نے ایسے پرتپاک انداز میں ملاقات کی جیسے بے انتہا عزیز دوست سے مل رہے ہیں۔ ہمیں بھی حیرت ہوئی اوروں کو بھی۔ معلوم ہوا کہ مولانا اور برجیال سنگھ ایمرجنسی کے دوران ''ہم اسیر'' تھے۔ برجیال سنگھ سے الفت کا ایک واقعہ جناب محمد آصف الدین صاحب نے بھی بیان کیا تھا۔ آصف الدین صاحب بھی ایس آئی او کے نیشنل سکریٹری رہ چکے ہیں۔ آپ کا تعلق بھی بیدر سے ہے۔ ان دنوں وزڈم انسٹی ٹیوشن کے ذمہ دار ہیں۔ ان کے والد محترم بھی رکن جماعت تھے، جناب محمد اکرام الدین صاحب۔ محکمہ تعمیرات میں اسسٹنٹ ایگزیکیٹو انجینئر تھے۔ جماعت کے ذمہ داران کی خوب مہمان نوازی کرتے تھے۔ مہمان نوازی کی عادت حسنہ محمد آصف الدین میں بھی خوب ہے۔ ان دنوں موصوف رکن شوریٰ جماعت اسلامی کرناٹک ہیں۔ آصف صاحب نے ایک واقعہ یوں بیان کیا۔ مولانا بیدر تشریف لائے تھے۔ دوسرے دن ناشتہ کا انتظام ان کے گھر تھا۔ مولانا کا قیام تو مولوی فہیم الدین صاحب کے مکان میں ہوا کرتا تھا۔ ناشتہ کی تیاری بڑے چاہ کے ساتھ ہوئی تھی۔ روایتی انداز میں پائے، زبان، کلیجی وغیرہ۔ گذشتہ دنوں مہمان رحمت ہوتا تھا۔ اب تو تحریکی گھرانوں میں بھی مہمان نوازی مغربی کلچر سے متاثر ہوگئی ہے۔ مہمان آتے ہیں تو فرزند کو ہوٹل بھیجا جاتا ہے۔ آج کل تو بہت سے ایپ بھی آ چکے ہیں۔ پہلے گھر میں مہمان آتے تو گھر کے تمام افراد خوشی کا اظہار کرتے تھے، بچوں کو بھی صاف ستھرے کپڑے پہنائے جاتے، بچے باری باری آتے سلام کرتے ابا کہتے بیٹے لب پے آتی ہے پڑھ کر سناؤ۔ دوسرا بچہ آتا اس سے کہا جاتا، بیٹے یوم آزادی کے موقع پر آپ نے جو تقریر کی تھی وہ سناؤ۔ گھر کی خواتین بھی پردے یا کیواڑ کے آسرے گفتگو سنتی تھیں۔ اب یہ کلچر nostalgia بن گیا ہے۔ اب مہمانوں کا انتظام دفتروں اور lodges میں کیا جاتا ہے۔ ہمارے پاس سے ہمارا کلچر ایسا لگ رہا ہے کہ بعض مغربی تنظیموں کی طرف جا رہا ہے۔ اس میں ایک rotary club بھی ہے۔ ایک روٹیرین (روٹری کلب کا ممبر) اگر تنظیم کے کام سے دوسرے شہر جاتا ہے تو اس کا انتظام کسی دفتر یا لاج میں نہیں ہوتا بلکہ میزبان روٹرین اپنے گھر میں کرتا ہے۔ ایک دفعہ میں روٹری کلب کے تحت بیدر سے آندھراپردیش شہر نیلور گیا تھا۔ میری مہمان نوازی وہاں کے ایک پروفیسر نے کی تھی۔

آصف نے کہا کہ گھر میں ناشتہ تیار ہو گیا تھا۔مولانا کی بے چینی سے انتظار ہو رہا تھا۔ بالآخرابا نے مجھے (آصف الدین) کوفہیم الدین صاحب کے گھر بھیجا تا کہ مولانا کو لا یا جا سکے۔ آصف صاحب فہیم الدین صاحب کے گھر پہنچے۔مولانا کے قریب جا کر کہا کہ گھر میں آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔مولانا نے بڑے پیار بھرے لہجے میں کہا کہ "ابا سے کہو کہ وہ تو ہمارا گھر ہے، ہم کبھی بھی آسکتے ہیں۔ابھی ناشتے پر ہمارے ایک دیرینہ دوست برجیال سنگھ صاحب نے مدعو کیا ہے۔میں چاہتا ہوں کہ ان کے پاس جاؤں اور مولانا برجیال صاحب کے گھر چلے گئے۔ کسی نے کہا ہے "بے علم کو علم سکھاؤ، دشمن کو دوست بناؤ، پھر کامیابی تمہارے قدم چومے گی"۔

دشمن کو دوست بنانے کا گر مولانا سے سیکھا جائے۔جماعت اسلامی ہند پر جب دوسری مرتبہ پابندی لگی تو اس کے ابتدائی ایام میں ٹائمز آف انڈیا میں جماعت اسلامی ہند کے متعلق ایک منفی مضمون شائع ہوا۔آرٹیکل دو قسطوں میں تھا۔اس کو لکھنے والے اس وقت کے ایڈیٹر مسٹر گری لال جین تھے۔جماعت نے طے کیا کہ مسٹر جین سے ملاقات کی جائے۔مولانا کی قیادت میں ایک وفد صاحب کے پاس پہنچا۔مولانا نے جین صاحب کو سنا۔جین صاحب کی باتیں کچھ تو بے بنیاد تھیں اور چند غلط فہمیوں کی بنیاد پر۔مولانا نے جین صاحب کو خوب بولنے کا موقع دیا۔جین صاحب بول جب بول چکے تو مولانا نے پوچھا،جین صاحب میں کچھ کہوں اور مولانا نے کہا کہ "غلطی ہماری ہے ہم نے اپنا تعارف آپ سے نہیں کروایا"۔یہ جملہ اعتراف، جین صاحب پر بجلی بن کر کڑکا اور ان کے اندر موجود کڑواہٹ کو محبت میں تبدیل کر دیا۔انہوں نے ٹائمز آف انڈیا کے آئندہ شمارے میں وضاحت شائع کی اور جماعت کے متعلق ایک مثبت تحریر کو بھی اپنے موقر اخبار میں جگہ دی۔

مولانا win-win کیفیت پر افراد کے ساتھ گفتگو کرنے کا فن جانتے تھے۔win-win کیفیت گفتگو یا تعلقات کا وہ مرحلہ ہے جس میں مخاطب اور متکلم (جو سن رہا ہے اور جو بول رہا ہے) دونوں مطمئن ہو جائیں۔ہر دو کے اندر یہ احساس پیدا ہو کہ میں ہارا نہیں، مجھے ناکامی نہیں ملی، مجھے سبکی اٹھانی نہیں پڑی۔تعلقات باہمی اور رشتوں میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔

مخلص خادم، مشفق قائد

محمد اطہر اللہ شریف، سابق امیر حلقہ کرناٹک

2/اپریل 2020ء کو انسانیت کے ایک مخلص خادم، تحریک اسلامی ہند کے ایک مشفق قائد مولانا محمد سراج الحسنؒ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ ہم لوگ گواہی دیتے ہیں کہ اس بندۂ عاجز نے اپنی شعوری زندگی کا پل پل نچوڑ کر اور سرمائیہ حیات کا پائی پائی لٹا کر مقصد حیات کو پورا کیا۔ قرآن میں اہل جنت کی ایک خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ اپنی استطاعت بھر بندگی بجالاتے ہیں۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا و عَمِلوا الصّالحاتِ لَا نُكَلِّفُ نَفسًا اِلَّا وُسْعَهَآ اُولٰٓئِكَ اَصحابُ الجَنَّةِ هُم فِيهَا خالِدُوْنَ (الاعراف 24:) جس عمر میں عموماً نوجوان لاابالی پن کا شکار رہتے ہیں اس نوخیز عمری میں مولانا محترم نے پورے شعور کے ساتھ اپنے مقصد زندگی کو سمجھا اور اس کو پورا کرنے میں لگ گئے۔ ضلع رائچور کے سندھنور تعلقہ کے جاولگیرہ گاؤں کے اس سپوت نے پورے ملک پر اپنے اثرات چھوڑے ہیں اور اپنے لاکھوں سوگواروں کے دلوں میں جگہ پائی ہے۔

دو مقاصد سے مولانا کی حیات و خدمات کو قلم بند کرنا ضروری ہے۔ ایک ہماری اگلی نسلوں کے لیے مشعل راہ ملے۔ دوسرا مرحوم سے ہمارے تعلق کا حق بھی ادا ہو سکے۔ تاہم یہاں جو کچھ ذکر ہوگا وہ ہمارے مشاہدہ اور فہم کی تنگ دامنی کے ساتھ ہوگا۔ لیکن مولانا کی شخصیت اس سے بہت بلند ہے۔ مولانا کی حیات میں ان کی خدمات کا تذکرہ نہیں کیا جاسکا۔ اس لیے کہ تحریکی حلقوں میں اس کو پسند نہیں کیا جاتا کہ کہیں نفس موٹا نہ ہو جائے۔ خود مولانا محترم بھی اس کی حوصلہ شکنی کرتے تھے۔

مرحوم کی زندگی کے کئی ایک پہلو ہیں اور ہر پہلو قابل ذکر اور قابل غور وفکر ہے۔ ترجیحی

طور پر پہلے آپ کی خدمات پیش ہوں گی، جنہیں کارنامے بھی کہا جاسکتا ہے۔

خدمت وقیادت:

تقسیم ملک کے وقت کے خوں ریز فسادات اور سقوط حیدرآباد کن کے قیامت خیز حالات کی وجہ سے موجودہ ریاستِ کرناٹک کے پانچ شمالی اضلاع میں، جو نظام سرکار کے علاقہ کو کاٹ کر ریاست میسور میں شامل کیے گئے تھے، مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی نہایت کٹھن اور پریشان کن تھی۔ یاد رہے کہ یہ حالات دراصل ان کٹھنائیوں کی زنجیر کی کڑیاں تھیں جو مغلیہ سلطنت کے زوال، ٹیپو شہید کی حکومت کے خاتمہ، 1857 کی پہلی جنگ آزادی کی ہولناک شکست، خلافت تحریک کے عبرت ناک اختتام سے جڑی ہوئی تھیں۔ 1941ء میں جماعت اسلامی کے قیام کا فیصلہ خود ایک انتہائی حوصلہ منداور حوصلہ بخش اقدام تھا۔ ان حالات میں کسی فرد کی اس تحریک سے وابستگی دیوانگی سے تعبیر کی جاتی تھی۔ بقول مولانا مرحوم ''بلاشبہ مقصد زندگی کی دیوانگی ہی کسی کو اس تحریک سے وابستہ کرسکتی ہے۔ ورنہ فرزانوں کے بس کی بات نہیں''۔ ان پر آشوب حالات میں 1958ء میں 25 سالہ نوجوان محمد سراج الحسن کو ریاست میسور کی جماعت کی امارت کی بھاری ذمہ داری سونپی جاتی ہے۔ جس سے یہ اندازاہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ نوجوان کِس کَس بل کا مالک ہوگا۔ آپ یہ ذمہ داری 26 سالوں تک یعنی 1984ء تک نبھاتے رہے۔ جماعت کی مرکزی قیادت نے آپ کی صلاحیت اور سلیقہ سے متأثر ہوکر مرکز میں سکریٹری کی ذمہ داری کے لیے طلب کرلیا۔ اس ذمہ داری کو آپ نے سات سالوں تک اس اسلوب سے نبھایا کہ پورا ملک آپ سے مائل ہوگیا اور بالآخر 1990ء میں پوری جماعت کی قیادت آپ کو سونپ دی گئی۔ 2003ء تک پورے 13 سال آپ نے یہ ذمہ داری بھی بہ حسن وخوبی نبھائی۔ بالآخر جب آپ نے محسوس کیا کہ اب نئی قیادت کو آگے آنا چاہئے۔ آپ نے ذمہ داری کا بوجھ مزید سنبھالنے سے معذرت کرلی اور انتخابی عمل سے اپنے آپ کو الگ کرلیا۔ حالانکہ مجلس انتخاب کے اراکین نے شدید خواہش اور گزارش کی کہ آپ قیادت کو جاری رکھیں، لیکن آپ نے اپنی پیرانہ سالی اور معذوری سے انہیں مطمئن کیا اور سبکدوشی اختیار کرلی۔ نصف صدی سے زائد (پورے 55 سال) کی یہ مدت دراصل خدمت بہ نام قیادت کی

طویل، بلکہ عظیم تاریخ ہے۔اس پر مضامین نہیں کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جن صفات سے آپ کو آراستہ فرمایا تھا وہ تقریباً وہی ہیں جو قرآن میں اولو العزم مومنوں کی بیان ہوئی ہیں: فَمَا وَ هَنُوا لِمَآ اَصَابَهُم فِی سَبِیلِ اللّٰهِ وَ مَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَکَانُوا وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ (آل عمران:146)۔ دل شکستہ نہ ہونا، کمزوری نہ دکھانا، باطل کے آگے سرنگوں نہ ہونا اور صبر کرنا۔ اللہ کے رسول ﷺ کے متعلق قرآن نے فرمایا: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُم وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِیْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَ شَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَی اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِیْنَ (آل عمران:159) رسول اکرم ﷺ کے سچے پیرو مولانا محمد سراج الحسن کے اندر بھی وہ صفات موجود تھیں۔ نرم دلی، قصورواروں کو درگزر کرنا، ان کے لیے دعائے مغفرت کرنا، اور انہیں شریک مشورہ رکھنا۔ کسی کام کا عزم کر لینے کے بعد اللہ پر پورا توکل کرنا آپ کی نمایاں صفات تھیں۔

شاعر اسلام علامہ اقبالؔ نے ایک امیر کے لیے جن صفات کو ضروری قرار دیا ہے جیسے یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم، نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُر سوز، حلقہ یاراں میں ریشم کی طرح نرم، رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہونا، بلا مبالغہ مولانا مرحوم کو اللہ نے ان صفاتِ عالی سے متصف فرمایا تھا۔

ملی اتحاد:

ملک کے پُر فتن اور حوصلہ شکن حالات میں اعلائے کلمۃ اللہ کے عظیم فریضہ کے لیے افراد اور ماحول کو تیار کرنا گویا جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔ دوسری طرف ذہنی طور پر پریشان، فکری طور پر منتشر، معاشی طور پر پس ماندہ اور سماجی طور بکھراؤ کا شکار ملت اسلامیہ کے اندر خوداعتمادی اور خدا اعتمادی پیدا کرنا، ایمان کی روح پھونکنا، جینے کا حوصلہ پیدا کرنا، اجتماعی جد وجہد کا ماحول پیدا کرنا گویا پتھریلی زمین میں ہل جوتنے کے مانند تھا۔ ملت کے اجتماعی ادارے جیسے مسلم پرسنل لاء بورڈ اور مسلم مجلس مشاورت کے اندر معنویت اور مقصدیت کی بقا اور ارتقا میں جن بزرگوں کا خونِ جگر شامل ہے ان میں مولانا محمد سراج الحسن کا نام جلی حروف میں لکھا نظر آتا

ہے۔ 1965ء میں مرحوم عزیز سیٹھ کو ریاست میسور میں مسلم مجلس مشاورت کے صدر اور مولانا کو سکریٹری کی ذمہ داری دی گئی۔ آپ نے علماء، سیاست دانوں، صحافیوں اور دانشوروں کی ایک کہکشاں ترتیب دے کر مہماتی انداز میں پوری ریاست کا دورہ کیا۔ مولانا علی میاں ندویؒ، مفتی عتیق الرحمٰنؒ، معروف صحافی محمود ایاز (بانی روزنامہ سالار بنگلور) علی حفیظ، ملا جان محمد، ضیاء میر کے نوجوان فرزند سجاد احمد وغیرہم اس وفد میں شامل رہے۔

مولانا جب مرکزِ جماعت دہلی منتقل ہوئے تو بیس سال وہاں جماعت کی ذمہ داریوں میں مصروف عمل رہے۔ اس دوران مجلس مشاورت اور پرسنل لا بورڈ کے کاموں میں برابر شریک ہوتے رہے۔ ان اداروں میں مختلف مکاتب فکر کی نمائندگی کا اہتمام کیا۔ مولانا قدیر احمد ادا آمری بنگلور کو بورڈ کا رکن بنائے جانے کے پیچھے مولانا سراج الحسن کی کاوشوں کا تذکرہ خود مولانا ادا آمری کیا کرتے تھے۔ مولانا علی میاںؒ کے وصال کے بعد بورڈ کی قیادت کے معاملہ کو اسی طرح قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کے انتقال کے بعد بھی بورڈ کی صدارت کے معاملہ کو نہایت احسن طریقے سے حل کرنے میں مولانا سراج الحسن کے کردار کو سنہرے حروف میں لکھا جا سکتا ہے۔ بنگلور میں الامین ایجوکیشن سوسائٹی کے قیام میں بھی مولانا کا کردار یاد رکھا جانا چاہئے۔

جماعت کا استحکام:

ملک کے سیاسی امور سے متعلق جماعت کے اندر جب اختلافات پیدا ہوئے، گروہ بندیوں کا ماحول بننے لگا، جماعت ٹوٹ جانے کے اندیشے ظاہر ہونے لگے۔ مولانا محمد سراج الحسن نے سکریٹری جماعت کے طور پر پورے ملک کا دورہ کیا۔ جماعت کی پالیسی کی شرعی حیثیت اور حالات کے تقاضوں کو نہات سلیقہ اور سوزِ دل کے ساتھ سمجھایا۔ رایوں کے اختلاف کے پیچھے موجود اخلاص وللّٰہیت کے جذبہ کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور دکھایا، اظہار رائے بلکہ اظہار اختلاف کے آداب اور اسلوب سمجھائے، اجتماعی فیصلوں کا احترام اور اس کے پیچھے اللہ کا ہاتھ ہونے کا یقین بتایا۔ جماعت کے نصب العین پر اصلاً توجہ مرکوز کرائی اور اجتماعیت کی روح میں تازگی پھونک کر ذہنی یکسوئی پیدا کی۔ اس پورے عمل میں مولانا کی خداداد صلاحیتوں کے حسین مظاہر سے رفقائے جماعت کے دلوں میں نرمی اور آنکھوں میں نمی نمایاں طور پر نظر آتی تھی جس

کے چشم دید گواہ آج بھی موجود ہیں۔ اللہ نے اپنے فضل سے مولانا مرحوم کی ان مخلصانہ، حکیمانہ اور مدبرانہ کوششوں کے ذریعہ جماعت کی صفوں میں ضعف اور کمزوری کو درآنے سے روکا اور شِگاف پڑنے سے بچالیا۔

عظیم داعی:

مولانا مرحومؒ نے جماعت کے نصب العین، اقامت دین کے لیے 'دعوت دین' کی فرضیت اوراس کی اہمیت کوشدت سے سمجھایا، ملک کے حالات میں اس کام کے لیے پائے جانے والے امکانات کواجاگر کیا، برادران وطن کے مزاجوں کا تجزیہ نہایت حقیقت پسندی اور عمدگی سے پیش کیا۔ ہندوستان کو دارالحرب یا دارالکفر جیسے الفاظ سے پکارے جانے کو دلیل سے رد کیا کہ جب یہاں کے باشندوں کے روبرو اولیاء کرام نے اللہ کا دین پیش کیا تو ہزاروں اور لاکھوں لوگوں نے اسے قبول کیا ہے۔ مولانا کا کہنا تھا کہ یہ ملک نہ دارالحرب ہے اور نہ دارالکفر ہے بلکہ یہ تو ''دارِ دعوت'' ہے۔ آج یہاں اسلام کا پیغام نہیں پہنچ رہا ہے۔ آج بھی یہاں ویسے ہی انسان پائے جاتے ہیں لیکن ہمارے ان کے درمیان دوریاں ہیں۔ یہ لوگ اپنے حقیقی خالق و مالک کو پہچانتے نہیں اور دوسری طرف ان کے اندر غلط فہمیاں بھی پیدا کی جارہی ہیں۔ اور اِدھر ہم بھی دعوت نہیں پہنچارہے ہیں۔ اس میں قصور داعیوں کا ہے یا مدعو قوم کا؟ یہ باتیں سمجھا کر مولانا نے لوگوں کو انگلی پکڑ کر میدان میں اتارا۔ برادران وطن کے مذہبی پیشواؤں سے ملاقاتیں کیں، عوام سے ملایا، دانشوروں سے گفتگو کی، صحافیوں سے کلام کیا، سیاست دانوں سے تبادلہ خیال کیا۔ رفقائے جماعت نے اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ مولانا کی بتائی ہوئی باتیں بالکل حقیقت پر مبنی تھیں اوران کے ذہن کے چودہ طبق روشن ہوئے اور جماعت دعوت کے رُخ پر چل پڑی۔ دعوت دین کے تقاضے ابھرنے لگے، مدعوئین کی زبانوں میں اسلام کے پیغام کو پیش کرنے کے لیے دارالاشاعتیں قائم ہونے لگیں، ترجموں اور تصانیف کا گراں قدر کام شروع ہوا جو الحمدللہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ خود مولانا بتایا کرتے تھے سات سو سالہ دور حکمرانی میں پورے وسائل پر کنٹرول ہونے کے باوجود مسلمانوں نے یہاں کے باشندوں کے روبروان کی اپنی زبانوں میں اسلام کا پیغام پیش کرنے

کے لیے کوئی کام نہیں کیا۔لیکن جماعت اسلامی اپنی کم مائیگی کے باوجود یہ کام کررہی ہے۔یہ اللہ کا بڑا فضل ہے۔کرناٹک میں مرحوم عبدالغفارؒ سولیہ اور مولانا احمد نوریؒ کے ذریعہ کنڑا میں قرآن مجید کے ترجمہ اور دیگر لٹریچر کی تیاری شروع کی۔ جسے بعد میں مرحوم ابراہیم سعیدؒ، جناب سعد اللہ، عبدالسلام پتگے ، بی ایس شرف الدین وغیرہم نے بہت ترقی دی۔مولانا سراج الحسن صاحب اس ملک کی اور یہاں کے باشندوں کی خصوصیت اس طرح بیان کرتے تھے کہ مذہبیت ان کی سرشت میں داخل ہے۔جس شکل میں بھی خدا کا تعارف انہیں ہوا ہے اس سے وابستگی اور وارفتگی کا جذبہ ان کے اندر پایا جاتا ہے۔انہیں خدا کا صحیح تعارف کرایا جاتا ہے تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔مولانا فرمایا کرتے کہ نبی ﷺ کو ان کے اہل وطن نے محض اس جرم میں ستایا، قید و بند کیا اور بالآخر وطن چھوڑنے پر مجبور کیا کہ وہ انہیں ایک خدا کی بندگی کی دعوت دے رہے تھے۔مگر میرے وطن ہندوستان کے لوگوں کے روبرو جب یہی پیغام پیش کیا جاتا ہے تو وہ توجہ سے سنتے ہیں، داعیوں کی عزت اور قدر کرتے ہیں، اپنے پیسوں سے لٹریچر خریدتے ہیں، قرآن کو ادب واحترام سے لیتے ہیں، سر پر رکھ لیتے ہیں۔عین ممکن ہے کہ اسی خصوصیت کے سبب نبی ﷺ نے ہند سے ٹھنڈی ہواؤں کے آنے کا مژدہ سنایا تھا۔مولانا کی اس تلقین نے لوگوں میں دعوت دین کے جذبہ کو مہمیز دینے کا کام کیا۔

مربوط رابطہ:

مولانا محمد سراج الحسن کا عوام اور خواص سے رابطہ مثالی ہے۔یہ رابطہ بے غرضانہ نہ تھا بلکہ غرض مندانہ تھا، بامقصد تھا، اور باوقار تھا۔غرض صرف اور صرف یہی کہ اللہ کے بندوں کو اللہ کا پیغام پہنچایا جائے۔ چپراسی سے چیرمن تک، موچی سے منشی و منسٹر تک ہر ایک سے خندہ پیشانی اور کھلے دل سے ملاقات کرتے۔ ملاقات میں بے تکلفی دبے پاؤں داخل ہوجاتی۔جب رخصت ہوتے تو ملنے والے دیر تک مولانا کی باتوں اور یادوں میں کھوئے رہتے۔صدور جمہوریہ میں نیلم سنجیوا ریڈی، وی وی گِری، شنکر دیال شرما، نائب صدر بی ڈی جتی، اور وزرائے اعظم میں وی پی سنگھ، چندر شیکھر، آئی کے گجرال، چرن سنگھ، دیوے گوڈا، اور واجپائی سے آپ کے روابط تھے۔کرناٹک کے وزرائے اعلی میں دیوراج ارس، ویریندرا پاٹل، رام کرشنا ہیگڈے،

جے ایچ پٹیل، بنگارپا اور ایس یم کرشنا ایس آر بومائی، عدلیہ میں جسٹس مارکنڈے، جسٹس راجیند ر ساچر، جسٹس نور سری نیواس، جسٹس ین ڈی وینکٹیش، صحافیوں میں کلدیپ نیّر، کرنجیا، گری لال جین، دلیپ پڈگاؤنکر، مذہبی پیشواؤں میں سوامی اگنی ویش، سوامی دیانند سرسوتی، کنڑا ادیبوں میں کوئیم پو، یوآر اننت مورتی، سیش گری راؤ، پاٹل پٹپا، وغیرہ جیسی کئی اہم شخصیات سے آپ کے روابط اور مراسم رہے۔ ملت کے ہر مکتبہ فکر کے علماء و مشائخ سے آپ کے تعلقات تھے۔ مرحوم ابراہیم سلیمان سیٹھ، غلام محمد بنات والا، سید شہاب الدین، مولانا ابوسعود، مولانا اشرف علی باقوی، مولانا عبدالحفیظ جنیدی، مولانا عبدالمتین جوناگڑھی، خسرو حسینی، جعفر شریف، رحمٰن خاں، ممتاز احمد خاں، ابراہیم خلیل اللہ خاں، مقصود علی خاں، پروفیسر ممتاز علی خاں، ڈاکٹر بی شیخ علی وغیرہم سے گہرے روابط رہے۔ ملاقاتوں میں وقار، سنجیدگی، معیار، اور مقصدیت غالب رہتی۔ آپ کے مزاج میں نہ احساس کمتری تھا اور نہ احساس برتری تھا۔ نہ تصنع تھا نہ غلو تھا۔ گفتگو وزن دار اور معنی دار ہوتی۔ ملاقات کا وقت پہلے سے نہ صرف طے ہوتا بلکہ اس کی پابندی کا اہتمام بھی ہوتا۔ گفتگو کے دوران مخاطب کی توجہ، دلچسپی اور شمولیت پر نظر رکھتے۔ اگر بے توجہی محسوس کرتے تو شائستگی کے ساتھ گفتگو ختم کر کے رخصت ہوجاتے۔ دوسروں کی گفتگو خود بھی پوری توجہ کے ساتھ سنتے۔ شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ مخاطب کی بات نہ سمجھے ہوں اور دوبارہ فرمانے کی گزارش کی ہو۔ ملاقاتی اگر دوسری زبان والے ہوں تو مترجم کی مدد ضرور لیتے۔ اردو کے علاوہ کنڑا، انگریزی اور ہندی سمجھ لیتے تھے۔ لیکن مافی الضمیر کی ادائیگی کے لیے اردو یا ہندی میں ہی گفتگو فرماتے۔ پریس کانفرنس میں اکثر ہندی میں خطاب فرماتے۔ اس قدر واضح انداز میں گفتگو کرتے کہ میڈیا والوں کو چاہے وہ کسی بھی زبان والے ہوں ترجمہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ کار کے ڈرائیور، دفتر کے ملازم، رکشہ بان، ڈاکیہ، اور نائی سے بھی اچھے مراسم بلکہ ان کے بچوں سے بھی تعلقات رکھتے اور ان کی خیر خواہی کا لحاظ رکھتے تھے۔

خطوط نویسی:

مولانا کے رابطہ کا ایک انوکھا اور نادر پہلو خطوط نویسی ہے۔ عموماً رات کو 10 بجے کے بعد

خطوط لکھنے بیٹھ جاتے۔ پرانے نئے ملاقاتیوں سے، جماعت کے مقامی ذمہ داروں سے خط کے ذریعہ مضبوط رابطہ رکھتے۔ اپنے ساتھ ہمیشہ پوسٹ کارڈس موجود رہتے۔ دوروں پر جانے سے قبل نظام الاوقات، سفر کی تفصیلات سے آگاہ کرتے۔ راستے میں آنے والے مقامات کے رفقاء کو اطلاع کرتے کہ فلاں بس یا ریل سے آپ کے مقام سے فلاں وقت گزر ہوگا۔ ہو سکے تو شرف ملاقات بخشیں۔ خط پا کر لوگوں کو اتنی خوشی ہوتی کہ لوگ جوق در جوق مولانا سے ملاقات کے لیے اسٹیشن پہنچ جاتے۔ آدھی رات بھی ہو جائے مولانا اسٹیشن پر آنے والوں سے گرم جوشی سے ملاقات کرتے۔ نہ آنے والوں کو سلام پہنچانے کو کہتے۔ بالخصوص اپنے اپنے گھر والوں کو سلام پہنچانے کی تاکید کرتے۔ دورے کے بعد واپس پہنچنے کی اطلاع دیتے، دورے کے تأثرات اور مزید ہدایات دیتے۔ جماعت کے باہر کے لوگوں کو جماعت کے لیٹر ہیڈ پر خط لکھتے بالخصوص معززین کو۔ ورنہ رفقائے جماعت کے لیے پوسٹ کارڈ پر اکتفا کرتے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق مولانا نے 50 ہزار خطوط لکھے ہیں۔ جماعت کے احباب میں یہ ایسا ریکارڈ ہے جسے شاید ہی کوئی توڑ پائے۔

تحفے تحائف:

ملک بھر میں پھیلے ہوئے ذمہ داران ملت کو جن سے آپ کے روابط تھے ہر سال بڑی پابندی کے ساتھ انہیں جماعت کی ڈائری 'شب و روز' روانہ کرتے۔ کبھی خود ہی ملاقاتوں میں اپنے ہاتھ سے پیش کرتے تھے۔ برسوں سے یہ معمول تھا۔ رواں سال 2020ء کی ڈائریاں بھی جماعت نے آپ کے شناساؤں تک پہنچانے کا اہتمام کیا تھا۔ لوگوں کو اس کا انتظار رہتا تھا، اگر پہنچنے میں تاخیر ہو جاتی خود ہی یاد دہانی کراتے۔ ہمیشہ ملاقاتوں میں افراد کی مناسبت سے کتابیں تحفتاً پیش کرتے تھے۔ آپ کی اسی تربیت کا نتیجہ ہے کہ اب جماعت کے ہر سطح کے ذمہ داروں کا یہ معمول بن گیا ہے۔

ابتلاء و آزمائش:

ہر بڑے کام کا راستہ آزمائشوں اور تکلیفوں سے گزر کر ہی طے ہوتا ہے۔ بالخصوص داعیان حق کو ان گھاٹیوں سے ضرور گزرنا پڑا ہے۔ مولانا محمد سراج الحسن بھی خوش قسمت رہے

کہ سنت یوسفی تین مرتبہ آپ کے حصہ میں آئی۔ 1965ء میں ہند و پاک جنگ کے موقع پر جماعت اسلامی کے کئی قائدین کو زنداں کا سامنا کرنا پڑا۔ مولانا سراج الحسن کو بھی گرفتار کر کے رائچور، بیجا پور اور بلاری کی جیلوں میں رکھا گیا۔ حالانکہ تین چار دنوں میں ہی جنگ ختم ہوگئی مگر آپ کی اسیری کی مدت چھ ماہ رہی۔ دوسری مرتبہ 1971ء میں قیام بنگلہ دیش کے موقع پر گرفتار کرلیا گیا۔ اسیری کی یہ مدت حالانکہ مختصر رہی کل 45 دن ہی قید میں رہے اور رائچور ہی کی جیل میں رہے مگر یہ قید تنہائی تھی جسے مولانا نے نہایت اذیت ناک قرار دیا تھا۔ آپ نے بتایا کہ اس سے آپ کی یادداشت اور بھوک متأثر ہوگئی۔ اس کا اثر آپ پر تادم زیست رہا۔ اور تیسری مرتبہ ایمرجنسی کے موقع پر گرفتاری عمل میں آئی۔ 3/ جولائی 1975ء کو آپ گلبرگہ اور یادگیر کا دورہ مکمل کر کے رائچور واپس ہورہے تھے کہ راستے میں ہی گرفتار کر لیے گئے۔ رائچور میں کچھ عرصہ رکھا گیا پھر گلبرگہ کی جیل کو منتقل کردیا گیا۔ بالآخر 24 مارچ 1977ء کو گلبرگہ سے رہا ہوئے۔ برسر اقتدار طبقے کی عجیب سوچ ہوتی ہے۔ جنگیں سرحدوں پر پڑوسی ملکوں کے خلاف لڑی گئیں اور اندرون ملک ان لوگوں کو گرفتار کرلیا گیا جو ملک اور باشندگان ملک کی بہی خواہی میں سرگرم عمل تھے۔ مارے گھٹنا پھوٹے آنکھ۔

قید و بند کے دوران بالخصوص ایمرجنسی کے 22 ماہ کی قید کے دوران برادران وطن کی مختلف شخصیتوں سے روابط پیدا ہوئے۔ اسلام سے متعلق ان کی غلط فہمیاں دور کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ مولانا فرمایا کرتے تھے کہ قید سے رہائی کے بعد جب آپ دوروں پر جاتے تو وہاں ان ہم اسیروں سے ملاقاتیں ضرور کرتے۔ عقیدت کا یہ عالم تھا کہ وہ لوگ قدم بوسی کے لیے جھک جاتے تھے۔

1990ء میں ادھر آپ نے جماعت کی امارت کی ذمہ داری سنبھالی ہی تھی کہ بابری مسجد کے وجود کو مٹانے کی مہم شروع ہوگئی۔ اور تاریخ کا وہ المناک دن 6/ دسمبر 1992ء بھی آیا جس دن مسجد شہید کردی گئی۔ اس کے بعد فسادات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ فسادات کی روک تھام کے لیے جماعت ہمیشہ جو کام کرتی رہی ہے وہ اس مرتبہ بھی کیے گئے۔ تاہم فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے نہایت موثر اقدامات بھی کیے گئے۔ برادران وطن کی جن اہم شخصیتوں سے

تعلقات قائم ہوئے تھے انہیں ساتھ لے کر فورم برائے جمہوریت اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی قائم کیا گیا۔ جسٹس تارکنڈے اس کے آل انڈیا صدر بنے۔ سپریم کورٹ کے نامور وکیل آر کے گرگ، کلدیپ نیّر، جسٹس راجیند رساچر جیسے لوگوں کو شامل کیا اور ملک بھر میں مہماتی انداز سے دورے کیے گئے۔ میڈیا کے توسط سے بھی اور راست عوامی جلسے منعقد کر کے لوگوں کو سمجھایا گیا۔ ملک کی فضا کو مکدر ہونے سے بچانے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ مسلمانوں سے کہے گئے آپ کے یہ سنہری الفاظ آج بھی کانوں میں گونجتے محسوس ہوتے ہیں ''مایوس نہ ہوں، مرعوب نہ ہوں اور مشتعل نہ ہوں، صبر اور حوصلہ سے کام کریں''۔

اندرونِ خانہ آزمائش:

مولانا فرماتے تھے کہ سن 1955ء سے 1970ء تک 15/سال کا عرصہ ملت کی جانب سے سخت آزمائشوں کا دور رہا۔ مختلف علماء اور مدرسوں سے جماعت کی مخالفت نہایت زور وشور سے کی گئی۔ فتوے صادر کیے گئے۔ اشتہار بازی ہوئی۔ جماعت کے احباب کو زدوکوب کیا گیا۔ جلسوں پر پتھراؤ کرنا، شامیانوں کی رسیاں کاٹ دینا، گلی سڑکوں سے گزرتے وقت گالیاں دینا، مسجدوں سے بے دخل کرنا، درس قرآن کی مجلسوں میں گھس کر قرآن ہاتھوں سے چھین کر پھینکنے اور جلانے تک کی حرکتیں کی گئیں۔ اخبارات، رسائل کے دہانے کھول دیے گئے۔ منبر رسول سے خطابت کے جوہر دکھلائے گئے۔ یہ سب کارِ ثواب سمجھا گیا اور عوام کو سمجھایا گیا۔ چوٹی کے ایک عالم تو یہاں تک ارشاد فرماتے تھے کہ ''اللہ نے مجھے شائد پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ میں جماعت اسلامی کی مخالفت کروں''۔ ان حالات میں جماعت کے قائدین، بالخصوص مولانا سراج الحسن اپنے رفقاء کو یہی سمجھاتے رہے کہ یہ سب کچھ محض غلط فہمیوں کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ ایسے لوگوں سے ملاقاتیں کی جائیں، جماعت کے مقصد و نصب العین اور طریق کاران پر واضح کیا جائے۔ جواباً ان کے خلاف کوئی بات نہ کہی جائے۔ بلکہ ان کے حق میں دعائیں کی جائیں۔ خود بھی مخالفین سے ملاقاتوں کا اہتمام کرتے۔ کبھی جبیں پر شکن آنے نہیں دیتے اور نہ مایوسی کو قریب پھٹکنے دیتے۔ رفقاء کو قرآن کی یہ تاکید یاد دلاتے:

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَ لَا السَّيِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِی هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَالَّذِیْ بَيْنَكَ وَ بَيْنَهُ

عَـدَاوَةٌ كَاَنَّهُ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ •وَمَـا یُـلَـقّٰهَآ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَمَایُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ (حم السجدہ:35-34) ''نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا۔ یہ صفت نصیب نہیں ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر ان لوگوں کو جو بڑے نصیبے والے ہیں''۔

مولانا کی ان نصیحتوں سے ایسا محسوس ہوتا کہ قرآن کی یہ آیتیں گویا اسی موقع کے لیے اسی وقت نازل ہو رہی ہیں۔ مولانا مودودی علیہ رحمۃ نے اس کیفیت کو سلوک قرآنی کہا ہے۔

الحمدللہ حالات بدلے اور بہت بدلے۔ کرناٹک کے ہی ایک مقام پر ایک موقع پر آپ پر پتھر پھینکے گئے تھے اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جب آپ دورے پر آئے تو انہی لوگوں نے راستہ کے دونوں جانب قطار میں کھڑے ہو کر مرحبا کے نعروں سے آپ کا استقبال کیا۔ ملک کی بڑی بڑی درس گاہوں میں بھی آپ کا استقبال کیا گیا، نہایت گرم جوشی سے ملاقاتیں ہوئیں، اساتذہ اور طلبہ سے خطاب کرنے کی خواہش کی گئی۔ الحمدللہ ایسا ماحول آج تک برقرار ہے۔

مشفق مربی:

بانی جماعت مولانا مودودیؒ کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ آپ '' قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآن'' کے مصداق تھے۔ آپ نہ صرف قرآن کے عالم اور مفسر تھے بلکہ عامل بھی تھے۔ نبی کریم ﷺ کے سچے پیروکار تھے۔ آپ کی زندگی میں قرآن کا رنگ اور نبی ﷺ کی سیرت کی جھلک غالب تھی۔ تقریباً یہی بات مولانا محمد سراج الحسن کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ آپ قرآن کے مفسر نہیں تھے، لیکن فہم قرآن سے آراستہ تھے۔ باضابطہ عالم نہ تھے لیکن حامل قرآن اور عامل قرآن ضرور تھے۔ شکل و شباہت مولانا مودودی سے ملتی جلتی تھی، اخلاق و عادات میں، مقصد کے حصول کے لیے سعی و جہد میں اپنے آپ کو تھکا دینے والی صفت میں، رفقاء سے تعلق اور ان کی تربیت کے انداز میں بھی دونوں بزرگ ہم رنگ و ہم شکل تھے۔ مولانا مودودی کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے کئی مودودی تیار کیے۔ یہی بات مولانا سراج صاحب میں تھی۔ دوروں میں عموماً اپنے ساتھ چند رفقاء کو بھی لے جاتے جن میں ریاستی اور

مقامی سطح کے ذمہ داروں کے علاوہ عام رفقاء بھی شامل ہوتے۔ افراد کی پہچان، ان کی صلاحیتوں کی پرکھ، انہیں بنا سنوار کر آگے بڑھانے پر خاص توجہ تھی۔ افراد سازی سے متعلق دیگر ذمہ داروں کو بھی حفیظؔ میرٹھی کے اس شعر کے حوالے سے تاکید کیا کرتے تھے ''تو جوہری ہے تو زیبا نہیں تجھے یہ گریز، مجھے پرکھ میری شہرت کا انتظار نہ کر''۔

مولانا کے اندر مردم شناسی اور مردم سازی کا ایک خاص ملکہ تھا۔ آج ملک بھر میں مختلف سطحوں پر موجود ذمہ دارانِ جماعت کی تربیت میں مولانا محترم کا اہم کردار رہا ہے۔ مولانا سے تعلقات اور مولانا کی تربیت کی اتنی داستانیں ہیں کہ اگر وہ جمع کر دی جائیں تو کئی ضخیم جلدیں تیار ہو جائیں۔ سفر میں، نشستوں میں، تفریح میں ہر جگہ رسمی اور غیر رسمی طور پر تربیت کا سلسلہ جاری رہتا۔ سب سے قریب رہتے اور سب کو قریب رکھتے۔ ہمیشہ تاکید کرتے کہ دوسروں کے جماعت میں آنے کے لیے دروازہ بنیں، دیوار نہ بنیں۔ عام ملت میں خطاب کرتے تو یہی بات دوسرے انداز سے یوں فرماتے 'برادران وطن کو اسلام سمجھنے اور اسلام سے قریب ہونے کے لیے مسلمان دروازہ بنیں نہ کہ دیوار'۔

ادب شناس:

مولانا بڑے بزلہ سنج، شگفتہ مزاج، حاضر دماغ اور حاضر جواب تھے۔ ادب سے خاص لگاؤ تھا۔ مطالعہ اس قدر وسیع تھا کہ خود فرماتے 'اچھی خاصی لائبریری دماغ میں جمع ہوگئی ہے'۔ اقبالؔ، اکبرؔ، امجدؔ، حفیظؔ میرٹھی کے دیوان پی چکے تھے۔ سلیمان ندوی، شبلی نعمانی، وغیرہم کو بھی پڑھا کرتے تھے۔ گفتگو اور خطابات میں اشعار نگینوں کی طرح استعمال کرتے تھے۔ اقبال کے وہ اشعار بطور خاص جو آیات قرآنی کے ترجمان تھے، تقریر میں آیات اور اشعار ساتھ ساتھ پیش کر کے اپنے مدعا کو موثر انداز میں پیش کرتے تھے۔ بات سے بات نکالنے اور اہم نکات کی باریکیوں کو ریشمی دھاگے کے تاروں کے مانند ملائمت سے کھول کر پیش کرتے۔ دو دو الفاظ کے مرکبات سے گفتگو مزین ہوتی تھی، گویا الفاظ خود تخلیق کر رہے ہوں۔ مثلاً بعض لوگوں کی سرد مہری پر فرماتے وہ 'متحرک جمود' کا شکار ہیں۔ بجا طور پر آپ کو ادب شناس کے ساتھ ادب ساز بھی کہا جا سکتا ہے۔ جماعت میں تنظیمی ممبر شپ سے پہلے کے مرحلوں کے لیے 'ہمدرد'، 'متفق' اور 'کارکن'

کی اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں۔لوگ اپنا تعارف کراتے ہوئے بتاتے ہیں کہ وہ کیا ہیں، آیا ہمدرد یا متفق یا کارکن یا رکن۔ ایک بزرگ نے ایک مرتبہ کہا کہ میں 40 سالوں سے جماعت کا ہمدرد ہوں تو مولانا نے فرمایا یہ کیسی ہمدردی ہے کہ چالیس سالوں سے صرف ہمدرد ہی چلے آرہے ہیں، آگے نہیں بڑھ رہے ہیں، یہ تو ہمدردی نہیں بے دردی ہے۔

تاریخ شناس:

اسلامی تاریخ آپ کے مطالعہ کا اہم موضوع تھا۔ تاریخ کے صفحات گویا ہتھیلی کی لکیروں کے مانند آپ کے روبرو تھے۔ گفتگو میں ملت کے عروج وزوال کے اسباب پر روشنی ڈالتے اور تاریخ سے سبق حاصل کرنے کی تلقین فرماتے۔ ہندوستان کی تاریخ، خصوصاً تاریخ دکن، میسور کی تاریخ سے اکثر حوالے دیتے۔ٹیپو سلطان شہیدؒ سے خاص لگاؤ تھا۔ تاریخ فرشتہ، ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، ابن بطوطہ، ابن خلدون وغیرہ کے صفحات گویا ازبر تھے۔ جماعت کے لٹریچر کے علاوہ دیگر علماء کی تحریریں اور جدید عناوین پر کتابوں کے مطالعہ پر ہمیشہ زور دیتے تھے۔ مطالعہ کے سلسلہ میں آپ کی خاص ہدایت ہوتی کہ 'ترتیب، تسلسل اور تکرار' کا اہتمام کیا جائے۔ یعنی کیا پڑھنا ہے اس کا نصاب بنالیں، اس میں اپنے طبعی میلان کے علاوہ تحریکی فکر اور مزاج پیدا کرنے والی کتابوں کی نشاندہی کرلینا، پھر جو بھی پڑھنے کے لیے لیں، سلسلہ وار پڑھیں، اور پڑھی ہوئی کتابیں بھی بار بار پڑھیں۔ اس سلسلہ میں بانی جماعت مولانا مودودی کی مثال بتاتے کہ وہ اپنی لکھی ہوئی کتابیں خصوصاً جو تحریک کا بنیادی لٹریچر کہی جاتی ہیں خود بھی بار بار پڑھتے تھے۔

آگاہ وباخبر:

حالات سے ہمیشہ باخبر رہنے کا اہتمام کرتے۔ اخبار بینی اور رسائل کے مطالعہ کے علاوہ بی بی سی کی خبریں پابندی سے سنتے تھے۔ سفر میں بھی یہ معمول متاثر نہ ہوتا۔ اپنے ساتھ ایک ٹرانسسٹر رکھتے۔ جب بی بی سی سنتے یکسوئی کے ساتھ سنتے۔ اس درمیان کسی سے بات چیت کرنا پسند نہیں تھا۔ سہ روزہ دعوت اور ماہنامہ زندگی بھی پابندی سے زیر مطالعہ ہوتے۔ ڈاک کی مہربانی سے سہ روزہ دعوت کے دو چار شمارے جو اکٹھے پہنچتے دوران سفر مطالعہ کے لیے رکھ

لیتے۔ اہم خبروں پر دیگر اخبار بین حضرات سے تبادلہ خیال بھی فرماتے۔ کسی مقام کی خبر سے متعلق مزید معلومات کی ضرورت محسوس ہوتی تو وہاں کے جماعتی ذمہ داروں سے رابطہ کر کے حقیقت حال معلوم کر لیتے۔ مختلف امور میں حکومت کا موقف، دیگر دانشوروں کا نقطہ نظر جاننے کی کوشش کرتے اور اسلامی نقطہ نظر سے ان کا تجزیہ کرتے۔ سنی سنائی باتیں اور ادھوری معلومات پسند نہ تھیں۔ مختلف اخباروں کے مدیروں اور سینئر صحافیوں سے ملاقاتوں میں ان کی پالیسی پر گفتگو، تبصرہ، مشورہ کا معمول تھا۔ اچھی چیزوں کو سراہنا اور دوسروں کے روبرو اس کا تذکرہ کرنا بھی آپ کا معمول تھا۔

اخلاق حسنہ: مولانا سراج الحسنؒ کو وقت کا ولی اللہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے۔ بڑے اللہ والے، متقی اور پرہیزگار تھے۔ رات کے راہب اور دن کے شہسوار تھے۔ مصروفیات کے ہجوم میں خدا سے رشتہ مربوط رہتا علاوہ ازیں ذکر و اذکار میں یکسوئی کے لیے وقت کا دامن نچوڑ کر تنہائی کے لمحات نکال لیتے۔ رات کتنی بھی لمبی ہو جائے تہجد کے لیے برابر بیدار ہو جاتے۔ قرآن کی تلاوت اسی سے جڑا ہوا معمول تھا۔ مولانا نہایت شریف النفس، وسیع القلب اور اعلیٰ ظرف والے تھے۔ دل میں کسی سے میل، نہ خلش، نہ کسی سے شکوہ اور نہ کسی سے گلہ تھا۔ کسی کی غیبت سننا بھی پسند نہ تھا۔ اگر کوئی ان کی تعریف کرتا تو بے اعتنائی اور بے تعلقی اختیار کر لیتے۔ ایک مرتبہ بیمار ہوئے، بنگلور میں اسپتال میں زیر علاج رہے۔ ان کے بڑے صاحب زادے نے مکمل چیک اَپ کرا دینا چاہا۔ ماہر قلب سے بھی معائنہ کرایا۔ معائنہ کے بعد ڈاکٹر نے کہا کہ 'میں نے اپنی پوری زندگی میں اتنا پاک اور اچھا دل کسی کا نہیں دیکھا ہے'۔

مولانا کے متعلق یہ رائے قائم کرنا کسی اعتبار سے غلو کے درجہ میں شامل نہیں ہوتا کہ مولانا کو اللہ کا نور حاصل تھا جس سے وہ حالات کو دیکھتے تھے۔ معاملات کی تہہ تک پہنچ کر رائے دیتے اور پیش بینی بھی کرتے جو بیشتر مواقع پر صادق آئی ہے۔ اہل مغرب کی بعض خصوصیات کے معترف تھے اور آپ کی یہ پیش بینی ہے کہ دنیا میں اب اسلامی انقلاب مغرب ہی سے آئے گا۔ اللہ کرے کہ یہ بات بھی صادق آئے۔

سبق آموز زندگی

ڈاکٹر بلگامی محمد سعد، امیر حلقہ، جماعت اسلامی ہند، کرناٹک

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مولانا محمد سراج الحسن صاحب ایک ہمہ پہلو، نابغۂ روزگار اور قد آور شخصیت تھے جن کی رحلت سے تحریک اسلامی، ملت اسلامیہ اور ملک عزیز کو بہت بڑی محرومی ہوئی ہے اور بظاہر اس کی تلافی مشکل معلوم ہوتی ہے۔ اللہ وحدہ لاشریک سے ان کی مغفرت و ترقیٔ درجات کی اور ملت کونعم البدل نصیب فرمانے کی دعا ہے۔

راقم کو مولانا سے ملاقات و استفادہ کا موقع 1972 سے رہا ہے۔ ہائی اسکول کے طالب علمی کے زمانے سے لے کر، حلقہ کے اجتماع ارکان، مقامی امارت، شوریٰ اور مختلف ملاقاتیں دورے اور اجتماعات و مہمات میں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ UK قیام کے دوران بھی ساتھ رہنے اور معالج کی حیثیت سے بھی بارہا افادہ واستفادہ کا موقع ملتا رہا۔ ذیل میں کچھ نکات کی شکل میں مولانا کی زندگی سے کچھ سبق جو سیکھے جاسکتے ہیں ان کا ذکر کیا جارہا ہے۔ پوری شخصیت کا احاطہ مشکل ہے مگر کچھ اہم باتوں کا تذکرہ ضرور ہوجائے گا:

(ا) **بامقصد زندگی**: مقصد کی تلاش اور اطمینان ہوچکنے پر پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے آپ کو اس کے لیے لگا دینا اور ہر دوسری چیز کو ثانوی و تابع بنادینا مولانا کی زندگی کا سب سے بڑا سبق ہے۔ ارادہ کی مضبوطی، استقامت اور ہر قربانی کے لیے تیار رہنا آپ کی زندگی کے نمایاں اوصاف ہیں۔ جاگیر، دولت، آسائش کو قربان کرتے ہوئے راہ حق کی آزمائشوں کو خندہ پیشانی سے جس طرح آپ نے قبول کیا وہ ایک روشن مثال ہے۔

(۲) **اخلاق و کردار**: مومنانہ کردار و اخلاق کے کئی اوراق مولانا کی زندگی میں ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔ توازن، انکساری، سادگی، امانت داری، صبر و ضبط، تواضع، احسان، خلوص و محبت، ایثار و قربانی، قدردانی و قدر افزائی، خدمت و رفاقت، عدل و انصاف، وغیرہ وغیرہ۔ آپ مرجع خلائق اور اعلیٰ اوصاف کے مالک تھے۔ بیت المال کے حسابات میں چار آنے کے سلسلہ میں میں نے خود ان کو اور مرحوم جعفر منیار صاحب کو باہم تکرار و پیش قدمی کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ کسی دورے کے موقع پر ان کے جبّہ (جو پرانا ہوجانے کی وجہ سے پھٹ گیا تھا) کو میں نے رفو کروایا ہے۔ کسی سابق رکن جماعت کی دلجوئی کے لیے آگے بڑھ کر مالی تعاون و انتظام انہوں نے کیا۔ اپنے ڈرائیور اور دربان کے ساتھ ان کا حسن سلوک ضرب المثل تھا۔ صبر و ضبط کا یہ عالم تھا کہ مولانا مودودیؒ کے جنازہ میں شرکت کے دوران لوگوں نے دیکھا کہ ان کے آنسو رواں نہ ہوئے۔ قید و بند کی صعوبتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ ہر ایک سے ایسا ٹوٹ کر ملتے اور محبت کا اظہار کرتے کہ سامنے والا متاثر ہوجاتا۔ کبھی کسی رفیق سے بھی ناگواری کا اظہار نہ کیا۔ ہر ایک کو وقت دیتے اور پوری توجہ سے اس کی بات سنتے۔ پوری سنجیدگی سے حل تجویز فرماتے اور برابر فالو اپ کرتے۔ ایک موقع پر کسی بڑے VIP کی عیادت کے بعد لوٹ رہے تھے کہ معلوم ہوا کہ کوئی اور معمولی کارکن بھی admit ہیں تو دوبارہ لوٹ کر ان کی عیادت کر آئے۔

(۳) **دعوت**: مولانا نے دعوت کی اہمیت کو اس قدر اجاگر کیا کہ ملک بھر میں اس جانب جماعت کی سرگرمیاں تیز تر ہوگئیں اور ہر بڑی ریاست میں دارالاشاعتوں نے نمایاں کارنامے انجام دیے۔ ملت کے اندر بھی یہ جذبہ پروان چڑھا۔ برادران وطن کی بڑی شخصیتوں کے اسلام اور قرآن کے سلسلہ میں تأثرات بیان کرتے تو سماں بندھ جاتا۔ ملک میں بھلائیوں کے فروغ اور برائیوں کے ازالہ اور اخلاق کی تعمیر کے حوالہ سے مختلف مذاہب کے نامور ذمہ داران سے پُر اثر ملاقاتیں ہوتیں۔ دھارمک جن مورچہ کا کام افسوس کہ اس سطح پر پھر جاری نہ ہوسکا۔ متعصب لوگوں کے سلسلہ میں بھی مولانا اکثر فرماتے کہ ذرا کھرچیں تو ان کی انسانیت نکھر کر آئے گی۔

(۴) **منصوبہ بندی:** مولانا کسی مقام کا بھی دورہ کرتے تو وہ ایک یادگار event بن جاتا۔ ہفتوں اور مہینوں پہلے سے پروگرام بنتا۔ متعلقہ مقام کے ذمہ داروں سے اکثر بالمشافہ بات چیت ہوتی اور تفصیلی planning ہوتی۔ انفرادی ملاقاتیں، ارکان، وابستگان، معززین، خواتین، طلبہ وغیرہ کی نشستیں لازمی ہوتیں۔ اُس دور میں خطابات عام کا بڑا رواج اور اثر تھا۔ لازماً عمومی دعوت کے لیے خطاب عام کا پروگرام ہوتا۔ دورہ کے بعد فالواپ کے سلسلہ میں خطوط کے ذریعہ ہمت افزائی وتوجہ دہانی ہوتی۔ اِس طرح دورے کام اور اثرات کو بڑھانے کا مؤثر ذریعہ ہوتے۔

(۵) **رابطۂ عامہ کے ماہر:** مولانا کی یہ خصوصی صلاحیت تھی جس میں انہوں نے بہت اونچا معیار قائم کیا جو اکثر جگہ باقی نہیں رکھا جاسکا۔ خصوصاً بنگلور جب بھی تشریف لاتے پہلے سے ملاقاتوں کی فہرست ترتیب پاتی۔ چند ایک رفقاء خاص طور پر اس کے لیے ground work کرتے۔ ملاقات کے لیے الگ سے خاص وقت لیا جاتا۔ چاہے وزیراعلیٰ ہی کیوں نہ ہوں۔ بھیڑ میں اور رواروی میں ملاقات نہیں ہوتی۔ وقت کا خاص خیال رکھا جاتا۔ پورے صبر واطمینان سے سامنے والے کو بات کرنے کا موقع دیتے۔ اس طرح مخاطب کو سمجھنے کا بھی موقع ملتا اور آخر میں اپنی بات رکھنے کا حق بھی بنتا اور مخاطب کے لیے موزوں اور مناسب بات بھی رکھی جاتی۔ کبھی کبھی ایک سے زائد ملاقاتیں صرف بات سننے اور مخاطب کو سمجھنے اور مراسم کے لیے بھی ہوجاتیں۔ آپ کی گرم جوشی محبت وخلوص کی مٹھاس ہر فرد محسوس کرتا۔ اہم شخصیات کے بارے میں برابر معلومات رکھتے اور اہم موقعوں سے پیغام بھی بھجواتے۔ مرکزی مکتبہ کی ڈائری بھجوانے کا ایک طویل زمانے سے قریب تک بھی رواج برابر جاری رہا۔ راوبط میں تسلسل کی اہمیت پر آپ بہت زور دیتے۔ پیغام کی عظمت اور داعی کے وقار اور اخلاقی ساکھ کا خاص خیال رکھتے۔ سیاست داں، سوامی جی اور علمائے کرام آج بھی آپ کی پُر اثر ملاقاتوں کو یاد کرتے ہیں۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی پر حلقہ کرناٹک میں 1984 میں ایک ہفتہ منایا گیا تو اس کا آغاز ودھان سودا کے Banquet ہال میں موجودہ اور سابق وزرائے اعلیٰ اور دیگر وزراء اور دانشوروں کی موجودگی میں ہوا۔ آپ کی personality اور charisma اور خلوص ایسا ہوتا کہ

عام آدمی سے لے کر وزیر اعظم تک متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ شمع محفل کی طرح آپ ہر ایک سے جدا اور ہر ایک کے رفیق رہتے۔

(۶) **اتحاد کے سفیر وسبیل:** مولانا ملّی اتحاد کے پُر زور داعی تھے۔ مسلم پرسنل لا بورڈ اور مجلس مشاورت کے لیے آپ کی خدمات کو بھلایا نہیں جاسکتا۔ اکثر موقعوں پر ان وفاقوں کے انتظام و قیادت کے مراحل میں مولانا کی حکیمانہ صدارت سے معاملات حل ہوتے۔ جماعت اپنی روایات کے مطابق عہدوں سے دور رہتی مگر ملّت کا شیرازہ بکھرنے نہیں دیتی۔

داخلی طور پر جماعت اسلامی میں الیکشن میں شرکت کے موقع پر جب اختلاف آراء شدت اختیار کر گیا تو مولانا نے ملک کے طول و عرض خصوصا شمال کی ریاستوں میں تفصیلی دورے و ملاقاتیں کر کے اختلاف کے باوجود جماعت کو متحد رکھنے اور ٹوٹنے سے بچانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

(۷) **خطابت:** آپ ایک پُر جوش خطیب تھے۔ خطاب کرتے تو پورا وجود بولتا۔ جذبات میں تلاطم پیدا ہوتا۔ سیرت کے واقعات کا حوالہ دیتے تو آنکھیں پُر نم ہو جاتیں۔ جملے ادبی چاشنی لیے ہوئے اور چست ہوتے۔ علامہ اقبال کے اشعار برموقع ہوتے۔ مضمون کا حق ادا ہوتا۔ پورے مجمع پر سحر کا سماں رہتا۔ رفقاء کے لیے آپ کے تربیتی خطابات، سوال و جواب کی نشستیں اور اختتامی خطاب زادراہ کا کام کرتے۔ فکری ہم آہنگی و جذباتی یگانگت پیدا کرنے میں آپ کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ رہنمایانہ کردار، ملک کی خیر خواہی، داعیانہ تڑپ، ہمہ جہت تربیت، اخلاص نیت پر بار بار تاکید فرماتے۔

(۸) **قیادت ساز قائد:** آپ کے اندر قائدانہ صلاحتیں ابھری ہوئی تھیں۔ رفقاء دل و جان سے آپ کی اطاعت کرتے۔ کبھی تلخی و تحکمانہ انداز نہ اختیار کرتے۔ محبت و ملائمت سے وہ کام کروالیتے جو محض حکم کے زور پر ہرگز نہ ہوسکتے۔ نزاعات کو صبر، حکمت اور دلسوزی سے حل کرتے۔ روٹھے ہوؤں کو منانا، بچھڑے ہوؤں کو جوڑنا، رفقاء کی خواہشات و فرمائشوں کی تکمیل، ذاتی معاملات میں دلچسپی لینا یہ سب آپ کی خصوصیات تھیں۔

مردم شناسی اور افراز سازی آپ کی خصوصی مہارت تھی۔ کتنے ہی نوجوانوں کو ان کی صلاحیتوں اور potential کو تاڑ کر انہیں آگے بڑھانا، مسلسل مربیانہ سلوک و رہنمائی سے انہیں نکھارنا، بروقت اصلاح، دوروں اور ملاقاتوں میں ساتھ رکھنا اور اس طرح خاموش فکری و اخلاقی تربیت کا سامان فراہم کرنا۔ یہ سب مولانا کا معمول تھا۔اس وقت جماعت کی جو قیادت ہے وہ سب مولانا کی شفقت و تربیت کی مرہون منت ہے۔شورائیت کی بہترین روایات کو آپ نے قائم کیا۔نقد و احتساب کی نشستوں میں جو کیفیت آپ کے دور میں تھی وہ کم ہی بعد میں نظر آتی ہے۔

(۹) **کچھ حسرتیں:** Hero worship کے خلاف جماعت میں اس قدر زور دیا گیا اور بے لاگ تنقیدوں کا ایسا ماحول پروان چڑھا جو اپنی خوبیاں ضرور رکھتا ہے مگر کبھی کبھی بے اعتدالی بھی دوسری جانب ہوجاتی ہے۔خاص طور پر ہمارے ذمہ داروں کا منصب سے سبکدوش ہونے کے بعد گمنام ہوجانا بھی ایک طرح کا المیہ ہے۔ تمام تر علم و تجربہ کے باوجود ان بزرگوں سے استفادہ کا کوئی منظّم و بہتر انتظام جماعت نہیں کرسکی۔مولانا کے ساتھ بھی ویسی ہی غلطی ہم نے کی۔کاش کہ ان سے بہتر استفادہ جاری رہتا۔

جماعت کی اہم شخصیات کے تجربات، حالات و کوائف کو بھی جمع کرنے کی طرف ہم پوری توجہ نہیں کرسکے۔امید کہ مولانا کے ساتھ یہ ناانصافی نہیں ہوگی۔

شخصیت ساز شخصیت

سراج الدین ندوی، مدیر 'ماہنامہ اچھا ساتھی'

حضرت مولانا علی میاںؒ نے کاروان زندگی (خود نوشت سوانح عمری) میں ریاست کرناٹک کے دورے کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا محمد سراج الحسنؒ کی فعالیت اور ان کی انتظامی صلاحیتوں کا تذکرہ کیا ہے۔

اپنے وقت کے عظیم اسلامی مفکر کا اب سے تقریباً 45 سال پہلے یہ اعتراف کرنا کہ مولانا سراج الحسنؒ بہت فعال و متحرک اور انتظامی صلاحیتوں کے مالک ہیں، مولانا مرحوم کے لیے بڑا خراج عقیدت ہے۔

میں تحریک اسلامی کی جن شخصیتوں سے بہت متاثر ہوا ان میں ایک اہم نام مولانا سراج الحسن صاحبؒ کا بھی ہے۔ ان کا خلوص و بے لوثی، تواضع و انکساری، اپنائیت و ہمدردی، طرز تکلم و حسن بیانی، ابتسام و شگفتہ مزاجی، دل آویزی و دلکشی، ذکاوتِ حس و خاطر داری ان کے ایسے اوصاف ہیں جن کا اعتراف ہر کس و ناکس کو ہے۔

میری ان سے پہلی ملاقات 1979 میں ہوئی۔ ہوا یہ تھا کہ 4 اپریل 1979 کے دن ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی تھی تب ہندوستان میں بھی اس کا ردعمل سامنے آیا تھا خصوصاً مسلم لیگیوں نے جماعت کے دفاتر میں توڑ پھوڑ کی تھی حالانکہ بھٹو کی پھانسی کا کوئی تعلق جماعت اسلامی ہند سے نہیں تھا۔

سہارنپور کے دفتر جماعت واقع پل کمبوہان میں بھی آگ زنی کی گئی تھی۔ یہ خبر سن کر میں بھی سہارنپور پہنچا تھا کیونکہ رفقائے سہارنپور سے میرا گہرا تعلق تھا میری تربیت میں مولانا عطاء الرحمٰن وجدی صاحب نے بڑا اہم رول ادا کیا تھا۔ اس وقت ٹیلیفون وغیرہ کی سہولت مہیا

نہ تھی۔ اخبارات کے ذریعے ہی یہ خبر مجھ تک پہنچی تھی۔ میں جب شام کو سہارنپور پہنچا تو معلوم ہوا کہ مولانا سراج الحسن صاحب اور مولانا عبدالعزیز صاحب مرکز کی ہدایت پر صورتحال کا جائزہ لینے اور رفقاء کی ڈھارس بندھانے کے لیے سہارنپور تشریف لائے ہوئے ہیں۔ اس وقت مولانا سراج الحسن صاحب کرناٹک کے امیر حلقہ اور مولانا عبد العزیز صاحب آندھرا پردیش کے امیر حلقہ تھے۔ عشاء بعد عبیداللہ کاظم صاحب کے بالا خانے پر ارکان اور کارکنان کی میٹنگ ہوئی جس سے دونوں اکابرین نے اپنے مخصوص اور موثر انداز میں خطاب کیا۔

مولانا سراج الحسن صاحب نے تاریخ کے حوالے سے بتایا کہ تحریک کے سفر میں یہ مراحل آتے رہتے ہیں اور یہ آزمائشیں ہی تحریک کا راستہ ہموار کرتی ہیں۔ دوران خطاب آپ نے علامہ اقبال کے کئی اشعار برمحل سنائے، ان میں سے چند اشعار آج بھی میرے ذہن پر ابھر رہے ہیں۔

تندیٔ باد مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے
جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے، اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے، اِدھر نکلے
نہیں نوامید اے اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

مولانا کا ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ ان کی یادداشت بلا کی تھی۔ جب کسی سے ایک بار ملاقات ہو جاتی تو اسے ہمیشہ یاد رکھتے۔ اس پہلی ملاقات کے حوالے سے انہوں نے مجھے بھی ہمیشہ یاد رکھا۔ ہمارے ایک دوست مولانا زبیر ندوی بھٹکلی ہیں انہوں نے ایک بار مولانا کی یادداشت کا تذکرہ کرتے ہوئے مجھے بتایا: "میری ایک سرسری ملاقات مولانا سے سعودیہ میں ہوئی تھی۔ کئی سال بعد جب مولانا سے بھٹکل میں ملاقات ہوئی تو مجھے دیکھ کر فرمایا: "مولانا زبیر صاحب آپ سے تو ہماری پہلی ملاقات سعودیہ میں ہو چکی ہے۔"

مولانا کوئی اعلی تعلیمی ڈگری نہ رکھتے تھے مگر انہوں نے اپنے مطالعہ، تدبر وتفکر، قوت

مشاہدہ وتجزیہ اور ذکاوت حس سے اپنی شخصیت و کردار کو بہت جلا بخشی تھی۔ جماعت اسلامی ہند جیسی منظّم و فعال اور طاقتور جماعت کی قیادت کے لیےان کا انتخاب اس کی بین دلیل ہے۔

غالبًا 1988 کی بات ہے جب علاقہ میرٹھ کے ارکان کا تفہیمی اجتماع تاج پور ضلع بجنور میں ہورہا تھا۔ میں اس اجتماع میں شرکت کے لیے رامپور سے حاضر ہوا تھا۔ اختتام اجتماع پر جب میں نے مولانا سے ملاقات کی تو مولانا نے اپنے بیگ سے ایک کتاب نکالی اور فرمایا:" سراج صاحب آج کل میں آپ کی اس کتاب (رسول خدا کا طریق تربیت) کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ یہ بات اس وقت بھی میرے لیے ایک بڑا اعزاز تھی اور اس کی مہک میں آج بھی محسوس کرتا ہوں جبکہ مولانا ہمارے درمیان نہیں رہے۔ یہ افسوس ہے کہ لاک ڈاؤن کی وجہ سے ان کے جنازے میں شرکت سے محروم رہا۔ اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین۔

مولانا کو مطالعہ کا بہت شوق تھا مرکزی مکتبہ سے جو بھی کتاب شائع ہوتی پہلی فرصت میں اس کا بالاستیعاب مطالعہ کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ اپنے وقت کے دانشوران اور علماء بھی انہیں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ایک سیمینار میں مولانا مجاہدالاسلام قاسمیؒ نے ملاقات کے دوران مجھ سے ان کی خوبیوں کا تذکرہ کیا تھا۔

میں سمجھتا ہوں کہ جب آپ کی سوانح مرتب کی جائے گی تو آپ کے درج ذیل اوصاف وخدمات ضرور بیان کیے جائیں گے:

1۔ مولانا موصوف کو تحریک اسلامی کی قیادت اس وقت سونپی گئی جب تحریک ایک دوراہے پر کھڑی تھی اور الیکشنی سیاست میں حصہ داری کا موضوع اندرون جماعت اضطراب و بے چینی کا سبب بنا ہوا تھا مگر آپ نے نہایت خوش اسلوبی، صبر وتحمل، کسر وانکسار اور حسن تبادلہ خیال اور کثرت مشاورت سے تحریک کو ایک بڑی آزمائش سے بچالیا یہ آپ کے دورِ قیادت کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔

2۔عموماً دیکھا گیا ہے کہ قیادت اپنے گرد اپنے ہم رائے افراد کو جمع کرتی ہے یا اہم ذمہ داریوں پر اپنے ہم رائے افراد کو دیکھنا پسند کرتی ہے مگر آپ نے ایک طرف مولانا محمد شفیع مونسؒ کو نائب امیر بنایا جو الیکشنی سیاست میں شرکت پسند نہیں کرتے تھے دوسری طرف آپ نے

عبدالعزیز صاحب کو نائب امیر بنایا جو الیکشنی سیاست میں فعال شرکت کے حامی تھے تاکہ جماعت کے فیصلوں اور سرگرمیوں میں توازن باقی رہے۔

3۔ آپ نے مولانا سید جلال الدین عمری صاحب کو علی گڑھ سے مستقل مرکز بلا لیا اور انھیں نائب امیر بنایا تاکہ پیش آمدہ تمام امور و مسائل میں ان سے مشاورت اور رہنمائی ہوتی رہے تاکہ تحریک کسی اقدام یا مرحلے پر سرمو شریعت سے انحراف نہ کرسکے۔

4۔ آپ نے علماء اور ذمہ داران مدارس سے گہرے اور خوشگوار تعلقات قائم کیے اس وقت جماعت اور علماء کے درمیان ایک بڑی خلیج پائی جاتی تھی آپ نے اس کو پاٹنے کی کوشش کی چنانچہ جماعت کے تیئں علماء کا رویہ تبدیل ہوتا ہوا نظر آیا۔

5۔ آپ نے غیر مسلم دانشوروں اور دھرم گروؤں سے روابط بڑھائے اور اسلام کے سلسلے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے ہوئے ان کو تحریک سے قریب کرنے کا عظیم کام انجام دیا۔

6۔ آپ نے توازن کے ساتھ مرکز میں بزرگ قیادت اور نوجوان قیادت کا حسین امتزاج پیدا کیا، ایک طرف آپ نے مولانا عبدالرشید صاحب، مولانا عبدالقیوم صاحب، مولانا غلام اکبر صاحب جیسے جہاں دیدہ اور تجربہ کار بزرگوں کی دیدہ وری سے تحریک کو ثمر آور بنایا تو دوسری طرف محمد جعفر صاحب، محمد اشفاق صاحب جیسی فعال و زیرک جواں سال قیادت کے کاندھوں پر تحریک کو آگے بڑھانے کی ذمہ داری ڈالی۔

7۔ مولانا مرحوم کا رویہ ہر تحریکی ساتھی کے بارے میں اس قدر مشفقانہ اور محبت آمیز ہوتا تھا کہ ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ مولانا مجھ سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ میں بھی یہی گمان کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہوں کہ مولانا کو مجھ سے جو محبت اور شفقت تھی شاید کسی سے اتنی نہ تھی۔ 1992 میں جب بابری مسجد کا سانحہ پیش آیا اور جماعت اسلامی پر پابندی لگادی گئی، جماعت کے ذمہ داران کو آہنی سلاخوں کے پیچھے ڈھکیل دیا گیا۔ میرے بڑے بھائی حاجی جمال الدین صاحب کو بھی کئی مہینے تک جیل میں رہنا پڑا تھا۔ یہ کیسا المیہ تھا کہ ہماری ہی مسجد مسمار کی گئی اور ہمیں ہی جیلوں میں ٹھونس دیا گیا جبکہ مجرم آزادانہ دندناتے پھرتے رہے، ہندوستان کی تاریخ

میں یہ سیاہ باب سب سے نمایاں رہے گا۔

جب جماعت کے قائدین رہا ہو کر آئے تو میں ان سے ملنے کے لیے مرکز گیا۔ جب مرکز پہنچا تو نماز عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ میں سیدھے مسجد اشاعت اسلام کی طرف جانے لگا ابھی باہری گیٹ کے اندر داخل ہی ہوا تھا کہ ایک موہوم سی آواز کانوں میں آئی۔ میں اپنی سوچوں میں گم آگے بڑھتا رہا کہ پھر ایک آواز آئی؛ "سراج بھائی! کیا میری آواز بہت ناتواں ہو گی ہے؟" میں نے مڑ کر دیکھا تو محترم مولانا سراج الحسن صاحب تھے، میں ان کی طرف بڑھا مگر وہ مجھ سے زیادہ تیزی سے میری طرف بڑھے اور مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ اس بغل گیری کی حرارت اور خوشبو میں آج بھی محسوس کر رہا ہوں۔

8۔ مولانا کا امتیازی وصف یہ تھا کہ آپ ریاست کرناٹک کے امیر حلقہ رہے ہوں یا مرکزی سکریٹری یا امیر جماعت تمام مناصب پر رہتے ہوئے آپ نے تحریک کی ذمہ داریاں اعزازی طور پر انجام دیں۔ کبھی کوئی مشاہرہ نہیں لیا۔ آپ ایک بڑے زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد اپنے علاقے کے ایک بڑے رئیس تھے، جن سے لوگ قرض لیا کرتے تھے جب آپ پر گھر کی ذمہ داری آئی تو آپ نے تمام لوگوں کا قرض معاف کر دیا اور گھر والوں کو اکٹھا کر کے ان سے عہد لیا کے کوئی کسی قرض کا مطالبہ نہیں کرے گا۔

9۔ آپ نے تحریکی خدمات کے ساتھ ملت کے تحفظ و بقا کے لیے بہت سی کوششیں کیں۔ ملی تنظیموں اور اداروں سے باہمی تعاون کی بہتر شکلیں تلاش کیں۔ مسلم پرسنل لاء بورڈ، مسلم مجلس مشاورت، بابری مسجد رابطہ کمیٹی کی سرگرمیوں میں آپ نے اہم رول ادا کیا۔

مولانا مرحوم کی پیدائش مارچ1933 کو جول گیرہ ضلع رائچور میں ہوئی تھی اور آپ کا انتقال 2 اپریل 2020 سہ پہر کو اپنے گھر پر رائچور میں ہوا۔ سن 2003 کو پلنگ سے گرنے کی وجہ سے آپ کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ 20 مارچ 2020 کو جمعہ کے دن جب آپ غسل خانہ گئے تو وہاں گر گئے۔ شکستہ ہڈی پر دوبارہ ضرب پڑی آپ کو ہاسپٹل داخل کیا گیا چوٹ پر چوٹ اور پھر ضعیف العمری کی وجہ سے بڑے کرب و اضطراب میں چند دن ہاسپٹل میں گزارے۔ طبیعت قدرے سنبھلی تو ڈسچارج کر کے آپ کو گھر لایا گیا مگر وقت موعود آ پہنچا تھا۔

2 اپریل 2020 سہ پہر کو آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اپنے رب کا مطیع وفرمانبردار بندہ اپنے رب سے جا ملا۔

"اے رب کریم! اپنے دین کے خادم کے ساتھ رحم وکرم کا معاملہ فرما اور انہیں جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا فرما اور تحریک اسلامی کو ان کا نعم البدل عطا فرما۔"

آپ نے اپنی زندگی کے 88 سال اس دنیا میں گزارے۔ آپ کے والد کا نام ابوالحسن اور والدہ کا نام بادشاہ بیگم تھا۔ آپ کی اہلیہ خیر النساء صاحبہ چند ماہ قبل ہی اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں انہوں نے پوری زندگی تحریکی امور میں آپ کا بڑا تعاون کیا۔ انہوں نے اولاد کی تربیت بھی اسلامی خطوط پر کی۔ آپ 19 سال کے تھے کہ ایک رفیق نے آپ کا جماعت سے تعارف کرایا۔ آپ نے جماعت کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا، چند سال ہی میں آپ نے جماعت کی رکنیت اختیار کر لی جبکہ آپ کی عمر پچیس سال کی تھی، یہ سن 1957 کی بات ہے۔ اگلے سال ہی 1958 میں آپ حلقہ میسور (کرناٹک) کے امیر بنا دیے گئے پھر مسلسل 26 سال تک کرناٹک کے امیر حلقہ رہے۔ 1984 میں آپ کو امیر جماعت نے مرکزی سکریٹری کی حیثیت سے مرکز بلا لیا۔ آپ 6 ماہ نائب امیر جماعت بھی رہے۔ سن 1990 میں آپ کو مجلس نمائندگان نے امیر جماعت منتخب کیا اور آپ 13 سال تک مسلسل جماعت کی قیادت کرتے رہے۔

مولانا ہم سے رخصت ہو گئے اور ہر شخص کو ایک نہ ایک دن رخصت ہو ہی جانا ہے مگر بہت سے لوگ رخصت ہونے کے باوجود اپنی موجودگی کا احساس دلاتے رہتے ہیں مولانا کی شخصیت بھی ایسے ہی لوگوں میں ہے جو اپنی خوبصورت یادوں، محبت آمیز رویوں اور مخلصانہ سرگرمیوں کے ساتھ ہمیں اپنی موجودگی کا احساس دلاتے رہیں گے۔

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

تحریکی فکر اور تحریکی مزاج

ڈاکٹر محمد معظم علی، کرناٹک

مولانا محترم سے تعارف ہوئے کچھ چھ ماہ ہوئے تھے، دل کھنچا جاتا تھا۔ زیادہ وقت مولانا کے ساتھ گزارنے کی طبیعت چاہتی تھی۔ دورے پر ساتھ رہنے کی خواہش پر ساتھ چلنے کہا۔ محترم محمد جعفر منیار صاحب مرحوم جو مولانا کے بہت قریب تھے، ہم سفر تھے، ایک نیک پر نور شخصیت، مسکراتے چہرے اور محبت کرنے والے دل کے مالک تھے، اللہ غریق رحمت کرے۔ بس کا انتظار رہا، جب بس آئی تو بس بھری ہوئی تھی، کوئی سیٹ خالی نہ تھی۔ مولانا محترم نے اپنا چھوٹا سا بیگ سامان کی جگہ اوپر رکھا اور بس کا ڈنڈا پکڑا اور سو گئے اور خراٹے بھی شروع ہو گئے۔ ایک مسافر نے پریشان ہوکر کہا کہ صاحب آپ گر جائیں گے، بیٹھ جائیے۔ کہا کہ فکر نہ کریے پھر خراٹوں کے ساتھ سو گئے سکنڈس کے اندر۔ کچھ صاحبین نے جگہ دینے کی کوشش کی تو انھیں کاندھا پکڑ کر دبا دیا لیکن ایک صاحب زبردستی مولانا محترم کو بٹھانے میں کامیاب ہو گئے۔ جیسے ہی آپ بیٹھے، ایک چھوٹا سا تکیہ بیگ سے نکالا اور سر کے نیچے رکھ کر پھر نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ میں بے چین تھا کہ مولانا کی آنکھ کھلی تو مولانا کے کام کے ابتدائی حالات معلوم کروں۔ گھنٹہ بھر بعد مولانا جاگے تو مولانا سے میں نے تعجب سے پوچھا کہ مولانا آپ کس خوبی سے ٹھہرے ٹھہرے بس میں سو جاتے ہیں جبکہ بس سڑک کی ناہمواری کا اپنے جھکولوں سے اعلان کر رہی ہے۔ مولانا نے مسکراتے ہوئے کہا "کیا کریں بھائی، لوگ سفر کی تکان مقام پر اتارتے ہیں اور ہم مقام کی تھکاوٹ سفر میں اتارتے ہیں تاکہ تازہ دم ہوکر دوسرے مقام پر پہنچیں جہاں رفقاء تازہ دم بھی رہتے ہیں اور انتظار بھی کرتے رہتے ہیں اور وقت مانگتے ہیں اور ہم وقت دینے نکلے ہیں" ہم سب کے لیے رہنمائی ہے کہ کس طرح مولانا نے اپنے مزاج

کومقصد کی خدمت کے لیے ڈھالا۔

ابتدائی ایام کی تحریکی جدوجہد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ابتدائی زمانے میں لوگوں کو نہ تحریک اسلامی کا تعارف تھا نہ ہی تحریکی افراد کا بلکہ غلط فہمیاں اور نفرت تھی۔ہم تیں، چالیس دن کے دورے پر نکل جاتے تھے اپنا توشہ روٹیوں اور چٹنی وغیرہ کا لے کر اور توشہ اس طرح بنایا جاتا تھا کہ خراب نہ ہونے پائے۔کسی مقام پر پہنچ جاتے،مسجد چلے جاتے،نماز کے بعد چند سمجھدار اور سنجیدہ لوگوں سے ملاقات کر لیتے،تعارف اور پتہ حاصل کر لیتے،کچھ گفتگو کر لیتے پھر آگے بڑھ جاتے۔کسی جگہ قیام کرنا ہوتا تو مسجد ہی میں قیام کر لیتے گرمی اور مچھروں میں۔پھر خطوط کے ذریعہ ربط رکھتے اور ذہن سازی کرتے اور خطوط کے ذریعہ پروگرام بنا کر پھر چند ایک ماہ میں پہنچ جاتے۔اس طرح روابط بڑھتے رہے،تعارف تحریک کا ہوتا رہا،لٹریچر پڑھا جاتا رہا۔کسی کسی مقام پر صاحب حیثیت افراد سے ملاقات کی جاتی تھی۔چند سال بعد ایک مرتبہ گفتگو میں کہا کہ اسٹیٹ میں (60-50) پچاس ساٹھ نوجوان ارکان کی لہلہاتی ہوئی فصل جو آپ کو نظر آرہی ہے،یہ سب صف اول کے لوگوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے،اللہ قبول فرمائے۔آمین

جماعت سے ہمارا دلی طور پر تعلق پیدا ہوئے ایک سال بھی نہیں ہوا تھا اور قانونی طور پر ابھی ہم نہیں جڑے تھے نہ ہی اس طرف ہمارا خیال گیا تھا۔ہم چار میڈیکل طلبہ تھے،1970 کی بات ہے،کیل مقام پر دو روزہ تربیتی اجتماع تھا،ہم کو شرکت کے لیے کہا گیا تھا،ہم بلاری سے کیل پہنچے۔عام تربیتی پروگرام کے بعد ارکان سے مولانا محترم محمد سراج الحسن صاحب امیر حلقہ کی انفرادی ملاقاتیں تھیں۔ہم کو بھی جستجو ہوئی کہ انفرادی ملاقات ہوتی کیا ہے۔خواہش پر مسکراتے ہوئے مولانا محترم نے ہم کو بھی وقت دیا۔گفتگو میں خاندان کے حالات معلوم کیے اور نصیحت کی کہ ہمیشہ والدین کو خوش رکھنا،اطاعت کرنا اور بھائی بہنوں اور عزیز و اقارب سے تعلقات اچھے رکھنا۔قرآن اور لٹریچر کے مطالعہ کی طرف توجہ دلائی۔لٹریچر کے مطالعے کی طرف رہنمائی فرماتے ہوئے کہا تین ''ت'' یاد رکھو۔ترتیب،تسلسل اور تکرار۔

تحریک و دین کی خدمت کے لیے کس طرح آپ نے اپنے آپ پر کنٹرول حاصل کیا

بیان کرنا چاہوں گا۔ چونکہ دوروز سے مسلسل مصروف تھے، مجھ سے انفرادی ملاقات کے دوران آپ کو نیند کا غلبہ ہوا، لیکن نیند سے لڑتے ہوئے کچھ دیر گفتگو جاری رکھی۔ جب غلبہ شدید ہو گیا تو مجھ سے اجازت مانگی کہ انھیں صرف پانچ منٹ دیے جائیں، انداز عاجزانہ تھا۔ یہ کہا اور سر سے ٹوپی نکالی اور لیٹ گئے اور خراٹے شروع ہو گئے۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ یقین مانئے ٹھیک پانچ منٹ بعد بغیر الارم کے اٹھ بیٹھے، ٹوپی سر پر رکھی اور بات وہیں سے جاری رکھی جہاں چھوڑا تھا۔ یہ تھا ان کا اپنے آپ پر حکومت کرنا اللہ کی رضا کی خاطر۔ سبحان اللہ۔

مولانا محترم سے ملاقات کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد مولانا محترم کا دورہ بلاری تھا۔ صبح 9 بجے میڈیکل طلبہ کے ساتھ اجتماع تھا، پھر ظہر سے پہلے معززین کی نشست تھی گھنٹہ بھر کے لیے، لیکن ایک صاحب کے سوالات اور بحث کی بنا پر آدھا گھنٹہ مزید طول کھینچا۔ اختتام پر تمام لوگ اٹھ کر مولانا محترم سے مصافحہ کرتے رہے۔ جو صاحب بحث کر رہے تھے ان سے گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے مولانا محترم نے مسکراتے ہوئے کہ کہ بھائی ہم برف کے بنے ہوئے ہیں۔ ہمارے لیے سوالیہ نشان تھا کہ مولانا ان صاحب سے ایسا کیوں کہا۔ نماز کے بعد مولانا سے پوچھا گیا تو کہا کہ ان صاحب کے سوالات اور انداز گفتگو سے معلوم ہو گیا ہم کو اپنے تجربات کی بنا پر کہ یہ صاحب قادیانی ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ہمارے وقار کو پبلک میں گرادیں۔ اس لیے ایک داعی کو ٹھنڈے دل ودماغ سے باطل کی چالوں کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔

پھر رات مولانا محترم کے ساتھ چند میڈیکل طلبہ کی غیر رسمی ملاقات رہی، بہت سے مسائل اور سوالات زیر گفتگو رہے۔ تقریباً دو بجے رات تک یہ نشست چلتی رہی۔ پورے جوش وجذبہ اور دلچسپی سے نوجوان مولانا محترم کو سنتے بھی رہے اور بولتے بھی رہے۔ میں مولانا محترم کے قریب ہی لیٹ گیا۔ ایک گھنٹہ بعد اچانک میری آنکھ کھلی تو مولانا کو بستر پر نہیں پایا۔ نظر گھمائی تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا محترم جانماز پر نماز میں مشغول ہیں۔ یقیناً ہم نوجوانوں کے لیے ضرور دعا کی ہوگی اور اللہ نے سن لی۔ اور الحمد للہ ایک سال کے اندر ہی رکن جماعت بننے کی توفیق اور نعمت حاصل ہوئی، اور کچھ عرصے بعد میرے ساتھ ڈاکٹر مقبول احمد مرحوم بھی رکن بن گئے۔

دوعیدین مولانا محترم کے ساتھ ان کے آبائی مقام جولگرہ، تعلقہ مانوی اور ضلع رائچور میں منانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ مقامی مسجد میں امامت آپ خود ہی فرماتے تھے۔ فجر کے بعد کتاب ہدایت قرآن کا مطالعہ فرماتے، پھر رفقاء کو خطوط لکھتے۔ مولانا محترم کو قریب سے دیکھنے اور تربیت اور بہت سی باتوں کے تعلق سے شرح صدر حاصل کرنے کا موقع ملا۔

بہت سے حقائق کو بہت ہی مختصر جملوں میں بیان کرنے کا اللہ نے ملکہ دیا تھا۔ ایک مرتبہ خطاب عام میں ہندوستان میں رشوت کی گرما گرمی کا نقشہ یوں کھینچا، کہا ''میرا ہاتھ اس کی جیب میں اور اس کا ہاتھ میری جیب میں''۔ ایک مرتبہ دوران گفتگو کہا'' کائنات میں ہر لمحہ ہر چیز کو تغیر ہے، اگر ثبات کسی چیز کو ہے تو وہ تغیر ہے''۔ پھر اپنی بات کو دوران تقریر واضح کرنے اور اس میں حسن پیدا کرنے اور دلکش بنانے کے لیے اشعار کا سہارا لیتے، خصوصاً علامہ اقبالؒ کے اور اشعار انھیں برجستہ یاد آجاتے تھے۔

ویسے اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان میں نرمی، مٹھاس اور دل میں خلوص رکھا تھا۔ اس موقع پر اپنے تمام محسنین کے لیے دعائے خیر و مغفرت کرنا اپنا اخلاقی و دینی فریضہ سمجھتا ہوں کہ سب تحریک اسلامی میں بڑھے ہوئے ہیں۔ چند قریبی احباب و محسنین کو یاد کرنا ان کی خوبیوں کے ساتھ دل کہتا ہے۔ محمد فہیم الدین بیدر، سراپا اخلاص و تحریک، مولوی محمود خاں صاحب مرحوم سابق امیر حلقہ کرناٹک۔ سراپا محبت، اخلاص، تحریک و تحریکی بصیرت، دیہاتوں میں مساجد کو دوبارہ تعمیر کرنے والی شخصیت، اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے، کیل کے تمام احباب جو اس وقت سب سے بڑی جماعت تھی کرناٹک میں اور ہم میڈیکل طلبہ کے لیے تربیت گاہ کا مقام رکھتا تھا، بلاری میں ڈاکٹر بلگامی کے والد اور بھائیوں نے بڑا ساتھ دیا، اپنے والدین کو بھی یاد کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کی خاموش مدد رہی۔ پھر مولانا محترم کے فرزندان و بھانجے صاحبان جو پیکر و محبت و خلوص ہیں، ہمارے لیے اور مولانا خوش تھے، اپنے بچوں اور بھانجوں سے ان کی خدمت سے۔ اللہ تعالیٰ مولانا محمد سراج الحسن صاحب سے راضی اور خوش ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کی عطا و بخشش سے راضی و خوش ہو۔

نرم دل انسان

توفیق اسلم خان، رکن مرکزی مجلس شوریٰ، جماعت اسلامی ہند
مبنی بر گفتگو: ایم۔آئی شیخ، بشیر شیخ

جماعت اسلامی ہند کے تیسرے امیر مولانا سراج الحسن صاحب رائچور کرناٹک میں مورخہ 2 اپریل 2020 کو شام 6 بجے داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔آپ کی پیدائش 3 مارچ 1933 کو ہوئی تھی۔آپ 1958 سے 1984 تک جماعت اسلامی ہند کرناٹک کے امیر حلقہ رہے، 1984 سے 1990 تک جماعت اسلامی ہند کے سکریٹری رہے۔ 1990 سے 2003 تک آپ جماعت اسلامی ہند کے امیر جماعت رہے۔اسکے علاوہ آپ نے آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے نائب صدر کی حیثیت سے نمایاں خدمات انجام دیں۔مولانا سراج الحسن صاحب کے دیرینہ رفیق اور جماعت اسلامی ہند مہاراشٹر کے سابق امیر حلقہ توفیق اسلم خاں صاحب جو فی الحال جماعت کی مرکزی شوریٰ کے رکن ہیں کہتے ہیں کہ مولانا سراج الحسن صاحب سے میری پہلی ملاقات 1987 میں ہوئی تبھی سے میرا ان کے ساتھ گہرا تعلق رہا ہے اور میں ذاتی طور پر مولانا کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا میری ذات پر انہوں نے بہت گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔سن 1989 میں ایس آئی او کا کل ہند صدر منتخب ہوا اس وقت جماعت کے امیر مولانا ابواللیث اصلاحی صاحب تھےلیکن کچھ عرصہ بعد مولانا سراج الحسن صاحب امیر جماعت منتخب ہوئے اور وہ ایس آئی او کے سرپرست اعلیٰ تھے اس وقت دوسال ان کی رفاقت نصیب ہوئی۔ اس کے علاوہ میں مرکز جماعت میں سن 1999 سے 2002 تک اسسٹنٹ سکریٹری رہا اس وقت کم وبیش چار سال کی رفاقت نصیب ہوئی، اتنا لمبا عرصہ مولانا کی صحبت میں گزارنے کی وجہ سے مجھے مولانا کو بہت قریب سے جاننے کا موقع ملا۔

مولانا سراج الحسن صاحب بہت زیادہ محبت کرنے والے نرم دل انسان تھے، ان سے پہلی ملاقات میں ایسا محسوس ہی نہیں ہوتا کہ آپ ان سے پہلی مرتبہ مل رہے ہیں، یوں لگتا جیسے برسوں کی شناسائی ہے،اسلامی تعلیمات سے آپ کی واقفیت کمال درجہ کی تھی جب بھی کسی موضوع پر بات کرتے اس کا حق ادا کر دیا کرتے تھے اور بہت بڑے نظریات کو آسان کر کے پیش کر دیا کرتے تھے، سخن دلنواز تھا، آواز میں بلا کی کشش، روانی اور سلاست تھی، تقاریر میں منظر کشی ایسی کرتے کہ سماں بندھ جایا کرتا، اگر وہ اپنی تقریر میں جنگ بدر کا ذکر کر رہے ہوں تو سننے والے کو یوں محسوس ہوتا کہ وہ خود میدان جنگ میں ہے۔

مولانا کی ذاتی زندگی ہم سب کے لیے نمونہ تھی، زندگی بھر تہجد گزار رہے روزانہ صبح ساڑھے تین بجے اٹھتے اور ہر موسم میں ٹھنڈے پانی سے نہایا کرتے، ہر سال رمضان میں دس دنوں کا اعتکاف کرتے، جب آپ امیر جماعت رہے تب بھی آپ ہر سال باقاعدگی کے ساتھ اعتکاف کرتے رہے،اس کے علاوہ ہمیشہ شوال کے چھ روزوں کا بھی اہتمام کیا کرتے تھے۔آپ کا مطالعہ بہت وسیع تھا، عربی سے اردو میں ترجمہ ہونے والی بہت سی کتابیں آپ کو ازبر تھیں۔ جب آپ بات کرتے تو آپ کی بات سے اس گہرے مطالعہ کا اثر جھلکتا تھا،آپ اپنے مطالعہ کی گہرائی اور کمال حافظہ کی وجہ سے چلتی پھرتی اسلامی یونیورسٹی معلوم ہوا کرتے تھے۔

چاروں مسالک کے علماء سے آپ کے گہری عقیدت تھی، ملک کی تمام ہی بڑی درسگاہوں اور بڑے علماء کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کے لیے آپ نے بہت کاوشیں انجام دیں۔آپ نے بہ نفس نفیس تمام ہی بڑے مدارس کا دورہ کیا جب مولانا دیوبند گئے اس وقت میں آپ کے ساتھ ہی تھا۔ دیوبند کے دونوں مدرسوں میں آپ گئے اور سبھی سے ملاقات کی۔ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے نائب صدر کی حیثیت سے بابری مسجد ایکشن کمیٹی میں بہت اہم رول ادا کیا۔اس کے علاوہ 1964 میں جب مسلم مجلس مشاورت کا قیام عمل میں آیا اس میں مولانا نے کلیدی رول ادا کیا تھا۔

بحیثیت امیر جماعت آپ نے قرآن کے ہندوستان کی تمام بڑی زبانوں میں آسان ترجمہ کے اہم کام کی جانب توجہ کی اور اس کام کو آپ نے بہت ہی انہماک سے انجام دیا اور

قرآن کی تعلیمات کو تمام انسانوں تک پہنچانے کا اہم کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔1992 میں قرآن مجید کا مراٹھی ترجمہ بھی آپ ہی کی کاوشوں سے انجام پایا۔

مولانا کی ایک اور اہم خصوصیت یہ تھی کہ آپ مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم مذہبی رہنماؤں کے درمیان بھی مقبول تھے۔ شنکرا چاریہ، سوامی اگنی ویش، والس تھامپو، گرنتھی منجیت سنگھ صاحب سے آپ کے برادرانہ تعلقات تھے ان سبھی کو ساتھ لے کر مولانا نے 'دھارمک جن مورچہ' کی بنیاد ڈالی اس طرح ایک اہم پلیٹ فارم قائم ہوا۔

جب مولانا امیر جماعت تھے اس وقت قرآن پریچے سمیلن، اور قرآن مجید کے تعارف کے لیے ہفتہ، پندرہ روزہ مہمات منائی جاتی تھیں جس کی وجہ سے قرآن مجید برادران وطن تک پہنچانے کا مزاج بنتا تھا۔ مولانا برادران وطن کے مذہبی پروگرامس میں بھی شرکت کرتے اور ان تک اسلام کی تعلیمات پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کرتے۔

مولانا سے بات کرتے وقت ان کے مطالعہ اور علمی قابلیت کا اندازہ ہوتا تھا، ایک مرتبہ والدین کے حقوق اور بچوں کے ان سے تعلقات کیسے ہوں؟ اس موضوع پر بات کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ اگر کوئی شخص بہت بڑا عالم و فاضل ہو، اس کا مطالعہ بہت اچھا ہو، اور قرآن و حدیث کا مطالعہ بھی بہت پائے کا ہو لیکن اگر اس کے تعلقات اپنے والدین سے اچھے نہ ہوں تو وہ دنیا و آخرت میں ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اور نہ ہی وہ شخص جنت میں داخل ہوسکتا ہے۔ ایسے ہی وہ اپنے ساتھیوں کی تربیت کیا کرتے تھے، ان غیر رسمی نشستوں میں جو باتیں وہ کہتے ان کے گہرے اثرات تمام ہی ساتھیوں پر مرتب ہوتے تھے۔

فروری 1981 میں کیمیکل انجینئرنگ کے تیسرے سال میں زیر تعلیم تھا اس وقت جماعت کے کل ہند اجتماع کا اعلان ہوا اتفاق سے جن تاریخوں میں کل ہند اجتماع تھا انہی تاریخوں میں ہمارے امتحانات آگئے، میں اور لاتور کے سلیم پٹیل بڑے پریشان ہوگئے کہ اب کیا کیا جائے؟ امتحان دیں یا اجتماع میں جائیں؟؟ ایک سوچ تو یہ تھی کہ سمسٹر امتحان ہے اس دفعہ امتحان نہیں دیتے ہیں اور اجتماع میں چلے جاتے ہیں اور اگلے سمسٹر میں باقی پرچے بھی دے دیے جائیں۔ ہم دونوں اسی ادھیڑ بن میں مولانا کے پاس پہنچے اور تفصیل سنائی۔ میں نے کہا کہ ہم اجتماع میں

آنا چاہتے ہیں لیکن لوگ یہ کہہ رہے ہیں تمہارا پہلا کام امتحان دینا ہے، اور جماعت آپ کو امتحان چھوڑ کر اجتماع میں جانے کا کیسے کہہ سکتی ہے؟ اس پر مولانا نے کہا کہ جماعت اسلامی ہر قسم کی قربانی چاہتی ہے، اور کہا کہ تم امتحان بعد میں دے سکتے ہو، اجتماع میں شرکت کرو۔ ہم نے اجتماع میں شرکت کی تیاریاں مکمل کیں اور جس دن میں اور سلیم پٹیل صاحب اجتماع کے لیے روانہ ہو رہے تھے اسی دن انڈین ایکسپریس میں یہ خبر شائع ہوئی کہ یونیورسٹی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جن طلبہ کی پڑھائی نہیں ہوسکی ہے وہ ایک ماہ بعد بھی امتحان دے سکتے ہیں اور یونیورسٹی کی تاریخ میں یہ پہلی مرتبہ تھا کہ دو مرتبہ امتحان لیے جا رہے تھے، ہم دونوں بہت خوش ہوئے اجتماع گاہ پہنچ کر ہم نے مولانا کو تفصیلات بتائیں تو مولانا بہت خوش ہوئے اور کہا کہ تمہارا معاملہ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح ہوگیا، اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم سے قربانی کا مطالبہ کیا اور وہ جب تیار ہو گئے تو اللہ نے ان کے فرزند کو بچا لیا اس طرح انہیں قربانی کا ثواب بھی ملا اور ان کا فرزند بھی مل گیا۔ اسی طرح آپ کو قربانی دینے کا ثواب بھی مل گیا اور آپ کے امتحانات بھی ضائع نہیں ہوئے۔ مزید کہا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آزماتا ہے وہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ میرے بندے میری خاطر قربانی دینے کے لیے تیار ہیں یا نہیں، اگر وہ تیار ہو جاتے ہیں تو انہیں پریشانی میں نہیں ڈالتا بلکہ نواز دیتا ہے۔ یہ واقعہ اور اس سے ملا ہوا سبق مجھے آج بھی یاد ہے اور میں تاحیات اسے بھلا نہیں سکتا۔

ایک مرتبہ میں نے ان سے کہا کہ مولانا آپ اتنے اچھے ہیں تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کتنے اچھے ہوں گے۔ اس پر انہوں نے کہا کہ ہم تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیر کی دھول کی بھی برابری نہیں کر سکتے۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ جب آپ صلی اللہ وعلیہ وسلم کے وصال کے 1400 سال بعد ان کے پیروں کی خاک اتنی اچھی ہوسکتی ہے تو آپ صلی اللہ وعلیہ وسلم کی کیا شان ہوگی۔

مولانا کو دیکھتے ہی اللہ کی یاد دل میں تازہ ہو جایا کرتی تھی۔ ان کی جیسی شخصیت میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھی، ان کا سانحہ ارتحال اسلامی دنیا کا بہت بڑا نقصان ہے۔ آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مولانا کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین!!

ذکر ایک شام کا

ڈاکٹر محی الدین غازی، مدیر ماہنامہ زندگی نو، نئی دہلی

سابق امیر جماعت اسلامی ہند مولانا سراج الحسن صاحب مرکز جماعت کو الوداع کہنے سے ایک روز قبل عشائیہ کی دعوت پر ایس آئی او ہیڈ کوارٹرز کی عمارت میں تشریف لائے۔ طلبہ تنظیم کی تشکیل اور اس عمارت کی تعمیر دونوں میں آپ کا کلیدی رول تھا۔ طلبہ تنظیم کی تشکیل کے سلسلے میں جو کمیٹی بنائی گئی تھی، اس کے آپ کنوینر تھے اور عمارت کا افتتاح آپ کے ہاتھوں ہوا تھا۔ تنظیم بارہ سال سے آپ کی زیر سرپرستی اور عمارت بارہ سال سے آپ کے پڑوس میں تھی۔ جماعت اسلامی کی امارت اور ایس آئی او کی عمارت دونوں سے تعلق کی مدت برابر رہی۔

عشائیہ کی تقریب زندگی آمیز بھی تھی اور زندگی آموز بھی۔ وقت واقعات سنانے کا تھا اور موقعہ تجربات منتقل کرنے کا۔ اور یہ دونوں تقاضے خوب صورت توازن کے ساتھ پورے کئے گئے۔ توازن آپ کی شخصیت کا نمایاں پہلو ہے۔ متوازن شخصیت آپ کی پسند ہے اور توازن آپ کی گفتگو کا خاص عنوان۔ کہنے لگے ''توازن کو کھونا نہیں چاہیے حقیقت پسندی اور حق پسندی آپ کا شعار بن جائے۔'' مولانا کی توازن پسندی کا سرچشمہ تلاش کیا گیا اور اس کا انکشاف بھی انھی کے الفاظ سے ہوا ''عصر حاضر میں میرے چار امام ہیں مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، علامہ اقبال اور سید سلیمان ندوی'' گفتگو کا توازن برقرار رکھنے کے لیے کچھ اور الفاظ آگے بڑھے۔ ''کسی شخصیت کی عقیدت میں نہ بصیرت سے محروم ہونا چاہیے نہ بصارت سے محروم ہونا چاہیے۔'' توازن پر بات بڑھی تو دلنشین انداز میں کہا ''اعتدال و توازن کا یہ مزاج توجہ کا بھی طالب ہے اور سعی و جہد کا بھی طالب ہے۔''

بزرگوں اور نوجوانوں کے درمیان عمر کا خلا ظرافت سے پر کیا جاتا ہے۔ خالص سنجیدہ گفتگو نوجوانوں کی ضرورتوں کو تو پورا کرسکتی ہے لیکن اس کی خلا کو پر نہیں کرتی، دور سے مشورہ باری ہوتی ہے تو نشانہ چوک بھی جاتا ہے۔ مولانا کی سنجیدہ باتوں میں ظرافت کی آمیزش محفل کو پرلطف و پر بہار بنا رہی تھی۔

کبھی لگتا تھا کہ وہ ہماری کم سنی میں شریک ہیں اور کبھی لگتا کہ وہ ہمیں اپنی سن رسیدگی کی سیر کرا رہے ہیں۔ سیر کراتے ہوئے وہ ہمیں قطر لے گئے کار ڈرائیور ہندوستانی تھے مگر سر پر رومال سرخ عرب نژاد تھا۔ سامنے ہری بتی گل ہوئی اور زرد بلب روشن ہوگیا۔ گاڑی ٹریفک کے اصول اور مولانا کا لحاظ کر کے روک دی گئی، لیکن پیچھے سے آنے والی تیز رفتار گاڑی کے ڈرائیور کے سان وگمان میں بھی نہیں تھا کہ سرخ رومال والا ڈرائیور پیلی بتی دیکھ کر گاڑی روک سکتا ہے۔ کیونکہ عرب نوجوان تو لال بتی پر بھی بمشکل تمام اور بادل ناخواستہ گاڑی روکتے ہیں۔ ایک جھٹکے سے گاڑی نے کئی پہلو بدلے۔ تھوڑی دیر بعد مولانا سراج الحسن صاحب اور مولانا اعجاز اسلم اصاحب ایک دوسرے کے چہرے سے خون کی لکیریں صاف کر رہے تھے اور زیادہ دیر بعد وہاں کے معروف اسپتال میں مولانا کا ایک پیر پلاسٹر کی زد میں تھا۔

کویت کے ایک سفر میں ایک اہم سرکاری نشست میں عراق کویت تنازعہ سے متعلق جماعت اسلامی ہند کی قرار دار کا عربی ترجمہ پیش کیا گیا، کویت کی ایک معروف اسلامی شخصیت نے اٹھ کر کہا یہ قرار داد متوازن اور درست ہے۔ دوسری بہت ساری جماعتوں کی قرار دادوں میں کسی ایک سمت جھکاؤ ہے۔ مولانا کی شگفتہ مزاجی گویا ہوئی: ''اس دن ہماری قرار داد کی اہمیت ان پر ہی نہیں ہم پر بھی واضح ہوئی۔''

کانپور کے ایک سفر کی روداد بیان کرتے ہوئے کہنے لگے: کانپور کے ایک معزز فرد نے مجھ سے کہا: کام تو جنوبی ہند کے لوگ کرتے ہیں ہم لوگ تو صرف جھگڑتے ہیں۔ میں نے کہا: خوش فہمی میں مت رہیے دراصل بات یہ ہے کہ لڑتے تو وہ بھی ہیں تاہم جنوبی ہند کے لوگ لڑتے جھگڑتے ہوئے کام بھی کرتے ہیں۔ پھر مولانا سنجیدہ ہوگئے اور شمالی ہند پر آزادی اور تقسیم کے نتیجے میں گزرنے والے حالات کا تجزیہ کیا اور کہا تحریک کا کام شمالی ہند میں بھی مزید

بڑھے اس کی بھر پور کوشش ہونی چاہیے، ہم اپنی خامیوں اور کمیوں کا جائزہ لیں اور انھیں دور کریں۔گفتگو میں صدام حسین کا ذکر آیا تو آپ نے کہا صدام حسین کا دامن خون آلود ہے، لیکن سوال اس کا نہیں ہے سوال تو دراصل اس کا ہے کہ آج کی عالمی طاقتوں کے عزائم کیا ہیں؟

مولانا نے نشست کے آغاز میں کہا برادران وطن پر خصوصی توجہ کیجئے۔اسلام کی دعوت غیر مسلم طلبہ تک پہنچانے کو ترجیحات میں شامل کیجئے۔آپ اس رخ پر عملی قدم اٹھائیں گے تو نیچے کی سطح تک یہ توجہ منتقل ہوگی۔اور پھر نشست کے اختتام پر فرمایا: اصلاح وتربیت سے متعلق اب تک کے تجربات غور وفکر اور بحث و تحقیق کا نچوڑ یہ ہے کہ سب سے آسان اصلاح اس کی ہوتی ہے جو خود اصلاح کا طالب ہوتا ہے اور سب سے مشکل اس کی اصلاح ہے جو خود اصلاح نہیں چاہتا۔اصلاح کی طلب یہ ایک چراغ ہے اس چراغ کو اپنی پوری زندگی میں روشن رکھیے اسے بجھنے مت دیجئے۔

مولانا کو ایس آئی او سے جذباتی لگاؤ ہے۔وہ طلبہ تنظیم میں اپنے خوابوں کی تعبیریں بہت پرامید ہوکر تلاش کرتے ہیں۔اس شام بھی انھوں نے اپنے جذبات کا برملا اظہار کیا ''میں اس لمحے کو ایک مبارک لمحہ اور ایک تاریخی ساعت سمجھتا ہوں جب ایس آئی او کے قیام کا یہ فیصلہ تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر کیا گیا۔'' گفتگو نفع وضرر کی چھڑی تو کہا ''کوئی بھی انسانی فیصلہ خامیوں سے خالی نہیں ہوتا ہے۔تاہم طلبہ تنظیم کے سلسلے میں جماعت اسلامی ہند نے جو تجربہ کیا ہے اس پر مثبت نتائج اور نفع کا پہلو غالب ہے۔''

نوجوانوں کو نصیحت کرنے کا تقاضا ہوا تو کچھ اس طرح گویا ہوئے، نوجوانوں کو ہمت اور حکمت کا دامن مضبوطی سے تھام لینا چاہئے، یاد رہے کہ حکمت کا مطلب بزدلی نہیں ہے، اور ہمت کا مطلب بیوقوفی نہیں ہے۔بات ایسی تھی کہ سننے والے سوچ میں ڈوب گئے۔

جب تذکرہ ہو شام کا اور رونقِ شام مولانا کی ذات خوش گفتار ہو تو آپ کے پسندیدہ اشعار کا ذکر بھی ہو جائے، جو آخری دور میں آپ کی اکثر گفتگوؤں میں جگہ پانے لگے تھے۔

تو بھی اب ذہن کی پستی سے ابھر ہاتھ ملا
میں بھی خوابوں کی بلندی سے اتر آیا ہوں

تم آسماں کی بلندی سے جلد لوٹ آنا
ہمیں زمیں کے مسائل پہ بات کرنی ہے
شکوہ ظلمت شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

قریب دو دہائی پرانی اس تحریر پر آج نظر ثانی کرتے ہوئے یہ اضافہ بھی کرنے کو دل چاہتا ہے کہ دو سال قبل مولانا مرحوم حیدرآباد آئے ہوئے تھے، میری خوش نصیبی بھی مجھے انھیں ایام میں وہاں لے گئی، میں مولانا کی زیارت کرنے پہونچ گیا، مولانا کی یادداشت کافی کم زور ہو چکی تھی، میں نے خواہش ظاہر کی کہ آپ کے پسندیدہ اشعار آپ کو سنانا چاہتا ہوں، مولانا نے خوشی سے اجازت دی، میں نے یہ اشعار سنائے اور مولانا فرط مسرت سے جھوم اٹھے، اور بڑی دیر تک مجھے شاباشی دیتے رہے۔ اللہ مولانا کو جنت کے حسین باغوں اور اونچے محلوں کی ابدی سکونت عطا فرمائے۔ (نظر ثانی شدہ تحریر)

تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی، سابق صدر شعبۂ اردو انجمن ڈگری کالج، بھٹکل، کرناٹک

علامہ اقبال کی زبان میں دل دردمند اور زبان ہوش مند کے پیکر، نگہ بلند، سخن دل نواز اور جاں پرسوز کی خوبیوں سے آراستہ میر کارواں، مختلف ملی اداروں کے سرگرم رہ نما اور سابق امیرِ جماعت اسلامی ہند مولانا محمد سراج الحسن صاحب کی رحلت تحریک و دعوت اور امت کا عظیم خسارہ ہے، جو یقیناً ہم سب کے لیے انتہائی رنج وغم کا باعث ہے۔ آپ کا انتقال ۲/ اپریل ۲۰۲۰ء کی شام بعد عصر اپنے آبائی وطن رائچور (کرناٹک) میں ہوا اور وہیں دوسرے دن بعد نمازِ جمعہ تدفین عمل میں آئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

گلشن ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

مولانا مرحوم کی شخصیت بے حد متحرک وفعال، سراپا محبت وخدمت، ایثار وقربانی کی پیکر اور انکسار وسادگی، وضع داری وبردباری کے ساتھ ساتھ ملاقات وتعلقات میں جذبہ واحساس کی شدت اور پرخلوص گرم جوشی، ہر ایک کو متأثر کرنے والی تھی۔ اس وقت مجھے آج سے ٹھیک ۳۲ برس قبل ان سے ہوئی پہلی ملاقات بہت یاد آرہی ہے جو ۷، ۸ فروری ۱۹۸۸ء کو بنگلور میں ادارۂ ادب اسلامی ہند کی دوروزہ کانفرنس کے موقع پر ہوئی تھی۔ جماعت اسلامی کے قومی سکریٹری کی حیثیت سے آپ نے کانفرنس میں افتتاحی تقریر کی اور ادب وتہذیب اور معاشرے کی صورتحال کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بتایا کہ ادب اسلامی کی یہ تحریک اپنے صالح اندازِ فکر کے ذریعے حیات انسانی کی صحیح رہ نمائی کرسکتی ہے۔ اس پر مغز گفتگو کے بعد افتتاحی اجلاس میں اس وقت کے امیرِ حلقہ کرناٹک مولانا محمود خان صاحب نے بھی اظہار خیال کیا تھا۔ افتتاحی اجلاس کے بعد مولانا

سراج الحسن صاحب مختلف شہروں کے تحریکی دورے پر نکل گئے تھے۔ بعد میں میسور کے اجلاس میں جب ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے دوران سفر اپنی گاڑی کے ٹیپ کی مدد سے میرے مقالے کو سن کر جس طرح خلوص ومحبت کے ساتھ اس کی تحسین کی، وہ انداز اور وہ لہجہ، وہ شفقت بھری ستائش مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ مولانا مرحوم کو رابطۂ عامہ سے خاص دلچسپی تھی۔ اسی لیے انہوں نے پورے ملک میں جماعت کی ضلع سے تحصیل تک کی یونٹوں کا دعوتی و تنظیمی دورہ کیا اور اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے محاورے میں نہیں بلکہ حقیقت میں ہندستان کے چپے چپے کا سفر کیا تھا۔ انہیں خطوط نویسی کا بھی اچھا ذوق تھا۔ پورے ہندستان میں جن سے بھی ان کے تعلقات ہوتے انہیں دعوتی خطوط کثرت سے لکھتے۔ میرے پاس بھی مختلف مواقع پر کثرت سے خطوط آئے تھے۔ افسوس کہ وہ سب محفوظ نہ رہ سکے۔ ابھی حال میں میرے کاغذات میں ان کا ایک خط نکل آیا۔ یہ پورا خط من وعن یہاں نقل کرتا ہوں۔ جس سے ان کی شگفتہ شخصیت اور ادبی مزاج کا بھی اظہار ہوتا ہے:

جولگرہ، ضلع رائچور (کرناٹک)

۳۰/اپریل ۱۹۸۸ء

عزیز گرامی! سلام مسنون

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ ۱۰/فروری ۱۹۸۸ء کی میسور کی وداعی ملاقات کے بعد آج رمضان کے اس مبارک مہینے میں کوئی پونے تین ماہ کا وقفہ دے کر آپ کو خط لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔ ایک تو پہلی تعارفی ملاقات میں ہی جو کہ ۷ فروری کی صبح ملیہ بلڈنگ بنگلور میں ہوئی تھی، کس قدر کشش محسوس ہوئی تھی۔ پھر جب آپ نے مولانا طیب عثمانی صاحب سے اپنی نسبت بتائی تھی تو دل اور کھنچ گیا اور محترم موصوف کا سلام سنایا تو جی چاہا کہ آپ کو لپٹالوں لیکن سیڑھیاں اتر کر قافلہ کانفرنس ہال کی طرف رواں دواں تھا، اس لیے اپنے پر قابو رکھا۔ پھر ۸ کی شب بنگلور سے میسور جاتے ہوئے آپ کے مقالے کا ٹیپ سنا تو دل میں آپ کے لیے محبت اور تعلق کے وافر جذبات کو موج زن پایا۔ چناں چہ میسور پہنچ کر اس کا اظہار

بھی آپ سے ملاقات کے موقع پر کر دیا تھا۔ اب جب کہ یہ تحریر زیر رقم ہے آپ کی دی ہوئی کتاب 'نظریۂ ادب اور ادیب' کا مطالعہ کر چکا ہوں اور آپ کے سلسلے میں ڈاکٹر عبدالمغنی صاحب کا ہم نوا ہو کر اچھی توقعات کا اظہار کر رہا ہوں اور آپ ہی کی پیروی میں حضرت حفیظ میرٹھی کے شعر میں تصرف کرتے ہوئے لکھ رہا ہوں ۔

شگفتگی بھی ہے، تاثیر بھی، بصیرت بھی
پسند آئی تمہاری کتاب رشاد میاں!

میں نے اس شعر کے ذریعے آپ کی کتاب پر اپنی رائے کا بے کم وکاست اظہار کر دیا ہے۔ کوئی مبالغہ نہیں کیا ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ...... اپنی فکر سے گہرا خلوص اور اس سے مضبوط تعلق، وسیع مطالعہ اور گہرا مشاہدہ، کڑی ریاضت اور محنت شاقہ، ان شاء اللہ شاہراہِ ارتقا پر آپ کو آگے ہی آگے لے جائیں گے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی نصرت کو آپ کے شامل حال فرمائے اور آپ کی صلاحیتوں کو نکھارے اور فکر صحیح، عمل صالح اور نظام عدل کی اشاعت اور اقامت کا بیش از بیش کام آپ سے لے۔ آمین۔

دعا تو خدا سے کی اور درخواست آپ سے یہ ہے کہ: فکر کی طہارت، خیال کی عفت اور قلم کی عظمت کا ہر دم اور ہر آن لحاظ رکھیں اور دیانت، امانت اور متانت کو اپنے قلم کا شعار بنالیں۔ ان شاء اللہ رضائے مولیٰ سے ہم کنار ہوں گے اور کامیابیاں قدم چومیں گی۔ خط کو نیک تمناؤں اور قابل قبول دعاؤں کے ساتھ ختم کرتا ہوں۔ والدین محترم، بھائی بہنوں، اہل خانہ اور احباب تک میرا سلام خلوص پہنچا دیں۔

والسلام
مخلص
محمد سراج الحسن

۱۹۸۸ء میں ہوئی ان سے پہلی ملاقات کے بعد یہ پہلا خط تھا جو میری پہلی ادبی تصنیف 'نظریۂ ادب اور ادیب' مطبوعہ ۱۹۸۵ء پر بہ طور رسید تحریر کیا گیا تھا۔ پھر کچھ ایسا ہوا کہ ۱۹۹۲ء

میں میرا مستقل بھٹکل کے انجمن کالج میں آجانا ہوا۔ جس کے بعد مختلف بہانوں سے بار بار مولانا سے ملنے اور استفادہ کرنے کا مجھے موقع ملتا رہا۔ یوں میں نے آپ کو بہت قریب سے دیکھا اور بے حد متاثر ہوا۔ مولانا مرحوم خلوص ومحبت کے پیکر تھے، طبیعت میں لینت ورأفت اور نرمی بھی بے انتہا تھی۔ حدیث شریف میں مومن کی یہ شان بیان کی گئی ہے کہ ''مومن خود محبت کرتا ہے اور اس سے محبت کی جاتی ہے۔ اس شخص میں کوئی بھلائی نہیں، جو نہ خود الفت کرے اور نہ دوسرے اس سے الفت کریں۔ لوگوں میں بہتر وہ شخص ہے جو دوسروں کو نفع پہنچائے۔''
مولانا مرحوم کی پوری زندگی اس حدیث پاک کی عملی تفسیر تھی۔

مولانا مرحوم کی یہ خوش نصیبی تھی کہ وہ زندگی کے بالکل ابتدائی ایام یعنی دور طالب علمی میں ہی تحریک اسلامی سے متاثر ہوکر اس سے وابستہ ہوگئے تھے اور پھر زندگی کی آخری سانسوں تک اس جادۂ عشق پر گام زن رہے۔ آپ نے ۲۶/برس تک امیرِ حلقہ جماعت اسلامی کرناٹک کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ پھر انہیں سکریٹری جماعت کی حیثیت سے دہلی بلالیا گیا۔ ۱۹۹۰ء سے ۲۰۰۳ء تک کل ہند امیر جماعت کی حیثیت سے اپنی ذمے داریاں ادا کیں۔ یہ وہ دور تھا جب ۹۲ میں بابری مسجد کی شہادت کے بعد ملک ایک نازک اور سنگین حالات سے گزر رہا تھا۔ مولانا نے بڑی پامردی، استقامت، ایثار اور بصیرت کے ساتھ تحریک کی قیادت کی۔ اسی کے ساتھ آپ نے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت اور بابری مسجد رابطہ کمیٹی جیسے ملی اداروں میں سرگرم حصہ لیا اور ہر محاذ پر فعال کردار ادا کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے پناہ انتظامی امور کی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ آپ اپنی تمام ذمے داریوں میں ایک عمدہ منتظم ثابت ہوئے۔ سماجی کام اور دعوتی سرگرمیوں میں صبر وضبط کی صفت بھی بہت زیادہ تھی۔ دعوتی کام کرنے والوں کو وہ بتاتے تھے کہ مدح وذم سے بلند ہوکر صبر وضبط کے ساتھ رضائے الٰہی کی خاطر کام کرنا ہی اولوالعزمی ہے۔ مولانا مرحوم موثر خطابت، تعلقات میں گرم جوشی، سادگی ومتانت، محنتی، جفاکش اور معتدل مزاج شخصیت کے مالک تھے۔ اس لیے سماجی ودعوتی کاموں میں ہمیشہ کامیاب نظر آتے تھے۔ ایک اہم بات اور یہ ہے کہ آپ زاہدِ خشک نہ تھے، خوش طبعی اور حسِ مزاح بھی خوب تھی۔ وہ ہمیشہ مسکراتے ہوئے خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے اور خوش مزاجی کے

ساتھ باتیں کرتے۔ ان کی دلچسپ باتیں، ملاقاتیں اور یادیں کبھی بھلائی نہ جاسکیں گی۔

مولانا محمد سراج الحسنؒ ایک بھاری بھرکم اور قدآور شخصیت کا نام تھا۔ آپ مسلسل جدوجہد، ان تھک محنت اور ثبات وثابت قدمی کی علامت تھے۔ مزاج میں بے پناہ شورائیت تھی۔ اپنے اکثر رفقا کو مشورے میں شریک کرتے۔ مشوروں کے بعد جب کوئی فیصلہ کرتے تو پھر اس پر جم جانا اور حالات و واقعات کو اس کے موافق بنانا آپ کی خاص صفت تھی۔ آپ معروف معنی میں کسی مدرسے یا درس گاہ کے فارغ نہیں تھے مگر مطالعہ بہت وسیع اور گہرا تھا۔ آپ کے خاندانی حالات، ابتدائی زندگی اور شخصیت وخدمات پر ایک اہم مضمون مولانا طارق فارقلیط فلاحی کا میرے سامنے ہے جو ماہ نامہ 'رفیق منزل' دہلی کے ماہ جون ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا ہے۔ یہ پورا مضمون ماہ نامہ 'صدائے سحر' بنگلور بابت جنوری تا جون ۱۹۸۳ء کے شماروں میں شائع ہونے والے مولانا کے انٹرویو اور مضامین کی بنیاد پر لکھا گیا تھا۔ اس طرح اب مولانا کی شخصیت وسوانح پر یہ سب سے معتبر ومستند تحریر ہے۔ چناں چہ مناسب یہ ہے کہ مولانا کی حیات وخدمات پر اپنی طرف سے کچھ لکھنے کے بجائے اس تاریخی وتحقیقی تحریر سے چند اقتباسات یہاں پیش کر دیے جائیں:

''مولانا سراج الحسن صاحب ۳/ مارچ ۱۹۳۳ء میں پیدا ہوئے۔ جولگیرہ جو صوبہ کرناٹکا میں رائچور ضلع کا ایک قصبہ ہے آپ وہیں کے ایک زمین دار گھرانے جو وہاں کی مخصوص اصطلاح میں ساہوکار کے نام سے پکارا جاتا تھا کے چشم وچراغ تھے اور بہت ہی ناز ونعم اور لاڈ وپیار میں پلے بڑھے۔ قدرت نے سب کچھ دے رکھا تھا۔ عزت، دولت، شہرت کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ آپ کا خاندان وہاں کے راجہ کے بعد سب سے طاقت ور خاندان شمار ہوتا تھا اور زبردست مالی اور سیاسی اثرات کا حامل تھا۔ راجہ کے بنانے اور بگاڑنے میں اسی کی حمایت ایک اہمیت رکھتی تھی۔ آپ اس کے اثرات کا اندازہ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ جب جولگیرہ کے راجہ کا انتقال ہوگیا تو اس کی جانشینی کے لیے آپس میں رسہ کشی شروع ہوگئی وجہ یہ تھی کہ راجہ کے کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی لہٰذا اس کے دور اور نزدیک کے رشتے دار اقتدار پر قبضے کے لیے آپس میں ٹکرانے لگے۔ اس وقت مولانا سراج الحسن صاحب کے والد نے راجہ کے ایک رشتے دار کی

حمایت کی اور اس کو اقتدار دلانے میں اپنا زبردست اثر و رسوخ استعمال کیا اور اس کے اوپر اس کا مقدمہ لڑنے کے لیے اس وقت ایک لاکھ ۳۴ ہزار روپے خرچ کیے۔ بالآخر وہ مقدمہ جیت گیا اور اقتدار پر قبضہ کرلیا۔

مولانا کے والد محترم کا نام ابوالحسن تھا۔ دادا کا نام محمد خواجہ حسین اور نانا کا نام محمد خواجہ عبدالنبی تھا۔ والد محترم کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اٹھ گیا۔ اس وقت سراج الحسن صاحب کی عمر ۱۱رسال کی تھی۔ اس طرح والد کی تربیت سے محروم ہوگئے۔ مولانا سراج الحسن صاحب کا سن شعور کا زمانہ عجیب ہنگامہ پرور زمانہ تھا۔ آپ کی عمر ۱۵ یا ۱۶ رکی رہی ہوگی جب ملک میں آزادی کا سورج طلوع ہوا اور جہاں ملک کی کثیر آبادی نے غیر ملکی آقاؤں سے نجات حاصل کی وہیں ملک ایک بڑی تقسیم سے دوچار رہا۔ ہزاروں خاندان اجڑے اور برباد ہوئے۔ لاکھوں انسانوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ کل جو امیر تھے آج غریب ہوگئے۔ کل جو بادشاہ تھے آج فقیر ہوگئے۔ حیدرآباد پر ایک عجیب ہی قیامت ٹوٹ پڑی۔ سردار پٹیل کی قیادت میں پولس ایکشن ہوا۔ ہزاروں افراد مارے گئے اور سیکڑوں خاندان برباد کردیے گئے۔ مسلمانوں کی قوت وطاقت اور عزت سب ختم ہوگئی۔ سراج الحسن صاحب کا خاندان بھی پولس ایکشن سے زبردست متاثر ہوا۔ جولگیرہ کے راجہ نے جو ان کے والد کے تعاون سے اقتدار تک پہنچا تھا۔ حالات سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کرلیا اور کوشش کرنے لگا کہ اس کو ایک لاکھ چونتیس ہزار روپے نہ دینے پڑیں اس کے لیے اس نے سازش کی اور مولانا سراج الحسن صاحب کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے ان کے سر پر انعام کا اعلان کردیا اور رضا کاروں کے لیڈر کی حیثیت دے کر طرح طرح کے الزامات رکھے۔ پولس کی جانب سے ان کے خلاف وارنٹ نکلوائے۔ ان پر جھوٹے مقدمے دائر کیے۔ جولگیرہ اور اس کے اطراف ان کے تعلق سے طرح طرح کی افواہیں پھیلا کر ان کے رشتے داروں کو طرح طرح سے ہراساں کرنے کی کوشش کی۔ راجہ کا مقصد یہ تھا کہ سراج الحسن صاحب کو باہر لایا جائے اور ان کا کام تمام کردیا جائے۔

سراج صاحب کی جان کے لالے پڑ گئے۔ صورتِ حال جب ابتر ہوگئی تو وہ روپوش ہوگئے۔ ۱۷ر ستمبر ۱۹۴۸ء میں روپوش ہوئے اور دو سال کی مسلسل اور طویل روپوشی کے بعد ۱۷ر

ستمبر ۱۹۵۰ء کو باہر نکلے۔ ان ہی ایام میں ایک ایسا وقت بھی آیا جب سراج الحسن صاحب کے رشتے داروں کو ان کی جان کی طرف سے بہت زیادہ خطرہ لاحق ہوگیا۔ ان کی اور زیادہ حفاظت کی خاطر اس مکان کی ایک ایسی کوٹھری میں ان کو بند کر دیا گیا جس میں سورج کی ہلکی سی کرن بھی نہیں پہنچتی تھی۔ اس بند کوٹھری میں سراج الحسن صاحب نے کئی ہفتے گزارے اور جب ماحول پر سے خوف و دہشت کے بادل چھٹے اور یہ باہر کی روشنی میں آئے تو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ قید تنہائی نے چہرے کی ساری تازگی نچوڑ لی ہو۔ چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ دماغ پر بھاری بوجھ سا تھا اور سارا بدن تھکن سے چور چور۔

سراج صاحب کی عمر اس وقت ۱۶؍ سال کی تھی۔ میٹرک میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ کھیلنے کھانے کے دن تھے۔ مگر واہ رے ظلم و بربریت اور حالات کی ستم ظریفی کہ پورے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور ہر چیز کو تہ و بالا کر دیا۔ تعلیم چھوٹ گئی جس کا قلق انہیں ہمیشہ رہا۔ دو سال قیدی کی طرح زندگی گزارنی پڑی لیکن ان ہی حالات میں سراج صاحب کو ایک بہت بڑی یافت بھی ہوئی اور وہ جماعت اسلامی اور تحریک اسلامی سے تعارف۔

رائچور کے مشہور وکیل جو سراج صاحب کے والد کی طرف سے راجہ کا مقدمہ لڑ رہے تھے مولانا مودودیؒ کے 'ترجمان القرآن' کے خریدار تھے۔ وہ خود بھی اس سے متاثر تھے اور دوسروں کو بھی بتانے کی کوشش کرتے تھے۔ ان ہی وکیل صاحب کے ایک صاحب زادے تھے جن کا نام عبدالرؤف تھا اور جو سراج صاحب کے بہنوئی بھی ہوتے تھے 'ترجمان القرآن' لا کر دیا اور پھر مولانا مودودیؒ کے 'خطبات' کا مطالعہ کرایا اور دو سال کی روپوشی کے زمانے میں اگرچہ باقاعدہ کلاس کا سلسلہ تو ختم ہوگیا تھا۔ مگر غیر درسی کتب کا مطالعہ برابر جاری رہا اور دو سال کی طویل مدت میں کتابیں ہی اصل رفیق بن گئیں۔ سراج صاحب قید تنہائی سے باہر آئے تو ایک تجزیہ نگار ذہن بھی ساتھ لائے اور فکر قدرے قومیت کے سانچے میں ڈھل گئی۔ مگر جماعت اسلامی کے لٹریچر کا مطالعہ جاری رہا۔

۱۹۵۰ء میں جب باہر آئے تو چار پانچ ساتھیوں کو جمع کر کے 'انجمن اصلاح المسلمین' نامی ایک انجمن کی بنیاد رکھی اور اس کے ذریعے رائچور کی فضا کو بدلنے کی جدوجہد شروع کی، جلسوں

کا اہتمام کیا، مساجد میں تقریریں اور لوگوں سے مل کر ان کو اپنی اصلاح کی طرف متوجہ کیا۔ اس کے نتیجے میں خود اعتمادی پیدا ہوئی اور اپنی بات پیش کرنے کا ڈھنگ بھی آیا، شرم وحیا اور جھجک جاتی رہی اور اسٹیج کا خوف دور ہوگیا۔

اس زمانے میں رائچور میں محمد جعفر مینار جماعت اسلامی کے واحد رکن تھے اور وہی جماعت کے کام کو آگے بڑھا رہے تھے، 'انجمن اصلاح المسلمین' کے صدر عبدالعزیز صاحب جماعت اسلامی سے شدید نفرت کرتے تھے۔ اگر کبھی محمد جعفر کا گزر ادھر سے ہوجاتا تو عجیب طرح کا منہ بناتے۔ یہ بات سراج صاحب کو برابر کھٹکتی رہی اور اس معاملے میں کبھی اپنے صدر کا ساتھ نہ دیا۔ 'انجمن اصلاح المسلمین' کا کام بہت جوش وخروش سے چل رہا تھا کہ ۱۹۵۱ء میں سراج صاحب کے ایک دوست جناب عبدالنبی نے ان کو جماعت کے ایک اجتماع میں شرکت پر آمادہ کرلیا۔ اجتماع میں صرف چند احباب تھے، جناب صدیق علی صاحب نے سورۂ انعام کا درس دیا اور مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب کی کتاب 'اساس دین کی تعمیر' سے اجتماعی مطالعہ ہوا۔ دعا پر اجتماع ختم ہوگیا۔ سراج صاحب کی شرکت سے رفقاء کو بڑی خوشی ہوئی چلتے وقت جعفر صاحب نے دو کتابیں دیں 'پن چکی' اور 'ذہنی زلزلہ' اور یہی 'ذہنی زلزلہ' نے سراج صاحب کے اندر واقعی ایک زلزلہ پیدا کردیا۔

مولانا سراج الحسن صاحب نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ 'ترجمان القرآن' کے تمام پرچے اور مولانا مودودیؒ کی اکثر کتابیں پڑھ ڈالیں اور چند ہی دنوں میں اپنے تمام ساتھیوں کو جمع کرکے یہ اعلان کردیا: ''بھائیو! اب تو ہم جماعت اسلامی میں چلے آئے آپ جانیں اور آپ کا کام۔'' ساتھیوں کو جماعت اسلامی سے تو اختلاف تھا۔ مگر سراج صاحب پر وہ مکمل اعتماد رکھتے تھے، ان کی سوجھ بوجھ، معاملہ فہمی اور دوراندیشی کے قائل تھے۔ ایک اچھے ساتھی کو جماعت اسلامی میں جاتے دیکھ کر انہوں نے سوچا کوئی بات تو ہوگی اور جواب دیا: ''جب آپ جیسے ہمدردِ قوم جماعت اسلامی کو اچھی جماعت سمجھتے ہیں اور اس میں داخل ہورہے ہیں تو آپ آگے چلیے ہم بھی آرہے ہیں۔ صدرِ انجمن عبدالعزیز صاحب نے بساط الٹی ہوئی دیکھی تو کہا کہ ''صاحبو! جب آپ تمام جماعت اسلامی میں چلے تو میں یہاں اکیلا رہ کر کیا کروں گا۔ بسم اللہ چلیے میں بھی آرہا ہوں۔'' اور اس طرح سارا قافلہ جماعتِ اسلامی میں داخل ہوگیا۔

جماعت اسلامی میں داخل ہوتے ہی سراج الحسن صاحب نے دو بڑی قربانیاں دیں۔ پہلی قربانی تو یہ تھی کہ اپنے خاندانی ذرائع آمدنی پر تیشہ چلایا اور سودی کاروبار کو ختم کردیا۔ ان کے والد ایک بہت بڑے زمین دار تھے اور بڑا زمین دار چھوٹے زمین دار کو قرضہ دیتا تھا اور مع سود وصول کرتا تھا۔ اگر قرضہ واپس نہیں ہوتا تو اس کی زمین لکھوالیتا تھا۔ سیکڑوں افراد سراج الحسن صاحب کے والد کے قرض دار تھے اور سود درسود کے بندھن میں جکڑے ہوئے تھے۔ سراج صاحب نے ایک دن ان تمام لوگوں کو جمع کیا اور تمام دستاویز نکال کر برآمدے میں بیٹھ گئے۔ ہر ایک سے معلوم کیا اگر سود کی رقم اصل رقم کے برابر ہوگئی تھی تو اس کی جائیداد اور دستاویز اس کو واپس کردیا اور اگر برابر نہیں ہوئی تھی تو اصل رقم کا مطالبہ کیا۔ اگر وہ ادا کرنے کی پوزیشن میں نہ ہوا تو اس کو بھی معاف کردیا۔ اس طرح لمحوں میں ہزاروں روپیوں کا قرض معاف کر کے سود سے اپنے دامن کو پاک کرلیا۔

دوسری قربانی یہ دی کہ راجہ کا ایک لاکھ چونتیس ہزار کا قرض معاف کردیا۔ پولس ایکشن کے بعد حالات نارمل ہوئے تو رشتے داروں نے راجہ کے خلاف مقدمہ دائر کردیا اور قرض واپسی کا مطالبہ کیا۔ حالات بھی راجہ کے خلاف ہوگئے اور وہ برابر جکڑتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وہ مقدمہ ہارنے والا تھا۔ اس کے لیے صرف سراج الحسن صاحب کے ایک بیان کی ضرورت تھی۔ عین اس مرحلے میں سراج الحسن صاحب نے صرف اس خیال سے کہ نہیں معلوم عدالت میں جا کر بیان دیتے ہوئے کوئی ایسی غلط اور جھوٹی بات زبان سے نکل جائے جس کا اثر تحریک اسلامی پر پڑے اور کل قیامت کے دن خدا کے حضور جواب دہی مشکل ہوجائے سارا قرضہ معاف کردیا۔ رشتے داروں نے سر پیٹ لیا اور بہت دباؤ ڈالا گیا مگر سراج صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے اور اپنے فیصلے پر اڑے رہے۔ اس واقعے نے راجہ کے قد کو اور حقیر اور سراج الحسن صاحب کو اور قد آور بنادیا اور اخلاق کا ایک انمٹ نقش لوگوں پر بٹھادیا۔

پولس ایکشن سے حیدرآباد تو اجڑ ہی چکا تھا۔ مسلمانوں کی کمرِ ہمت ٹوٹ چکی تھی اور ہر طرف خوف وہراس، مایوسی اور ناامیدی کے بادل منڈلا رہے تھے۔ کوئی قیادت اور کوئی جماعت نظر نہیں آرہی تھی مزید ستم یہ کہ مسلمانوں کے خلاف سیاما پرشاد مکھرجی نے ۵۲ء میں 'جن سنگھ' کی بنیاد

رکھی۔اس سے مسلمان اور زیادہ بددل اور مایوس ہوگئے۔مگران حالات نے سراج صاحب کو نیا عزم و نیا حوصلہ عطا کیا اور وہ اپنے آپ کو ایک بھرپور کردار کے لیے تیار کرنے لگے۔۱۹۵۳ء سے ۵۷ء کا زمانہ حیدرآباد کے لیے خصوصاً اور سارے ہندستان کے لیے عموماً مایوسی، افراتفری، بے چینی، ذہنی الجھنوں اور پریشانیوں کا دور رہا ہے اور بھرپوری جدوجہد کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنے کا رہا ہے۔اس زمانے میں وہ ایک متفق جماعت کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

سراج الحسن صاحب نے ۵۷ء کے اوائل میں رکنیت کا فارم پر کیا اور یکم جون ۱۹۵۷ء کو رکنیت منظور ہوگئی۔رکن بننے کے بعد سراج صاحب حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ ۲۰رجولائی ۱۹۵۸ء کو جب آپ حج سے واپس آئے تو امیر حلقہ میسور (موجودہ کرناٹکا) کا کانٹوں کا تاج موجود تھا۔میسور کا اب تک کوئی نیا حلقہ نہیں بنا تھا۔اس دوران مرکز نے یہ طے کیا کہ میسور کو نیا حلقہ بنا دیا جائے۔اور امارت کی ذمے داری گلبرگہ کے جناب محمود خان پر ڈالی جائے۔مگر انھوں نے اپنی مصروفیات کی وجہ سے معذرت کی اور سراج الحسن صاحب کا نام پیش کیا۔مرکز نے ان کی تجویز منظور کرلی اور سراج الحسن صاحب کے نام مرکز سے اتھارٹی لیٹر جاری ہوگیا۔سراج صاحب کی واپسی پر جب لوگ اسٹیشن لینے گئے تو اسٹیشن سے گھر تک کے سفر میں دورانِ گفتگو جناب محمد جعفر مینار صاحب نے اشاروں کنایوں میں تذکرہ کیا۔سراج صاحب نے سمجھا کہ دوست احباب مذاق پر تلے ہیں ایک زوردار قہقہہ لگایا اور کہا کہ بہت دلچسپ اور پرلطف مذاق ہے۔مگر انہیں کیا پتہ تھا کہ یہ مذاق نہیں حقیقت ہے اور مرکز ان کے بارے میں ایک فیصلہ کر چکا ہے۔گھر آنے کے بعد جب ذرا سکون ہوا تو مرکز کا خط احباب نے پکڑا دیا۔خط پڑھنا تھا کہ جسم پسینے سے شرابور ہوگیا۔دل اچھلنے لگا اور کپکپی طاری ہوگئی اور کیوں نہ ہوتی میسور جیسی تحریک اسلامی کے لیے بنجر اور سنگلاخ زمین میں ایک ۲۶رسالہ نوجوان کے اوپر حلقے کی امارت کی ذمے داری کوئی معمولی بات نہ تھی۔ایک کوہِ گراں تھا جو ایک ناتواں انسان پر رکھ دیا گیا تھا۔

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

کرناٹک میں ایک برس تک مسلسل کام کرنے کے بعد پہلا اجتماع بھوئی واڑہ، گلبرگہ میں ہوا جس میں کل ۶۰۰/افراد شریک ہوئے۔ بظاہر تو یہ تعداد بڑی حقیر ہے۔ مگر اصولی تحریک کے لیے یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ اور پھر یہ قافلہ مولانا سراج الحسن صاحب کی قیادت میں اپنی منزل کی طرف آگے بڑھتا رہا۔ آپ نے جماعت اسلامی کو کرناٹکا میں نہ صرف متعارف کرایا بلکہ اس کو ایک قافلہ کا رخ دیا اور اس کی جڑوں کو مضبوط اور پائیدار کیا۔ مختلف شعبے قائم کیے اور کئی اداروں کی بنیاد رکھی، خواتین کا شعبہ، طلبہ اور نوجوانوں کا شعبہ اور طالبات کا شعبہ، ڈاکٹروں کا شعبہ وغیرہ۔ ہفتہ وار اخبار 'سنمارگ' جاری ہوا۔ 'اسلامی ساہتیہ پرکاشن' قائم ہوا جس نے کنڑ زبان میں قرآن پاک کا ترجمہ پیش کیا، اور ۱۶/اپریل ۱۹۸۴ء کو سکریٹری رابطہ کی حیثیت سے جب دہلی تشریف لائے تو کرناٹکا کی قیادت کرتے ۲۶/سال بیت چکے تھے اور جماعت اسلامی کرناٹکا کے طول وعرض میں معروف اور جانی پہچانی جماعت بن چکی تھی۔

مولانا سراج الحسن صاحب نے جماعت کی خدمت شروع سال ہی سے اعزازی انجام دیا اور ہمیشہ اسی پر قائم رہے۔ تحریک میں انہماک کے بعد فطری طور پر زمینوں کی طرف سے توجہ ہٹ گئی جو معاش کا واحد ذریعہ تھی مگر سن رسیدہ لیکن حوصلہ مند والدہ نے سیکڑوں بیگھہ زمین کی کاشت کی نگرانی کی ذمے داری خود سنبھال لی اور بیٹے کو فکرِ معاش سے آزاد کر کے دین کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ ان کا یہ حوصلہ آج کی خواتین کے لیے ایک مثال اور نمونہ ہے۔

مولانا سراج الحسن صاحب ۶۵ء کی ہندوپاک جنگ میں چھ ہفتہ ۴/روز تک جیل میں رہے اور ایمرجنسی کے زمانے میں بھی سنتِ یوسفی پر عمل کیا۔ پائے ثبات میں لغزش تو درکنار کرناٹکا کے ہزاروں کارکنوں کے لیے ثبات وثابت قدمی کی علامت بن گئے۔

سراج الحسن صاحب کا عزم وحوصلہ، جدوجہد، بے مثال ثابت قدمی اور مسلسل قربانیوں کو دیکھتے ہوئے مرکز نے دلی بلانے کا فیصلہ کرلیا۔ اور دسمبر ۸۳ء تک وہ سکریٹری رابطہ عامہ جماعت اسلامی ہند کی ذمے داری کو بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔ اس ذمے داری کے تحت انہوں نے پورے ملک کا کئی کئی بار دورہ کیا اور تحریکِ اسلامی کے قافلے کو آگے بڑھنے میں تعاون کیا۔ اس درمیان ان کو جہاں جہاں، دعوتی، تنظیمی اور تربیتی تجربات حاصل ہوئے وہیں

تحریک اسلامی کے ہزاروں افراد سے انہوں نے فرداً فرداً ملاقاتیں کیں اور ہر ہر مقام پر پہنچ کر بیش بہا معلومات حاصل کیں۔ ۸۴ء کے بعد الکشن کے فیصلے سے متعلق رفقا کے درمیان خلش کو دور کرنے میں آپ مسلسل کوشاں رہے اور صرف اسی کی خاطر پورے ملک کا دورہ کیا اور اس خلش کو دور کرنے میں بڑی حد تک کامیاب رہے۔ ان دوروں میں ان کو بعض تلخ تجربات بھی ہوئے مگر ان کی شیریں شخصیت سے ٹکرا کر یہ پاش پاش ہوگئے اور پھر ۲۳؍ مارچ ۱۹۹۰ء کا وہ تاریخی لمحہ جب تحریک اسلامی کی سب سے اہم شخصیت کی حیثیت سے ان کا انتخاب ہوا۔ یہ ان کے آغاز کا انتہائی عروج ہے جہاں تحریک اسلامی کا کوئی فرد ذمے داریوں کے لحاظ سے جاسکتا ہے۔''

مولانا سراج الحسن صاحب آج ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر ان کی یادیں اور باتیں زندہ ہیں۔ موت ایک ایسی زندہ حقیقت ہے جس کو مومن و مسلم اور مشرک وملحد سبھی اٹل مانتے ہیں اور مختلف اقوام میں اس پر سوگ منانے کے مختلف طریقے رائج رہے ہیں۔ موت پر غم والم کا اظہار ایک فطری عمل ہے مگر ایک مسلمان کا غم دوسری تمام قوموں کے عمل سے جدا ہے۔ وہ موت کو زندگی کا خاتمہ نہیں بلکہ ایک نئی زندگی کا آغاز سمجھتا ہے۔ اسلامی تاریخ میں عرب مورخین نے اپنے اپنے دور کے ہزاروں بزرگوں، دانش وروں اور ممتاز لوگوں کی وفات کی تاریخ کا تعین کیا ہے اور ان کے احوال وآثار اور کارناموں کو صفحۂ قرطاس پر محفوظ کر دیا ہے، چناں چہ یہ مختصر سا مضمون اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ تاکہ مولانا مرحوم کی دعوت وعزیمت اور محبت وخدمت سے عبارت اس زندگی کے نقوش کو ہماری نئی نسلیں نہ بھولیں اور انہیں مشعل راہ بنائیں۔ یہی ان کے لیے بہترین خراج عقیدت ہے۔ اب میں اپنی اس طویل گفتگو کا اختتام دو شعر پر کرتا ہوں جو میرے جذبات کے حقیقی ترجمان اور میری تسلی کا سامان ہیں ؎

مرنے والے مر کے بھی لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں
موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز

محمد حسنین سائر، مرکز جماعت اسلامی ہند، نئی دہلی

ہر ذی روح کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ یوں تو روزانہ کتنے ہی لوگ موت سے ہم کنار ہوتے رہتے ہیں، پھر بالعموم رفتہ رفتہ اپنے عزیز و اقارب کے بھی ذہنوں سے محو ہو جاتے ہیں۔ مگر بعض نادر شخصیات وہ ہوتی ہیں، جو اپنے اوصاف حمیدہ اور کارناموں کی وجہ سے دیر تک اور بعض، بہت دیر تک لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہو جاتی ہیں۔ مولانا محمد سراج الحسن صاحب ایسی ہی چیدہ شخصیات میں سے ایک ہیں۔ جو جماعت کے اندر اور باہر دونوں حلقوں میں بہت دیر تک یاد رکھے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں سے صرف نظر کرے، ان کے حسنات کو قبول فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے سرفراز کرے اور تحریک اسلامی ہند کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

اگر صرف مصافحے کو ملاقات کہا جائے تو مولانا مرحوم سے ملاقات کا شرف مجھے چتر پور (جھارکھنڈ) میں 1985 میں حاصل ہوا تھا۔ دراصل مرکزی مجلس شوریٰ کے ایک اہم فیصلے کی ارکان جماعت کے درمیان تفہیم و وضاحت کے لیے مولانا کی چتر پور تشریف آوری ہوئی تھی۔ شمالی چھوٹا ناگپور کے ارکان جماعت پر مشتمل وہ نشست تھی۔ چنانچہ رفقا کی بھیڑ بھاڑ میں مصافحے سے زیادہ کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ ارکان جماعت کو دفتر حلقہ سے پہلے ہی مطلع کر دیا گیا تھا کہ اگر کسی کے ذہن میں کچھ سوالات ہوں تو وہ تحریری شکل میں ساتھ لائیں تا کہ وقت کا صحیح استعمال ہو سکے۔ میری رکنیت کی منظوری کو ابھی سال بھر بھی نہیں ہوا تھا، اس لیے ذہن میں بعض اشکالات ہونے کے باوجود پہلی بار کسی مرکزی ذمہ دار کے سامنے کوئی تحریر پیش کرنے میں مجھے عجیب سی جھجھک اور کچھ ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ تاہم اس موقعے پر میں نے بھی اپنے اشکالات پیش کرنے کی جرأت کر ڈالی۔ دیگر رفقا کے تحریری سوالوں کے جوابات کے درمیان

میرے بھی اشکالات کے بیشتر نکات کی مولانا محترم نے وضاحت فرمائی تھی۔اس سے اطمینان اور عدم اطمینان کے پہلو سے قطع نظر مولانا کا انداز تکلم، جچے تلے الفاظ کا استعمال، ٹھہرا ہوا لب و لہجہ اور بعض احباب کے جھنجھلا دینے والے سوالات کا بھی صبر وتحمل، برد باری اور پُرسکون پیرائے میں ان کے جواب سے میں بے حد متاثر ہوا۔مولانا کا یہ طرز گفتگو دل میں گھر گیا۔

پھر اوائل فروری 1992 میں مرکز کے شعبہ تنظیم میں خدمات کے لیے مجھے طلب کرلیا گیا۔ مرکز حاضری کے بعد پہلی ملاقات میں مولانا جس گرم جوشی سے بغل گیر ہوئے تھے، اس کی یاد آنے پر ان کی مخلصانہ محبت کی خوشبو اور پدرانہ شفقت کی نرم آنچ آج بھی سینے میں دہکتی محسوس ہوتی ہے۔ ان کا یہ انداز کوئی میرے ساتھ ہی مخصوص نہیں تھا بلکہ وہ جس سے بھی ملتے اسی طرح پُرخلوص محبت کے ساتھ ٹوٹ کر ملتے۔ یہ انداز ان کے مزاج اور طبیعت کا حصہ تھا، جسے کوئی بھی ملنے والا محسوس کیے بغیر نہیں رہتا۔اس وقت انھوں نے یہ کہہ کر مجھے حیران کر دیا کہ آپ سے چتر پور میں ملاقات ہوئی تھی اور وہاں آپ نے ایک تحریر بھی پیش کی تھی۔ میری حیرانی اس بات پر تھی کہ ایک دور افتادہ اور معمولی رکن جماعت سے چھ سات سال قبل کی سرسری ملاقات ان کو یاد تھی۔ مولانا کا یہ ایک خاص وصف تھا کہ وہ اپنے ملنے والے کو نہ صرف یاد رکھتے بلکہ ضروری تفصیل کے ساتھ یاد رکھتے تھے۔

مولانا کے سایۂ عاطفت میں رہنے کا شرف، مسلسل گیارہ سال مجھے حاصل رہا ہے۔اس دوران میں نے محسوس کیا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں بہت سی خوبیوں سے نوازا ہے، جن میں کسر و انکسار، ملنساری، سادگی، معاملہ فہمی، دور اندیشی، مردم شناسی اور تحریکی و تنظیمی امور میں باہمی مشاورت پر مداومت، ان کی ہمہ رنگ شخصیت کے نمایاں اور اہم پہلو ہیں۔ باہمی کثرت مشاورت کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ذمہ داران مرکز میں ٹیم اسپرٹ کی کیفیت مزید مستحکم ہوئی اور مرکز کے ماحول میں خوشگواری اور باہمی اعتماد و تعاون کی فضا میں اورنکھار پیدا ہوتا چلا گیا۔ مرکز کے ماحول میں کم از کم میں نے کبھی کوئی کڑواہٹ، کھٹاس یا کشیدگی محسوس نہیں کی اور اس مقولے کو غلط ثابت ہوتے ہوئے سر کی آنکھوں سے دیکھا کہ جہاں چار برتن ہوتے ہیں وہاں کھڑکھڑاہٹ ضرور ہوتی ہے۔ رب کریم اس فضا کو دوام بخشے۔

مولانا محمد سراج الحسن صاحب نے اگر چہ ایک متمول اور خوش حال گھرانے میں آنکھیں کھولی تھیں اور اسی ماحول میں پلے بڑھے تھے، مگر ان کے مزاج میں بلا کی سادگی رچی بسی تھی۔ کسی کی سادگی اور معاملات زندگی میں میانہ روی کا اندازہ اس کے لباس و طعام اور طرز بود و باش سے لگایا جاتا ہے۔ چنانچہ ان کا لباس کرتے، پاجامہ کی شکل میں بہت عام سا ہوتا، ہاں سفر وغیرہ کے مواقع پر شیروانی زیب تن کر لیتے۔ کھانا وہی کھاتے، جو میس میں عام کارکنان مرکز کے لیے تیار کیا جاتا تھا۔ نہ کوئی اہتمام اور نہ ان کی جانب سے کوئی فرمائش، سوائے دہی یا چھاچھ کے، جو جنوبی ہند والوں کی مجبوری ہے۔ مرکز میں ان کا رہائشی کمرہ ایسا نہیں تھا، جسے کشادہ کہا جا سکے۔ ایک بیڈ اور ایک الماری کے بعد جو تھوڑی سی جگہ بچی تھی اس میں ایک چھوٹا سا ٹیبل اور اس کے ساتھ لکڑی کی ایک کرسی پڑی رہتی تھی، جس پر بیٹھ کر مولانا کھانا تناول فرماتے۔ ٹیبل پر تازہ اخبارات کے کچھ شمارے، قرآن مجید اور چند زیر مطالعہ کتابیں، اور ان کی ٹوپی اور عینک کے علاوہ تین نمک دان سلیقے سے رکھے ہوتے۔ ان میں سے ایک تو نمک ہوتا، دوسرے میں سرخ مرچ کا پاؤڈر اور تیسرے میں پسی ہوئی سیاہ مرچ، جس کا استعمال مولانا اپنے کھانوں میں بڑی فراخ دلی سے کرتے تھے۔ گویا تیز اور تلخ کھانا انھیں مرغوب تھا۔ مگر یہ تیز مزاجی اور تلخ پسندی صرف ان کے کھانوں تک ہی محدود تھی، ورنہ ان کی گفتگو اور زبان و بیان کی شیرینی اور دل نوازی اور لہجے کی نرمی و شگفتگی سے ان کے ملنے والے خوب واقف ہیں۔

مولانا کے اوصاف حمیدہ کا ایک بہت ابھرا ہوا وصف یہ تھا کہ وہ اپنے ملاقاتیوں اور شناساؤں کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ وقفے وقفے سے ان کی مزاج پرسی، خبر گیری کے علاوہ مشکلات و مسائل میں انھیں مفید مشوروں سے بھی نوازتے تھے۔ چنانچہ دور دراز کے احباب سے اس مقصد کے لیے پوسٹ کارڈ کا کثرت سے استعمال کرتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ خطوط کی تاریخ ترسیل، مکتوب الیہ کا نام، سبب تحریر کا اشاریہ وغیرہ کا باقاعدہ ریکارڈ رکھنے کا اہتمام کرتے۔ اگر کوئی سفر پر جا رہا ہوتا اور مولانا سے ملنے آجاتا تو وہ انھیں سفر کی مشکلات اور اونچ نیچ سے آگاہ کرتے اور توشہ اور موجود موسم کے پیش نظر ضروری سامان ساتھ رکھنے کی تاکید کرتے اور مفید مشورے دیتے۔ مولانا خود بھی اپنے تنظیمی دورے یا وطن کے لیے نجی سفر کی

تیاری کے سلسلے میں بہت پہلے سے خصوصی اہتمام کرتے تھے۔ ان کے عادات و اطوار اور معمولات زندگی کو دیکھ کر اب محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے سفر آخرت کے لیے بھی (جس کا ٹرین کی طرح کوئی وقت متعین نہیں ہے)، خصوصی وشعوری اہتمام اور خوب خوب تیاری میں مصروف تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے 'اہتمام سفر اور تیاریوں' کو قبول فرمائے۔

6/ دسمبر 1992 کو انہدام بابری مسجد کا دل خراش سانحہ پیش آیا۔ اس کے بعد ملک افرا تفری اور بدامنی کا شکار ہوا، ملت میں غیر یقینی اور مایوسی کی کیفیت پیدا ہوئی اور حکومت نے Unlawfull Activities (Prevention) Act 1967 کے تحت جماعت کی تمام تر سرگرمیوں کو معطل کر دیا۔ کتنے ہی افراد جماعت پس زنداں کر دیے گئے اور بہتوں کو ہراساں کیا گیا۔ یہ گھڑی ملک وملت اور خود جماعت کے لیے بڑی نازک اور صبر آزما تو تھی ہی، تحمل کے ساتھ مؤثر حکمت عملی کی متقاضی بھی تھی۔ اس زمانے میں مولانا نے مومنانہ فراست و بصیرت اور عزم و استقلال کے ساتھ باہمی مشاورت سے ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور ملت میں حوصلہ واعتماد کی بحالی کے پیش نظر فورم فار ڈیماکریسی اینڈ کمیونل ایمیٹی (FDCA) کی داغ بیل ڈالی۔ اسی طرح مولانا دعوتی فکر وعمل کے پرجوش حامی تھے، اور اس کے لیے راہیں تلاش کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ ملک میں خوشگوار فرقہ وارانہ فضا کی برقراری اور دعوت وتبلیغ کی راہ کی ہمواری کے لیے مرکزی مجلس شوریٰ کے ایک فیصلے کے تحت ''دھارمک جن مورچہ'' کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے قیام میں ملک کے مختلف طبقات، انسانی بھائی چارہ کے علم بردار غیر مسلم افراد اور متعدد مذہبی رہنماؤں سے مولانا کے پہلے سے قائم خوشگوار اور خیر سگالی پر مبنی تعلقات نے اہم رول ادا کیا۔ اس زمانے میں مولانا اپنے اظہار خیال اور خطابات میں تواتر کے ساتھ اس بلیغ جملے کا اعادہ کرتے تھے کہ وابستگان تحریک کے لیے یہ ملک نہ تو دارالحرب ہے اور نہ دارالامن، بلکہ یہ دارالدعوہ ہے۔ ان کی خطابت کے سلسلے میں صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ ان کو اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کے لیے الفاظ اور ان کے دروبست پر پوری قدرت حاصل تھی۔ ان کی خطابت کا دوسرا نمایاں وصف یہ تھا کہ وہ کسی بات کو مؤکد کرنے کے لیے اس کا مثبت اور منفی دونوں پیرایہ اختیار کرتے اور کبھی مترادف اور متضاد الفاظ کا استعمال اس خوبی کے

ساتھ کرتے کہ وہ بات سہل ہو کر سیدھی دل میں اترتی محسوس ہوتی۔ ان کا مطالعہ جتنا وسیع تھا اتنا ہی گہرا بھی تھا۔ کثرت مطالعہ کا بڑا اثر ان کی زبان نے بھی قبول کیا۔ چنانچہ شوریٰ کی مجالس ہوں یا عام مجلسی گفتگو، تبادلہٗ خیال کی محفل ہو یا خطابات کا موقع، ہر جگہ اظہار خیال میں شستہ وشگفتہ اسلوب ولہجہ کا ادبی رنگ بہت نمایاں ہوتا۔

امارت جماعت کی حساس، نازک اور گراں بار ذمہ داری کی بہ حسن وخوبی ادائیگی کے ساتھ مولانا بحیثیت نائب صدر کل ہند مسلم پرسنل لا بورڈ، کل ہند مسلم مجلس مشاورت، بابری مسجد رابطہ کمیٹی کے علاوہ متعدد ملی وملکی تنظیموں واداروں میں ذمہ دارانہ حیثیت سے سرگرم رول ادا کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بیرون جماعت بھی مسلم وغیر مسلم حلقوں میں یکساں طور پر قدرو احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنی خودنوشت سوانح حیات 'کاروان زندگی' میں مولانا محمد سراج الحسنؒ کی بے لوث عملی سرگرمی، حسن تدبیر اور خوش انتظامی کی تحسین فرمائی ہے۔ مولانا کے دور امارت میں دارالعلوم دیوبند، اور ندوۃ العلما سے خوشگوار مراسم استوار ہوئے، جس کے نتیجے میں جماعت اور ان اداروں کا درمیانی فاصلہ بتدریج کم ہوا اور تعلقات کی زمین پر ایک عرصے سے جمی ہوئی کائی چھٹتی محسوس ہوئی۔

مولانا علمائے کرام کا بے حد احترام کرتے تھے۔ ویسے بھی اللہ تعالیٰ نے انھیں تواضع، انکساری اور فروتنی جیسی اعلیٰ صفات سے خوب نوازا تھا۔ چنانچہ ملاقاتوں میں کسی تکلف اور تصنع سے پاک یہ بے ریا خوبیاں صاف طور پر محسوس کی جاتی تھیں، اور اگر ملاقاتی کوئی عالم دین ہوتا تو یہ کیفیت مزید دوچند ہو جاتی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے جثّہ کو فربہ اندامی عطا کی تھی، مگر یہ فربہی نظر میں گرانی کا سبب نہیں بنتی بلکہ جاذبیت کا احساس پیدا کرتی تھی۔ ایسے مواقع پر ان کی فروتنی، عاجزی اور بچھ جانے کی کیفیت کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا، جیسے مولانا اپنی جسامت کو ڈھک چھپا لینا چاہتے ہوں۔ اللہ کی مشیت، وہ جسے چاہے جن خوبیوں سے نواز دے ۔

ایں سعادت بہ زورِ بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

سیاسی حضرات سے بھی مولانا کے گہرے مراسم تھے۔ مرکزی اور ریاستی سطح کے

متعدد سیاسی رہنما آپ کے ربط و تعلق میں تھے۔ بقول شخصے کرناٹک کے سابق وزیر اعلیٰ رام کرشنا ہیگڑے کا مولانا سے عقیدت مندانہ تعلق تھا۔

طلبہ و نوجوانوں سے مولانا کو غیر معمولی شغف تھا۔ موصوف ان کی تربیت و تزکیہ پر خصوصی توجہ رکھتے۔ کل ہند سطح پر طلبہ و نوجوانوں کی تنظیم 'اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن' (SIO) کے قیام میں مرکز جماعت کے دیگر اکابر کے ساتھ مولانا کا بڑا رول تھا۔ SIO کے جس اجتماع میں ان کی شرکت ہوتی طلباء ان کو گھیرے رہتے اور ان کے زریں خیالات سے مستفید ہوتے۔ ہماری جماعت میں شخصیت پرستی کا کوئی ادنیٰ تصور بھی نہیں پایا جاتا، تاہم بعض شخصیات ایسی پُرکشش ہوتی ہیں، جن کی غیر محسوس اثر اندازی سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح اگر کسی کو ایسی شخصیت میسر ہو اور اس کے اندر اثر پزیری کی کیفیت مفقود ہو یا پیدا نہ کرے تو اسے بڑی محرومی ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ مولانا کے ربط وصحبت میں آنے والے کتنے ہی صالح اور پاک طینت طلباء و نوجوان ان سے فیض یاب ہوئے اور ان میں سے کئی، آج جماعت کے مختلف مناصب پر تحریک و تنظیم کی بیش بہا خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اللہ کی مشیت کہ مولانا نے ایسے عالم میں داعی اجل کو لبیک کہا کہ جب ملک میں نقل وحمل کے سارے ذرائع معطل اور مسدود تھے۔ ان کے چاہنے والوں کی بڑی تعداد ان کے آخری دیدار اور تدفین میں شرکت سے محرومی کی وجہ سے زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔ بہر حال ہم اللہ رب العزت سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مولانا کی بھول چوک، خطاؤں اور غلطیوں کو درگزر فرمائے۔ خدمات کو شرف قبولیت بخشے، اپنے جوار رحمت میں جگہ دے، ان کے پس ماندگان اور متعلقین کے ساتھ ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے اور دعوت و تحریک کے حوالے سے ہمیں بھی ان کے جیسی پرسوز تڑپ، جذبۂ صادق اور جوش عمل سے نوازے۔ موجودہ ملکی بلکہ عالمی سطح پر تغیر پزیر حالات میں نصب العین کے حصول کے لیے ان اوصاف کی ضرورت دو چند ہوگئی ہے ۔

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

ٹوٹ کر چاہنے والی شخصیت

انتظار نعیم، سابق اسسٹنٹ سکریٹری جماعت اسلامی ہند

1954 کے جبل پور مدھیہ پردیش سے 2020 کے دہلی کے مسلم کش فسادات تک لمبی تاریخ ہے۔لیکن یہ بات تاریخ میں سنہری حرفوں میں لکھی جائے گی کہ انتہائی سخت بلکہ تباہ کن حالات میں ملت اسلامیہ ہند نے حوصلہ نہیں ہارا، بلکہ عزیمت و استقامت کے ساتھ ملک عزیز ہندوستان میں اپنے آپ کو اور اپنی شناخت کو قائم اور باقی رکھا ہے۔یہی آزمائشی حالات گزشتہ صدی کی ساٹھ کی دہائی میں بھی تھے جب ملک کی اہم ملی جماعتوں اور معروف شخصیات نے مجتمع ہوکر دین وملت کے تحفظ و بقا کے لیے ایک باوقار تنظیم آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کی بنیاد رکھی اور اس میں شامل اہم ملی قائدین اور علماء حضرات پر مشتمل کارواں نے ملک کے مختلف علاقوں میں دورے کر کے امت مسلمہ کو یقین واعتماد کے ساتھ ملک میں اپنے قدم جمائے رکھنے اور نامساعد حالات کا رخ موڑ دینے کے لیے جہد وعمل کا پیغام دیا۔

یہ قافلہ جب میسور (کرناٹک) پہنچا تو ریاست کی ایک غیر معمولی سنجیدہ و باوقار اور جہد وعمل کی صلاحیتوں سے لبریز نوجوان شخصیت جناب محمد سراج الحسن نے کارواں کا استقبال ہی نہیں کیا بلکہ پوری ریاست میں اس کے کامیاب دوروں کا اہتمام کیا۔جماعت اسلامی ہند حلقہ کرناٹک کے اس نوجوان امیر کی منظّم کارکردگی اور اس کی دل نواز شخصیت نے اہل کارواں کو بے حد متأثر کیا اور رہنمایان ملت کا اس نوجوان قائد کے ساتھ قربت اور گہرے تعلق کا ایک سنہرا باب شروع ہوگیا۔

محترم امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابواللیث اصلاحی مرحوم جو خود ہی قافلہ ومشاورت کی اہم شخصیت تھے ،انھوں نے ہی جناب محمد سراج الحسن صاحب کو جماعت کے حلقہ کرناٹک کا

امیر نامزد کیا تھا، شاید سراج صاحب کی ہمہ جہت شخصیت کو ریاست کے دورے میں قریب سے دیکھ کر یہ فیصلہ کرلیا ہو کہ ان کی تحریکی خدمت کے دائرے کو ایک ریاست کے بجائے ملک گیر ہونا چاہیے، لہٰذا مولانا محترم نے جناب محمد سراج الحسن صاحب کو کل ہند سکریٹری جماعت مقرر فرما کر مرکز جماعت بلا لیا۔

محترم محمد سراج الحسن صاحب کی مرکز جماعت آمد باد صبا کے فرحت و سرور بخش جھونکے کی سی ثابت ہوئی۔ مرکز میں ہر طرف محبت، شفقت، یگانگت، ادب واحترام کی ایک نئی فضا برپا ہوگئی۔ مولانا ابواللیث صاحب نے محمد سراج الحسن صاحب کو سکریٹری جماعت کی حیثیت سے پورے ملک کا تنظیمی دورہ کرنے اور تمام ارکان جماعت سے فرداً فرداً ملاقات کا موقع دیا۔ اس نئے تجربے نے محترم سراج الحسن صاحب کو ایک ایک رکن جماعت سے ملنے، اس کو سمجھنے اور اس کو تحریکی کاموں میں مزید سرگرم ہو جانے کا پیغام دیا۔ پورے ملک کے اس دورے نے اس وقت تو تحریک کو فائدہ پہنچایا ہی، بعد میں بھی اس تجربے سے جماعت کو مستحکم رکھنے میں بڑی مدد ملی۔

جناب محمد سراج الحسن صاحب نے ۱۹۵۸ میں ۲۶/سال کی عمر میں کرناٹک کی امارت حلقہ کی ذمہ داری سنبھالی تھی تو اس کی بنیاد ایثار پر رکھی تھی اور سکریٹری جماعت سے لے کر جماعت کے کل ہند امیر کی ذمہ داری سنبھالی تو بھی ایثار کا دل کش سلسلہ جاری رہا، یعنی اس طویل مدت میں دین وملت اور تحریک کی اعزازی خدمت انجام دی۔ جماعت سے کبھی کوئی مشاہرہ یا کفاف حاصل نہیں کیا۔

ایثار پسندی کے ساتھ ہی محبت، نرمی، سوز و گداز اور شیریں طرز تخاطب موصوف کا طرّہ امتیاز تھا۔ گفتگو کرتے تو موتی بکھیرتے، لیکن خطاب فرماتے تو اقبال کے بندۂ مومن کی شان ظاہر ہوتی۔ اپنے رفقاء مولانا عبدالرزاق لطیفی اور مولانا عبدالعزیز صاحب کی طرح بلند آہنگ تقاریر میں علامہ کے برمحل اشعار سے حسن پیدا کرتے۔

۱۹۷۲ سے ۲۰۱۹ تک تحریکی سفر اور ملاقاتوں میں تلخی، غصہ اور برہمی کا اظہار کبھی نہیں دیکھا۔ لوگوں سے ملتے تو شاید ہر ملنے والا یہی محسوس کرتا ہوگا کہ مولانا کی محبت صرف اسی کے لیے ہے۔ عام طور پر لوگوں کی عید تین چار روز ہوتی ہے، لیکن مولانا سراج الحسن صاحب چاہے

پندرہ بیس روز یا ایک مہینے بعد ہی مرکز تشریف لاتے تو ہر شخص سے سلام، معانقہ اور عید مبارک کا تبادلہ ضرور فرماتے۔ لگتا کہ جیسے مرکز میں بہار آ گئی ہے۔

نظم و سلیقہ شعاری بھی مولانا کی زندگی کا خاص حصہ تھا۔ رفقائے تحریک کی مختلف انداز سے حوصلہ افزائی بھی عالی ظرف مولانا سراج الحسن صاحب کے مزاج میں شامل تھی۔ امریکہ نے جھوٹا بہانہ بنا کر عراق پر حملہ کیا تو اس خاکسار نے ''بغداد نہیں عالم اسلام پہ ہے وار'' ترانہ لکھا اور مرکز جماعت میں ایک پروگرام میں پیش کیا۔ مولانا نے تحسین فرمائی۔ اگلے روز بٹلہ ہاؤس پر امریکی سفاکی کے خلاف ایک اجتماعی جلسہ عام تھا، مولانا نے صبح کو مجھ سے فرمایا کہ شام میں آپ کو جلسہ عام میں اپنا ترانہ پیش کرنا ہے۔ یہ مولانا کی حوصلہ افزائی تھی کہ سہ پہر میں مجھ سے دوبارہ فرمایا کہ شام کے پروگرام میں آپ کو اپنا ترانہ پڑھنا ہے۔ میں نے محترم امیر جماعت کے ارشاد کے مطابق پروگرام میں ترانہ پیش کیا تو عظیم الشان مجمع کی جانب سے تحسین کی گئی، یہاں تک کہ کچھ دیر بعد دوبارہ پڑھنے کی فرمائش ہوئی۔

مولانا کی رحلت کے بعد برادر محترم جناب توفیق اسلم صاحب، سابق امیر حلقہ مہاراشٹر نے راقم الحروف کو فون کیا تو اندازہ ہوا کہ مولانا اپنے رفقاء کی عدم موجودگی میں بھی تحسین کرنے میں اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ فرماتے تھے۔ برادر توفیق اسلم صاحب نے فون پر بتایا کہ ہم لوگ جب مرکز آتے تو مختلف موضوعات پر بے تکلف گفتگو کر کے استفادہ کرتے۔ توفیق اسلم صاحب نے بتایا کہ مولانا آپ (انتظار نعیم) کا ذکر بڑی محبت سے کرتے اور جماعت، ریڈئینس اور ادارہ ادب اسلامی ہند سے آپ کے والہانہ تعلق کی تحسین و ستائش فرماتے۔ رفیق محترم توفیق اسلم صاحب کی اس گفتگو سے مولانا محترم کے لیے مزید دعائیں نکلیں اور یہ دعا بھی کی کہ بار الہا امیر محترم کے ان جذبات و احساسات کو اس خاکسار کی بخشش کا ذریعہ بنا دے۔

محترم سراج الحسن صاحب نے مرکز جماعت آنے کے بعد ارکان جماعت سے ملک میں گھوم گھوم کر براہ راست ربط قائم کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ دراصل موصوف کے مزاج کا حصہ تھا۔ چنانچہ موصوف ملت کے مختلف طبقات اور تحریک کے وابستگان سے خطوط کے ذریعہ بھی مسلسل رابطہ رکھتے تھے۔ میرا قیاس ہے کہ ملک میں کسی دوسرے شخص نے اپنے واقف کاروں

کو شاید اتنے خطوط نہیں لکھے ہوں گے جتنے کہ مولانا سراج الحسن صاحب نے لکھے۔اگر موصوف کے مکاتیب کا کوئی مجموعہ تیار ہو اور اس کا باریکی سے تجزیہ کیا جائے تو ان کے خطوط میں پوشیدہ گوناگوں مفید پہلوؤں کا اندازہ ہو سکے گا۔

بہت سے دوستوں کا یہ مشاہدہ ہوگا کہ مولانا کا دل دردِ انسانی سے معمور تھا۔جہاں کہیں بھی کسی کو کسی تکلیف سے پریشان دیکھتے تو فوراً اس کے لیے دعا فرماتے اور بعد میں اس کی کیفیت بھی معلوم فرماتے۔

مولانا محترم اپنے رفقاء کی روحانی تربیت کے ساتھ ان کی فرحت و مسرت کا بھی خیال رکھتے۔جماعت کی ایک کل ہند مہم کے دوران مرشدآباد مغربی بنگال میں پروگرام منعقد ہوا تو بہت سے شرکاء کی رہنمائی فرماتے ہوئے وہ انھیں نواب سراج الدولہ کے محل تک بھی لے گئے۔نواب کا محل، جواب میوزیم ہے، واقعی دیکھنے کی چیز ہے۔ایسا حسین و دل کش کہ جیسے ابھی بن کر تیار ہوا ہے۔

ایسے ہی ایک موقع پر جماعت کے نمائندگان کے بنگلور کے قریب اجتماع کے موقع پر محترم سراج الحسن صاحب انھیں لے کر مشہور تفریح گاہ جوگ فالس لے کر گئے۔پہاڑ کی بلندی سے گرتا ہوا جھرنا اپنے حسن و جمال کے توسط سے خداوند قدوس کی صناعی کا شکر ادا کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

اس سلسلے کی ایک کڑی اس خاکسار کی حیدرآباد پر نظم ''شہر زنداں دلاں'' تھی۔میں نے یہ طویل نظم کہی تو مجلس نمائندگان کے اجلاس کے موقع پر منعقدہ ادبی مجلس میں پڑھی بھی۔میں نظم کے بول 'حیدرآباد تری عظمت و شوکت کو سلام' کو ہر بند کے بعد دہراتا تو محترم امیر جماعت 'وعلیکم السلام' کہہ کر ہر بار حوصلہ افزائی فرماتے۔

مولانا کی ادب اور تحریک ادب اسلامی سے غیر معمولی دلچسپی تھی اور اس کی ہر طرح سرپرستی فرماتے تھے۔ادارہ اور ماہنامہ پیش رفت کے بلیماران دہلی میں نئے دفتر کا بڑے شوق سے افتتاح فرمایا، اور راقم اور رفیق محترم جناب عزیز بگھروی کی ہمت افزائی فرمائی۔

ریڈینس ویکلی کی ڈائریکٹرشپ کے زمانے میں خاص حکمت اور ضرورت کے پیش نظر

ریڈینس کا ٹیپو شہید، خاص نمبر شائع کیا گیا اور محترم محمد سراج الحسن صاحب سے مشورہ کر کے بنگلور کے رفقائے جماعت کے سرگرم تعاون سے بنگلور ہی میں اس خاص نمبر کا مولانا محترم کے بدست ایک عظیم الشان پروگرام میں اجراء کرایا گیا۔ اسی موقع پر ادارہ ادب اسلامی ہند کے زیر اہتمام شائع کی گئی منظوم سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم 'چراغ حرا' کا، اس کے شاعر محترم قیصر الجعفری کی موجودگی میں اجراء فرمایا۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کسی ذمہ دار کے ذریعہ اداروں اور افراد تحریک کی حوصلہ افزائی کے کتنے مثبت نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔

مولانا محمد سراج الحسن صاحب کو جماعت نے اپنا امیر منتخب کیا تو تحریکی حلقوں میں ہر جانب انشراح و اطمینان کا ماحول تھا۔ اس کو مزید مستحکم رکھنے کے لیے موصوف نے مرکز جماعت میں تمام دینی، ملی اور تحریکی امور میں مرکز میں موجود دیگر ذمہ داران سے مسلسل مشاورت کا سلسلہ شروع کیا اور ہمیشہ قائم رکھا۔ بعض لوگ مشوروں کے اس تسلسل پر کبھی کبھی مسکراتے بھی، لیکن ایسے مواقع پر ان کے ذہن سے شاید یہ بات اوجھل ہو جاتی کہ یہ ہدایت خداوندی بھی ہے اور اسوۂ رسول ﷺ بھی۔

شاید یہ بات بہت سے حضرات کو یاد نہ ہو کہ انتہائی نرم امیر جماعت مولانا محترم محمد سراج الحسن صاحب نے تحریکی تقاضوں اور مصالح کو پیش نظر رکھتے ہوئے مغربی بنگال میں جماعت کے ایک بڑے اجتماع میں خطاب کرتے ہوئے ایس۔ آئی۔ ایم (SIM) سے جماعت اسلامی ہند کی برأت کا اظہار فرما دیا تھا۔ پریس نے اس کو عام بھی کیا تھا۔

ملی پلیٹ فارموں پر جس سنجیدگی، حلم و بردباری اور وسعتِ قلبی کی ضرورت ہوتی ہے اس کا اظہار مولانا محترم کی آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے اجلاسوں میں موجودگی کے دوران ہوتا تھا۔ بورڈ کے اجلاسوں کے دوران ایسے نازک مواقع بھی آئے جب مولانا سراج الحسن صاحب کی معاملہ فہمی سے اجلاس میں خوش گواری اور حسن بحال ہو گیا۔

جناب سراج الحسن صاحب جب کرناٹک کے امیر تھے تو انھوں نے ریاست میں مسلمانوں اور غیر مسلم حضرات کے درمیان محبت و یگانگت کی خوش گوار فضا قائم کیے رہنے کی مسلسل کوششیں کی تھیں۔ مرکز جماعت میں پورے ملک کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد بھی یہ اہم

تسلسل قائم رہا۔جس طرح مولانا نے کرناٹک میں غیر مسلم مذہبی شخصیات اور مشہور مٹھوں کے ذمہ داران سے قریبی تعلق قائم کیا تھا اسی طرح مرکز میں رہ کر بھی اس اہم فریضے کی ادائیگی کا سلسلہ جاری رہا۔جب جماعت نے 'دھارمک جن مورچہ' قائم کیا تو مولانا سراج الحسن صاحب نے اس تحریک کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔شنکرا چاریہ سوامی مادھوانند جی کی امیر جماعت سے قربت دیکھتے بنتی تھی ۔ان کی رحلت کے بعد ان کے صاحبزادے اور پیٹھ کے وارث جناب اونکارانند جی کا امیر جماعت اور سکریٹری جماعت محترم مولانا محمد رفیق قاسمی مرحوم سے اپنے والد محترم کی ہی طرح ربط واحترام قائم رہا۔

محمد سراج الحسن صاحب ایمرجنسی میں بنگلور جیل میں جرم بے گناہی کی سزا کاٹ رہے تھے کہ آر۔ایس ۔ایس ،جن سنگھ اور دیگر ملکی تنظیموں کے افراد سے آپ کے رابطے قائم ہوئے ۔جن سنگھ کے لیڈر ایل ۔کے۔اڈوانی بھی ان میں سے ایک تھے۔مولانا نے جب دہلی میں تحریکی ذمہ داری سنبھالی تو راقم کو ساتھ لے کر ایک دن اڈوانی صاحب کے گھر ان سے خیرسگالی ملاقات کی ۔افسوس کہ ایک اہم مسلم رہنما کی ملاقات اور برادرانہ گفتگو کے بعد بھی اڈوانی جی نے اپنی خونیں رتھ یاترا چلائی ،جو بالآخر تاریخی بابری مسجد کی مسماری پر منتج ہوئی۔

مسجد شہید کی گئی تو ہندوستانی مسلمانوں پر یہ ظلم بھی ہوا کہ ان کی اہم تنظیم ،جماعت اسلامی ہند پر پابندی عائد کیے جانے کا بھی ستم کیا گیا۔آزمائش کے اس کڑے وقت میں محترم سراج الحسن صاحب جماعت کے امیر تھے۔

نائب امیر جماعت محترم محمد شفیع مونس صاحب ،قیم جماعت جناب محمد جعفر صاحب نے جماعت کا مقدمہ سپریم کورٹ میں لے جا کر اس کے تحفظ اور امیر جماعت کی رفاقت کا حق ادا کیا۔عدالت کے ذریعہ جماعت سرخ رو ہوئی اور اس پر ظلم ڈھا کر پابندی لگانے والے نادم وشرم سار ہوئے۔

اس وقت ملک میں انتشار و بدامنی اور لاقانونیت کا جو ماحول برپا کر دیا گیا تھا اس میں امیر جماعت کی فکرمندی اور حالات کو سازگار بنانے کی کوششیں قابل ستائش تھیں۔دہلی کے بہت سے علاقے تقریباً دو مہینے کرفیو کی زد میں رہے ،ان میں پرانی دہلی کے محلے بھی تھے۔

بلیماران میں ریڈینس کا آفس بھی کرفیو میں محصور تھا۔راقم نے ریڈینس کے Fax کو بڑی نعمت جانا اور اس کے ذریعہ محترم امیر جماعت سے مسلسل رابطے میں رہا اور ایمرجنسی کے دوران جماعت پر پابندی کے سلسلے میں جو تجربات تھے ان کی روشنی میں امیر جماعت سے گزارشات کرتا رہتا۔کرفیو کے اختتام پر میں مرکز حاضر ہوا تو مولانا نے حسب عادت گلے سے لگالیا اور فرمایا کہ آپ کے fax کے مشوروں سے بہت فائدہ اٹھایا گیا۔میں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

ایک بار مولانا نے مشہور صحافی اور ٹائمز آف انڈیا کے ایڈیٹر جناب دلیپ پڈ گاؤنکر سے ان کے گھر پر ملاقات کی ۔ان کے یہاں پہنچتے ہی ان کی چھوٹی بچی نے گلاس میں پانی پیش کیا۔سب کے لیے ہمیشہ دعائے خیر کرنے والے امیر جماعت نے پانی پیش کرنے والی بچی سے شفقت کے ساتھ فرمایا''خدا آپ کو اچھا رکھے'' یہ سنتے ہی بچی گھر کے اندر کی طرف بھاگی اور تھوڑی دیر بعد اپنی والدہ کے ساتھ مولانا کے پاس آئی ۔خاتون خانہ نے امیر جماعت سے کہا کہ مولانا صاحب آپ نے ہماری بچی سے کیا کہہ دیا کہ یہ بے حد خوش ہے اور کہہ رہی ہے کہ ہمارے یہاں بہت لوگ آتے ہیں ،لیکن اتنی اچھی بات کبھی کسی نے نہیں کہی! مولانا نے بچی کے لیے کہے گئے دعائیہ کلمات پھر دہرائے''بیٹی خدا آپ کو اچھا رکھے''بیٹی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔اپنی بیٹی کو خوش دیکھ کر ماں باپ بھی مسرور تھے!

کاش کہ مسلم معاشرہ محترم محمد سراج الحسن صاحب کی طرح ملک کے غیر مسلم سماج تک خوشیاں پہنچانے والا بن جائے ،ایسی خوشی جو ابدی ثابت ہو۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ دین کے لیے ،ملت کے لیے،تحریک کے لیے اور عام انسانوں کے لیے مولانا کے اخلاص وفکر مندی کو قبول فرمائے ،اجر عظیم سے نوازے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔آمین

تحریک اسلامی کے شجرہائے سایہ دار

وحیدالدین خان عمری مدنی، سکریٹری جماعت اسلامی ہند کرناٹک

ہم سبھوں کے عظیم مربی ومحسن حضرت مولانا محمد سراج الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق امیر جماعت اسلامی ہند یقیناً تحریک اسلامی کے شجر ہائے سایہ دار، امت مسلمہ کے قد آور قائد بے مثال، بیک وقت ملت اسلامیہ کے تمام طبقات میں حد درجہ مقبولیت عام رکھنے والے، مثالی رہبر ورہنما، پیکر اخلاص، مرجع خلائق، نہایت متواضع ومنکسر شخصیت کے مالک، سراپا حلیم وشفیق، نمونہ اسلاف، ہر مخلص کے دل کی دھڑکن، قافلہ تحریک کے ہزار ہا ہزار افراد کے دلوں میں خلوص وللّٰہیت اور مستحکم کردار کی شمع روشن کرنے والے روشن چراغ تھے۔ اقامت دین کی راہ میں اپنی عمر عزیز کا ایک طویل عرصہ نہایت صبر واستقلال، جانفشانی، صبر وشکر، بلند عزائم، قید وبند اور ایمر جنسی کی صعوبتوں کو جھیلتے ہوئے، قافلہ تحریک کے شیرازہ کو مجتمع اور مستحکم رکھنے کی حکیمانہ کاوشوں کے ساتھ اور اپنے پورے وجود سے حق وصداقت کی قولی وعملی گواہی دیتے ہوئے آخری سانس تک قافلۂ تحریک کا قیمتی اثاثہ بنے رہے۔

حضرت مولانا مرحوم کے ساتھ مجھے سفر وحضر دونوں میں رہنے کا شرف حاصل رہا۔ آپؒ سفر میں ساتھ رہنے والوں کے مزاج کا خوب خیال رکھتے، ان کی دلجوئی کرتے، ان کے قلب میں خوشی داخل کرنے کی کوشش کرتے، ہنساتے اور جائز مزاح بھی کرتے۔ ایک مرتبہ مجھے مولانا کے ہمراہ مادرِ علمی جامعہ دار السلام عمرآباد جانے کا اتفاق ہوا اور ساتھ میں مولانا محمد رفیق قاسمی صاحب تھے اور ہمارے ساتھی مولانا انور پاشاہ عمری صاحب بھی ساتھ میں تھے۔ راستہ دکھلانے کی ذمہ داری انور پاشاہ عمری صاحب کی تھی، وہ باتوں میں اس طرح محو ہو گئے کہ ان کو سمت سفر بتلانا یاد نہ رہا۔ جس گاڑی پر ہم سوار تھے اس کا رخ سمتِ منزل سے ہٹ کر

دوسری طرف جب پھر گیا تو بعد میں انہیں احساس ہوا اس پر فوراً مولانا نے فارسی کا یہ مصرعہ پڑھا: ''یک لحظہ غافل بودم وصد سالہ راہم دور شد''۔ ایک مقام پر طہارت کے لیے ہمارے ساتھی گئے پیشاب سے فارغ ہو کر جب وہ آئے اور انہیں چائے کی طلب ہوئی اور چائے پینے کے لیے قریبی ہوٹل گئے تو اس پر مولانا نے مزاحاً کہا کہ دیکھئے! ابھی پیشاب سے فارغ ہوئے ادھر رِی پیشاب کی تیاری ہو رہی ہے اس پر سب کے سب ہنس پڑے۔ جگہ جگہ قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے اور اللہ کی حمد وثنا بیان کرنے کی طرف بار بار متوجہ کرتے رہتے۔ اس طرح یہ سفر بڑا ہی خوشگوار گزرا۔ کاکا سعید احمد صاحب عمری معتمد جامعہ جو آپ سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے، انہوں نے ان کا شاندار استقبال کیا، اپنے دولت کدہ پر ٹھہرایا اور اساتذہ اور طلبہ کے لیے الگ الگ استفادہ کی نشستیں منعقد فرمائی اور دونوں نشستوں میں مولانا مرحوم نے الگ الگ انداز سے نہایت فصیح و بلیغ مگر سادہ، شستہ الفاظ میں نپی تلی مسحور کن باتیں رکھیں جو سننے والے کے اندر جستجو اور شوق کو بڑھا دیتی ہیں، سننے والے میں عمل کا داعیہ پیدا کرتیں اور سونے والوں کو جگا دیتی ہیں۔ طلبہ سے خطاب کرتے وقت محفل میں بعض لوگوں پر اونگھ طاری ہو رہی تھی اسے دیکھ فوراً مولانا نے برجستہ ابوالمجاہد زاہد کا یہ شعر بڑی گرجدار آواز میں پڑھا:

جو سوتے ہیں، نہیں کچھ ذکر ان کا وہ تو سوتے ہیں
مگر جو جاگتے ہیں ان میں بھی بیدار کتنے ہیں

یہ سن کر تمام سونے والوں کی نیند یکلخت غائب ہوگئی وہ چوکنا ہو کر سیدھے بیٹھ گئے۔ معاملات کی شفافیت سے متعلق میں نے دیکھا کہ واپسی پر مولانا کاکا سعید احمد صاحب نے ڈرائیور کے ہاتھ میں سفر خرچ رکھا۔ واپسی میں گزرتے ہوئے شہر وانمباڑی میں بھی مولانا کا خطاب تھا۔ وہاں کے رفقاء نے بھی ڈرائیور کے ہاتھ میں سفر خرچ دے دیا۔ مولانا کو جب معلوم ہوا تو جامعہ دار السلام عمر آباد کی رقم بنگلور پہنچتے ہی فوراً واپس کردی حالانکہ وہ رقم آپ چاہتے تو بیت المال میں جمع کر سکتے تھے۔ مولانا مرحوم ایک مثالی داعی تھے۔ رفقاء کو بارہا یہ نصیحت کرتے میں نے سنا ہے کہ دنیا میں آپ جو کچھ بھی جس حیثیت سے بھی کر رہے ہیں وہ کیجئے مگر آپ کی زندگی کا ابھرا ہوا پہلو داعی کا ہونا چاہئے۔ لوگ آپ کو ایک داعی الی اللہ کی

حیثیت سے پہچانیں۔ بنگلور کے ارب پتی صاحبِ ثروت جناب ضیاء اللہ شریف، مالک انڈیا بلڈرس جو سری رنگ پٹن میں فارغین مدارس کے لیے جدید او رعصری علوم سے روشناس کرانے کا ایک اچھا ادارہ چلاتے ہیں۔ان فارغین کو دو دن مولانا مرحوم کی صحبت میں گزارنے کا موقعہ فراہم کرنے لیے اپنی ہی کار میں خود ڈرائیو کر کے مولانا مرحوم کو دار الامور سری رنگ پٹن لے گئے۔اس سفر میں میں آپ کے ہمراہ تھا،اس میں بہت سی باتیں ایسی ہوئی جن کا میرے دل پر بڑا گہرا اثر پڑا۔بعض کا تذکرہ کرتا ہوں:

جناب ضیاء اللہ شریف ان دنوں بنگلور میں ملت کا ایک بینک جس کا نام ''امانت کوآپریٹیو بینک'' ہے۔ وہ جب خسارہ سے دوچار تھا تو جناب ضیاء اللہ شریف نے آگے بڑھ کر اسے تھاما اور اپنی بہت ساری پونجی اس میں جمع کی اور ڈائرکٹر کی حیثیت سے اس میں اپنا رول ادا کرتے رہے۔ چونکہ یہ ایک سودی بینک تھا تو ملک کے مقتدر علماء نے ان پر اعتراضات اٹھائے تھے کہ آپ کو سودی بینک کا سہارا نہیں بننا چاہئے تھا۔اپنے اطمینانِ قلب کے لیے جناب ضیاء اللہ شریف صاحب نے مولانا مرحوم سے ان اعتراضات کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا مرحوم سے جواب طلب کیا کہ مولانا محترم !اس سلسلہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟ اس پر کوئی فقہی جواب دینے کے بجائے مولانا مرحوم نے داعیانہ جواب دیا اور فرمایا! جناب ضیاء اللہ شریف صاحب! ہر ایک شخص کو اللہ کے سامنے تنہا جوابدہی کرنی ہے وہاں ہر ایک اکیلا وتنہا پہنچے گا۔ میں نے دیکھا کہ اس سفر کے چند ہی دنوں بعد ضیاء اللہ شریف صاحب جو بہت سارے علماء کے اعتراضات کے باوجود بینک میں اپنی خدمات جاری رکھے تھے۔ مولانا مرحوم کی صحبت اور اس داعیانہ جواب کے کچھ ہی مدت بعد بینک کی خدمت سے سبکدوش ہوگئے۔ پھر سفر میں مولانا مرحوم نے ہندوستان میں مسلم حکمرانوں کے دورِ حکومت کی تاریخ کے کچھ سبق آموز واقعات سنائے۔ جب منزل پر پہنچے تو جناب ضیاء اللہ شریف صاحب نے مولانا مرحوم سے کہا کہ اللہ نے مجھے خوب دولت سے نوازا ہے میں کوئی بڑا کام کرنا چاہتا ہوں۔آپ بتائیں میں کیا کروں؟ ان کا منشا یہ تھا کہ مولانا مرحوم کچھ مطالبہ جماعت کے لیئے رکھیں تو ضیاء اللہ شریف صاحب اسے قبول کر لینے میں اپنی لیے بڑی سعادت سمجھیں گے۔لیکن مولانا مرحوم نے بڑے ہی استغناء اور

بے نیازی کے ساتھ ان شاء اللہ کہہ کر معنی خیز خاموشی اختیار کی۔ اخیر تک شریف صاحب کے سامنے کوئی مطالبہ نہیں رکھا جبکہ وہ منتظر ہی رہے۔ اس شانِ بے نیازی نے بھی میرے قلب پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ بہر حال مولانا مرحوم کی صحبت میں ایمان تازہ ہو جاتا، آپ کی صحبت میں بیٹھنے والا کبھی محروم نہیں اٹھتا۔ مولانا مرحوم کا سانحہ ارتحال نہ صرف قافلہ تحریک اسلامی کے لیے بلکہ پوری ملت اسلامیہ ہند کے لیے جہاں انتہائی رنج والم کا باعث ہے وہیں ایک بہت بڑا دینی وملی وتحریکی خلا اور خسارہ بھی ہے۔ حضرت مولانا سے ہم سب اللہ کے لیے والہانہ محبت وعقیدت رکھتے تھے، میں دل کی عمیق گہرائیوں سے دعا گو ہوں اور آپ بھی دل سے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالی آپ کی مغفرت فرمائے، آپ کی جملہ مساعی جمیلہ کو شرف قبولیت عطا کرے، آپ کی بے لوث خدمتوں کا بے پایاں صلہ اپنی شان کریمی کے شایان شان عطا کرے، آپ کی قبر مبارک کو جنت کا باغیچہ بنادے، حد نظر تک وسیع کردے، جنت الفردوس کے نہایت بلند وبالا بالا خانوں میں آپ کی میزبانی فرمائے اور تمام پسماندگان، فرزندان، قرابت داروں، عقیدت مندوں، متعلقین، لواحقین اور محبین کو صبر جمیل عطا کرے، تحریک اسلامی اور ملت اسلامیہ ہند کو آپ کا نعم البدل عطا فرمائے آمین۔

گہرا مطالعہ، وسیع تجربات

ڈاکٹر سکندر علی اصلاحی، لکھنؤ

صوفی کی طریقت میں فقط مستیِ احوال
ملا کی شریعت میں فقط مستیِ گفتار
شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق
افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیِ کردار

یہ اشعار علامہ اقبال علیہ الرحمہ کے ہیں۔ انھیں شکایت تھی کہ مردِ مجاہد نظر نہیں آتا، مگر میں پورے یقین سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ اگر علامہ کی ملاقات ہمارے مولانا محترم محمد سراج الحسن صاحب علیہ الرحمہ سے ہوتی تو یہ شکایت ہرگز نہ کرتے۔ مولانا بڑی عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ میں نے مولانا ابو اللیث اصلاحی ندویؒ، مولانا صدر الدین اصلاحیؒ، مولانا انعام الرحمٰن خاںؒ، مولانا سید حامد علیؒ، ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدیؒ، ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاریؒ اور مولانا سید جلال الدین عمری مدظلہ کو کسی نہ کسی حد تک ضرور دیکھا ہے۔ ان کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔ کسی سے کم کسی سے زیادہ۔ یہ تمام تحریک اسلامی کے روشن ستارہ ہیں۔ ملت اسلامیہ ہند کے سرمایہ اور ہیرے و جواہرات ہیں۔ اپنی حسنات و خوبیوں میں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ مگر مجھے مولانا محمد سراج الحسن صاحب سابق امیر جماعت اسلامی ہند کے ساتھ تین بار دس دن اور پندرہ دن ساتھ رہنے کی سعادت حاصل رہی ہے۔ اس لیے بعض پہلوؤں سے میں ان سے بہت متأثر ہوا اور اسی لیے میں ان سے بڑی محبت کرتا تھا۔

میری ان سے سب سے پہلی ملاقات سرائے میر ضلع اعظم گڑھ میں ہوئی تھی ۔1985 میں وہ تنظیمی دورہ پر تشریف لائے تھے۔مقامی امیر جناب حاجی مطلوب احمد صاحب مرحوم کے دولت کدہ پر قیام تھا۔غالبًا چار پانچ دن آپ ٹھہرے تھے۔میں ان دنوں مدرسۃ الاصلاح میں درجہ عربی سوم کا طالب علم تھا۔حاجی صاحب کے حکم کے مطابق میں ان کی خدمت پر مامور تھا۔علاقہ کے تمام ارکان جماعت وقفہ وقفہ سے آتے اور ان سے انفرادی ملاقاتیں کرتے۔مجھے ان دنوں یہ تو نہیں معلوم تھا کہ مسئلہ کیا ہے؟ مگر اکثر لوگوں کو دیکھتا کہ بڑے غصے میں ناراضگی کے عالم میں حتیٰ کہ سخت سست باتیں کرتے جس سے میں ناگواری محسوس کر رہا تھا۔ مگر مولانا بڑے تحمل کے ساتھ،اطمینان سے تمام باتوں کو سنتے،سنجیدہ رہتے،کبھی کچھ بولتے اور پھر خاموش ہو جاتے مگر رخصت کرتے ہوئے ہر ایک کو اپنے کشادہ سینے سے اس طرح لگاتے کہ پتھر دل انسان بھی موم ہو جاتا۔نہیں معلوم اس سینے میں کیسی حرارت تھی ۔اس موقع پر حاجی مطلوب صاحب جو امیر مقامی تھے اور ان کے میزبان بھی تھے،انہیں بھی سخت انداز میں اظہار خیال کرتے ہوئے دیکھا،حالانکہ وہ خود بڑے متحمل اور بُردبار تھے مگر موضوع ہی ایسا تھا کہ پوری جماعت میں فکری انتشار تھا۔لوگ بے چین تھے۔بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ الیکشن کا ایسا عنوان تھا جو پوری جماعت اسلامی ہند بالخصوص شمالی ہند کے لیے شعلۂ جوالہ بنا ہوا تھااور معلوم ہوتا تھا کہ جماعت بارود کے ڈھیر پر کھڑی ہے اور بس دو حصوں میں تقسیم ہونے والی ہے۔رات دن بس یہی چرچا ہوتا۔اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے حضرت مولانا صدرالدین اصلاحی علیہ الرحمہ کو۔ پورے ہندوستان سے برابر لوگ ان کے پاس آ رہے تھے،اپنی بے چینی کا اظہار کر رہے تھے،مولانا کو ''قیادت'' کے لیے آمادہ کر رہے تھے مگر مولانا اپنے تمام تر اختلاف کے باوجود جماعت کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کی ہدایت دے رہے تھے۔مولانا محمد سراج الحسن صاحب مرحوم کے ساتھ اس موقع پر پہلی مرتبہ مولانا صدرالدین اصلاحی علیہ الرحمۃ کو دیکھا تھا۔ان کے سامنے مولانا سراج الحسن صاحب اس طرح بیٹھے تھے جیسے کہ کوئی شاگرد اپنے استاذ کے سامنے بیٹھتا ہے۔

اس موقع پر بہت ساری نرم و گرم باتیں ہوئی۔مختلف لوگوں سے ہوئیں،مجھے باتیں تو یاد

نہیں ہیں مگر منظر بلکہ مناظر یاد ہیں۔مولانا احمد محمود اصلاحی صاحب اکثر بعد نماز فجر آتے اور ذرا دیر میں اکھڑی اکھڑی باتیں کرنے لگتے۔ایک روز صبح ناشتہ کی میز پر جس طرح سے بات ہوئی اس کا افسوس آج بھی مجھے ہوتا ہے۔

مولانا سراج الحسن صاحب مرحوم بڑی پابندی سے اپنے ٹرانزسٹر سے خبریں سنا کرتے تھے۔اس صبح میں غالباً بی بی سی سے خبریں سن رہے تھے۔لنگی ، بنیان اور سر پر ٹوپی ،ایک ہاتھ میں ریڈیو کان سے لگائے ہوئے ناشتہ کی میز پر بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔کل پانچ لوگ تھے۔مولانا کی توجہ ناشتہ پر کم اور خبر پر زیادہ تھی،اسی دوران کسی نے معلوم نہیں کیا کہا کہ بالکل سناٹا چھا گیا۔مولانا کا چہرہ بالکل بدل گیا وہ اور بھی سنجیدہ ہو گئے اور پھر خاموشی سے اٹھے اور ہاتھ دھولیا۔اس بات کا افسوس حاجی مطلوب صاحب کو بھی آخر وقت تک رہا اور جب یاد کرتے تو وہ بات کہنے والے پر ناراض ہوتے۔غالباً چار روز قیام کر کے جب وہ محمد پور یا بلریا گنج کے لیے روانہ ہو رہے تھے تو اس وقت کا منظر خوشگوار تھا۔ہر ایک سے معانقہ کر رہے تھے اور دس بارہ لوگ تھے جو بڑے خوش وخرم نظر آرہے تھے۔مولانا نے مجھے بھی سینے سے لگایا تھا اور ڈھیر ساری دعائیں دی تھیں جس کی حرارت بہت دنوں تک قائم رہی تھی۔

دوسری ملاقات 1993 میں مرکز میں ہوئی۔سلام ومصافحہ و معانقہ کے بعد میں ان کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔تعارف ہوا اور جب میں نے بتایا کہ آپ سرائے میر تشریف لائے تھے اور چار روز قیام کیا تھا تو مجھے آپ کی خدمت کرنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی تو بہت خوش ہوئے۔فرمایا جی بالکل یاد آ گیا اور اپنی کرسی سے اٹھ کر پھر ایک بار اپنے سینے سے لگایا۔میں ان دنوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا اور اسٹوڈنٹ اسلامک موومنٹ کی سرگرمیوں سے تقریباً اپنے آپ کو الگ کر لیا تھا۔حالانکہ ''اقدام امت'' کانفرنس ممبئی تک میں اس طرح متحرک اور فعال تھا کہ پوری یونیورسٹی میں ایس آئی ایم کے فرد کی حیثیت سے خوب جانا پہچانا جاتا تھا۔شب و روز بس ایک ہی دھن تھی کہ یہاں کے تمام طلبہ تحریک سے کس طرح وابستہ ہو جائیں۔ہر وقت آٹھ دس لڑکوں کی جمعیت ساتھ ہوتی اور کوئی نہ کوئی منصوبہ اور پروگرام زیر غور ہوتا۔عرض کرتا چلوں کہ اس وقت ہم لوگوں نے طے کیا تھا کہ یونیورسٹی کے تمام ہال اور ہر ہال

کے تمام ہوسٹل ، ہر ہوسٹل کے تمام کمرے اور ہر کمرے کے ایک ایک طالب علم تک اسلام کا پیغام پہنچانا ہے اور تحریک کا تعارف کرانا ہے۔اس کے لیے الگ الگ ذمہ داریاں تقسیم کی گئی تھیں ۔ یہ وہ دور تھا جب جناب عفان بدر صاحب اپنی تعلیم مکمل کر کے جانے ہی والے تھے اور جناب جاوید انور صاحب کلکتہ یونٹ کے صدر ہوئے تھے۔ مجھے لائبریری ،آفس کی صفائی ستھرائی اور تربیت کے نقطۂ سے مختلف ہال میں نماز فجر سے پہلے جاکر وابستگان تحریک کو جگانے کی ذمہ داری دی گئی تھی ۔ کیا لطف آتا تھا اور کس قدر جوش وجنون تھا۔سخت سردی ہوتی اور کشمیر ہاسٹل ،سلیمان ہال سے ہادی حسن ہال جا کر دوستوں کو جگانا،نماز فجر ادا کرنا ،حسب حال کبھی مختصر درس قرآن دینا اور پھر کسی کے ساتھ جلیبی ، بریڈ اور دہی کا ناشتہ کرنا۔کاش کہ وہ دن پھر لوٹ آئے اور پھر اسی طرح سرد وگرم ماحول میں دین اسلام کے غلبہ کی جدو جہد کرتے ۔

بات کر رہا تھا کہ مولانا محمد سراج الحسن صاحب نے دوبارہ معانقہ کیا اور اپنے مخصوص انداز میں کبھی سرد آہیں بھرتے اور کبھی مسکراتے اور مختلف موضوعات پر اظہار خیال کرتے۔ تقریباً ایک گھنٹہ کی ملاقات رہی اور بہت ساری ذمہ داریوں کا بوجھ لے کر میں رخصت ہوا۔ اس زمانے میں موبائیل نہیں تھا۔فون کی لائن لگانے پر کئی کئی گھنٹے صرف ہو جاتے ۔آسان طریقہ خط وکتابت کا تھا۔میں نے ایک خط لکھا۔میرا خیال تھا کہ مولانا امیر جماعت ہیں ،اتنی فرصت کہاں کہ جواب لکھیں گے مگر ایک ہی ہفتہ کے دوران مولانا کا پوسٹ کارڈ موصول ہوا۔ خود اپنے قلم سے لکھا تھا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی ۔میں نے ایک منصوبہ بنایا کہ منتخب طلبہ کو مولانا کے نام ایک خط لکھنے کو کہا جائے ۔مولانا کا جواب آئے گا تو یقیناً طلبہ خوش ہوں گے ۔اپنے لیے امیر جماعت کا خط پا کر حیرت ہوگی اور ممکن ہے یہی عمل جماعت اسلامی سے وابستگی کا ذریعہ بن جائے۔میں ان دنوں مقامی جماعت کے تمام افراد کے پاس سے پرانے دعوت کے شمارے زندگی نو اور کانتی کی کاپیاں حاصل کر کے جماعت اسلامی ہند کی مہر لگا کر تمام ہال میں کمرہ کمرہ میں پہنچایا کرتا تھا۔ میں نے ایک سو طلبہ کی فہرست تیار کی ۔ پوسٹ کارڈ خرید لایا۔سب پر مرکز جماعت کا ایڈریس لکھا۔ایک مضمون تیار کیا اور ان طلبہ سے ملاقات کر کے انھیں آمادہ کر کے وہی مضمون کچھ تبدیل کر کے لکھواتا اور ان کے ساتھ جا کر پوسٹ کرتا۔میری حیرت اور خوشی کی انتہا

نہیں رہتی جب طلبہ مجھے اطلاع دیتے کہ امیر جماعت اسلامی ہند کا خط میرے نام آیا ہے۔ پورے ایک سو کا ٹارگیٹ پورا کیا۔ان میں کئی ایک ہیں جنھوں نے پوسٹ کارڈ سنبھال کر رکھا ہے اور چند ہیں جو اسی عمل سے جماعت کے مداح ہی نہیں فعال کارکن ہیں ۔یہ مولانا کی عظمت اور تحریک کے لیے فکر مندی کی واضح مثال ہے۔

اس کے بعد اکثر ملاقاتیں ہونے لگیں اور ہر ملاقات کے بعد انسیت و محبت اور اپنائیت میں اضافہ ہو جاتا۔1995 میں حیدر آباد میں ارکان جماعت اسلامی ہند کا اجتماع منعقد ہوا۔ علی گڑھ کے احباب کے ساتھ میں بھی حاضر ہوا۔ وہاں بھی مولانا بڑی محبت سے ملے اور واپسی کا پروگرام پوچھا۔ میں نے عرض کیا کہ جیسا آپ حکم فرمائیں ۔انھوں نے کہا اگر ممکن ہو تو اجتماع کے بعد ٹھہریے۔مولانا نے جناب عبدالباسط انور صاحب سے میرا تعارف کرایا اور اجتماع کے اختتام کے بعد قیام کا نظم کرنے کو کہا۔ بہت ہی یادگار اجتماع تھا۔مولانا عبدالعزیز صاحب ناظم اجتماع تھے۔میرا زیادہ تر وقت مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب اور مولانا عبدالعلی خاں اصلاحی صاحب کے ساتھ گزرا تھا۔

اجتماع کے بعد مولانا نے ایک ہفتہ قیام کیا ہوگا۔روزانہ کہیں نہ کہیں میٹنگ اور ظہرانہ وعشائیہ ہوتا۔میٹنگ میں تو میں شریک نہیں رہتا تھا مگر کھانے میں البتہ بڑا مزہ آتا تھا۔مولانا بھی خاص طور پر ضرور پوچھتے کہ ''ارے بھائی دیکھئے سکندر صاحب ہوں گے، بلائیے بلائیے''، اور اپنے قریب بٹھاتے ،شرکاء سے تعارف کراتے ۔سعید آباد کے فنکشن ہال میں کسی صاحب کی جانب سے دعوت ولیمہ تھی ۔اس وقت مولانا سراج الحسن صاحب کے علاوہ مولانا عبدالعزیز صاحب،مولانا عبدالقیوم صاحب ،مولانا عبدالرشید صاحب،مولانا اعجاز احمد اسلم صاحب، مولانا سید محمد یوسف صاحب،مولانا غلام اکبر صاحب ،ایس ایم ملک صاحب،عبدالباسط انور صاحب ،حامد محمد خاں صاحب ،مولانا عبدالعلیم اصلاحی صاحب،مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب اور متعدد حضرات موجود تھے اور بڑی پُر لطف گفتگوئیں ہو رہی تھیں۔

ایک ہفتہ یہ سلسلہ رہا اور پھر مولانا بنگلور چلے گئے تھے اور میں اعظم گڑھ کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ یہ سفر نہایت قیمتی سفر تھا اور اس سفر میں مولانا کے اخلاق و کردار ، بالخصوص بے انتہا

مصروفیت اورلوگوں کی بھیڑ کے باوجود مجھے ان کا یاد رکھنا اور ہر وقت خیریت معلوم کرنا، بڑی اہم بات معلوم ہوتی ہے۔

اس کے بعد بھی گاہے بگاہے ملاقاتیں ہوتی رہتیں۔ وہ اس دوران علی گڑھ بھی تشریف لاتے۔ کینیڈی ہال اور مختلف جگہوں پر ان کے پرسوز اور بصیرت افروز خطاب ہوتے۔ کبھی کبھی مجھے خیال ہوتا تھا کہ مولانا اس پروگرام کی صدارت کیا کریں گے۔ یہاں تو بڑے بڑے پروفیسر، دانشور اور انٹلکچول ہیں۔ شاید مولانا کا خطاب عام اور ہلکا پڑ جائے گا۔ مگر میری خوشی بے انتہا بڑھ جاتی تھی جب مولانا کی صدارتی گفتگو سب پر حاوی ہو جاتی تھی اور لوگ مولانا سے عقیدت سے طالب علم کی طرح مل رہے ہوتے۔

دہلی میں جماعت اسلامی ہند حلقہ دہلی پردیش کے زیراہتمام ایوانِ غالب میں ایک سمپوزیم بعنوان Saffronization of education منعقد ہوا۔ صدارت مولانا محمد سراج الحسن امیر جماعت اسلامی ہند کی تھی۔ نظامت ڈاکٹر محمد قاسم رسول الیاس اور ڈاکٹر محمد رفعت صاحب کی تھی۔ اسٹیج پر جناب وشواناتھ پرتاپ سنگھ سابق وزیراعظم ہند، جناب آئی کے گجرال سابق وزیراعظم ہند، جناب دیوگوڑا سابق وزیراعظم ہند، جناب چندر شیکھر سابق وزیراعظم ہند اور متعدد نمایاں ترین دانشور افراد موجود تھے۔ سامعین میں جناب ہاشم قدوائی سابق گورنر، جناب خلیق الرحمٰن قدوائی سابق گورنر، سید شہاب الدین سابق سفیر ہند اور دیگر بہت سارے حضرات موجود تھے۔ بڑی عالمانہ اور پرمغز گفتگو ایک سے بڑھ کر ایک کی جانب سے ہو رہی تھی۔ بہت سارے لوگوں کی گفتگو بے وزن بھی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے شنکرآچاریہ مادھو آنند جی، سوامی اگنی ویش جی، امرتسر سے آئے جناب سرجیت سنگھ جی جیسے لوگ فلاپ دکھائی دے رہے تھے۔ میرے دل میں بار بار خیال ہوتا کہ آج کیا ہوگا۔ مولانا کیا کہیں گے۔ ڈھائی گھنٹے کا پروگرام اپنی آخری منزل پر تھا۔ صرف سات منٹ کا وقت صدارتی کلمات کے لیے باقی رہ گیا تھا۔ واہ مولانا واہ۔ پانچ تا سات منٹ میں مولانا نے اس طرح پورے عزم و حوصلہ اور سوز و ساز کے ساتھ اظہار خیال کیا کہ تمام لوگوں پر وزنی محسوس ہو رہے تھے۔ تمام سامعین خوش تھے اور مولانا کو داد دے رہے تھے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ مذکورہ تمام لوگ بڑی محبت سے

مولانا سے مصافحہ کر رہے تھے اور پھر مولانا ہر ایک کو رخصت فرمارہے تھے۔

مولانا کوئی مستند عالم اور سند یافتہ اسکالر تو نہیں تھے مگر اپنے مسلسل گہرے مطالعہ، قرآن و سنت سے علمی و عملی رابطہ اور وسیع تجربات نے مولانا کو ملک کے ممتاز علماء و دانشوروں کی صف میں لا کھڑا کر دیا تھا۔ جس کا اعتراف متعدد بار ڈاکٹر سید کلب صادق صاحب اور جناب سید حامد صاحب سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے کیا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے مہمان خانہ میں ایک موقع پر حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب مرحوم سابق امیر شریعت سے میں نے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ میں نے تنہائی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے مسائل پر گفتگو کرنا چاہا۔ مولانا نے چند لوگ جو اس وقت کمرہ میں موجود تھے، انہیں باہر جانے کا حکم دیا۔ میں نے صدارت اور جنرل سکریٹری کے موضوع پر چند مسائل اور ان کے حل پر اظہار خیال کیا۔ مولانا کا بڑکپن تھا کہ انھوں نے پوری توجہ سے میری بات سنی ۔ کچھ باتوں کی وضاحت کی اور کچھ کا اعتراف کیا۔ بہت ساری باتوں کے علاوہ ایک بات انھوں نے فرمائی کہ مولانا محمد سراج الحسن صاحب آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی صدارت کے لیے اور جناب سید محمد جعفر صاحب قیم جماعت اسلامی ہند بورڈ کے جنرل سکریٹری کے عہدہ کے لیے بہت مناسب ہیں مگر چونکہ جماعت اسلامی سے وابستہ ہیں ،اس لیے لوگ انھیں قبول نہیں کریں گے۔ اسی وقت مولانا نے بتایا تھا کہ سید محمد جعفر صاحب ان کے بھانجے ہیں۔ یہ پہلے مجھے معلوم نہیں تھا۔

بہت سارے واقعات کو چھوڑتے ہوئے ایک سفر کا ذکر کر کے اپنی بات مختصر کرتا ہوں۔ 1998 میں جماعت اسلامی ہند حلقہ کیرالہ کا اجتماعِ عام تھا۔ جناب محمد احمد صاحب، مولانا طارق فارقلیط فلاحی مرحوم اور دیگر رفقاء کے ساتھ میں بھی ملاپورم گیا۔ ہم لوگ بالخصوص اس لیے بھی گئے تھے کہ 1999 میں شمالی ہند کا اجتماع عام الہ آباد میں ہونا تھا۔ مولانا مرحوم امیر جماعت نے ہدایت کی تھی کہ ایک وفد جا کر وہاں کے انتظامات کا جائزہ اور استفادہ کرے۔ چنانچہ ہم لوگ گئے ، دیکھا، سمجھا، پوچھا، جانچا مگر حقیقت واقعہ یہ ہے کہ وہ دنیا الگ ہے اور شمالی ہند کی دنیا الگ ہے۔ اس اجتماع عام میں سید قطب شہید علیہ الرحمہ اور زینب الغزالی علیہا الرحمۃ کے بھائی محمد قطب علیہ الرحمہ تشریف لائے تھے ۔ ان کو دیکھنا اور ان سے

مصافحہ کرنا میرے لیے اس اجتماع میں شرکت کا حاصل تھا۔

اجتماع کے اختتام کے بعد طے شدہ پروگرام کے مطابق مجھے ملاپورم میں ٹھہرنا تھا اور باقی لوگ لکھنؤ واپس آ گئے تھے۔ دو دن بعد امیر جماعت محترم کی قیادت میں ایک وفد بائی روڈ سفر پر روانہ ہوا۔ ہم ٹاٹا سومو میں سوار تھے۔ ڈرائیور جناب عبدالاحد صاحب میسور کے رہنے والے تھے جو مولانا کے نہایت عقیدت مند نوجوان تھے۔ مولانا مرحوم آگے والی سیٹ پر تشریف فرما تھے۔ درمیان میں ایک دروازے کی جانب مولانا سے پیچھے مولانا سید جلال الدین عمری صاحب دامت برکاتہم اور دوسرے دروازے کی جانب ڈرائیور کے پیچھے میں تھا اور بیچ میں جناب سید محمد جعفر صاحب قیم جماعت اسلامی ہند تشریف فرما تھے۔ یہ سفر بڑا دلچسپ اور سبق آموز تھا۔ جنوبی ہند کے بہت سارے مقامات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ مولانا پورے سفر میں اپنے تجربات، واقعات اور بالخصوص کلیات اقبال کی طویل نظمیں اور بے شمار اشعار ہم لوگوں کو سنا رہے تھے۔ غضب کی یادداشت تھی۔ بہترین کھانے، مچھلی کی مختلف قسمیں اور طرح طرح کے پکوان سے جگہ جگہ ضیافت کا انتظام تھا۔

اسی سفر میں بھٹکل میں جناب مظفر کولا صاحب کے گھر پر پُرتکلف دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ وہاں پر حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی حسنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق کل ہند صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ بھی تشریف لائے تھے۔ جناب عبدالعزیز سیٹھ صاحب، پروفیسر عمر حیات غوری صاحب اور متعدد معزز حضرات سے ملاقات اور دسترخوان پر حاضر ہو کر ہم طعامی کا شرف حاصل کیا تھا۔ بھٹکل سے منگلور آئے۔ کئی جگہوں پر پروگرام، ملاقات اور خطاب وغیرہ تھا۔ مولانا سید جلال الدین عمری صاحب اور جناب سید محمد جعفر صاحب منگلور سے دہلی کے لیے روانہ ہو گئے تھے اور ہم لوگوں کے آگے کے سفر میں جناب ابراہیم سعید صاحب مرحوم سابق امیر حلقہ کرناٹک اور ایک صاحب اور نام یاد نہیں رہا ہمراہ ہوئے۔ اڑپی، ہاسن اور میسور ہوتے ہوئے بنگلور آئے تھے۔ اڑپی میں مولانا عبدالقدیر اصلاحی صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ جگہ جگہ استقبال اور پروگرام ہوتے رہے۔ ہاں ایک دلچسپ بات یاد آئی، بھٹکل سے پہلے ایک موقع پر مولانا نے جنوبی ہند کے قانون وضوابط، ڈسپلن کی خوبی اور اتر پردیش میں ٹریفک

وغیرہ کے نظام کی بدحالی پر ذکر فرما رہے تھے۔ یہ ذکر ہو رہا تھا، گاڑی چل رہی تھی۔ اسی دوران گایوں کا ایک ریوڑ روڈ کے کنارے کنارے سامنے سے آ رہا تھا۔ مولانا نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ''دیکھئے سکندر علی صاحب، یہ دیکھئے یہاں کے چوپایوں میں بھی نظم اور ڈسپلن کا شعور ہے۔ وہ جب یہ بات فرما رہے تھے اسی لمحہ ایک بچھڑے نے روڈ کراس کیا۔ میں نے کہا۔ دیکھئے مولانا یہ بچھڑا؟ مولانا نے اپنے مخصوص لہجہ میں بروقت کہا کہ ''اجی یہ یوپی سے آیا ہوگا''۔ یہ جملہ اتنا برمحل تھا کہ وہ مجھ ہی پر صادق آ رہا تھا۔ سبھی لوگ بہت دیر ہنستے اور محظوظ ہوتے رہے۔

بنگلور میں ایک رات مولانا کے ایک بیٹے ڈاکٹر صاحب کے گھر قیام رہا۔ دوسرے دن سویرے ہی انھوں نے ایک صاحب کو بلوایا۔ وہ آئے تو میرا تعارف کرایا اور ان سے کہا کہ یہ آپ کے مہمان ہیں اور آپ ان کو لے جائیے اور بنگلور کے تمام قابل ذکر مقامات کی سیر کرائیے۔ یہ تھے جناب حامد محسن صاحب جو بعد میں السلام سنٹر بنگلور کے حوالہ سے کافی معروف ومشہور ہوئے۔ انھوں نے اپنی چھوٹی پہلی کار زین Zen سے سیر کرائی۔ اچھے سے اچھے ہوٹل میں ناشتہ اور کھانا کھلایا۔ رات ان کے گھر قیام رہا۔ مولانا فون پر خیریت معلوم کرتے اور ان کو مزید نشاندہی کرتے۔ فلاں جگہ اور فلاں مقام پر بھی لے جائیے اور پھر حامد محسن صاحب بڑی محبت اور اطاعت کے جذبے سے میری خاطر اپنا وقت اور اپنا روپیہ بلا تکلف خرچ کر رہے تھے۔ تیسرے دن مولانا رائچور کے لیے روانہ ہوئے اور حامد بھائی نے مجھے ریلوے اسٹیشن تک ٹرین سے دہلی کے لیے رخصت کیا تھا۔ وہ سفر، اس کی یادیں اور مولانا کی محبت اور ان کی شفقت تا حیات میری مونس وغم گسار رہیں گی۔

آخری ملاقات ابھی ڈیڑھ سال پہلے مولانا کے دولت کدہ رائچور میں ہوئی تھی۔ اب تک تین بار مولانا کے گھر پر صرف ملاقات کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ مولانا بہت خوش ہوئے۔ بیماری اور نسیان کی کیفیت میں بھی قیام و طعام کی فکر کرتے اور اپنے بیٹوں کو ہدایت کرتے۔ فون سے بھی میں اکثر رابطہ رکھتا تھا۔ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ جنت الفردوس میں اعلی مقام پر فائز کرے اور ہم پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔ ربنا اغفر وارحم و انت خیر الراحمین۔

ہزار خوف ہو لیکن، زباں ہو دل کی رفیق

ساجد احمد عمری، کرے بلچی

یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب کہ میری عمر ابھی کچّی تھی۔ اگر میری یادآوری درست ہے تو غالباً یہ 1980 کا تذکرہ ہے۔ بنگلور سے حلقہ کرناٹک کے ذمہ داروں کا ایک وفد، جس میں مولانا مرحوم سراج الحسن صاحب، مرحوم جعفر منیار صاحب، مرحوم محمود خان صاحب شامل تھے، بذریعہ کار میرے قصبے کمسی آیا ہوا تھا۔ میرے حافظہ کی جھلکیوں کو اگر میں عمدگی کے ساتھ بیان کر پا رہا ہوں تو اس وقت نیلے رنگ کی ایک جیپ ہمارے گھر کے آنگن میں رکی تھی۔ حلقہ کا یہ وفد میرے والد مرحوم (المعروف بہ کمسی) سے ملاقات کی غرض سے آیا ہوا تھا۔ والد محترم اس زمانے میں مولانا مودودیؒ کی انقلابی تحریریں اور کتابیں پڑھنے کے نتیجے میں تحریک اسلامی سے متاثر تھے۔ تأثّر وہ جو بذات خود اثر انگیزی کا باعث بنے۔ جماعت کی فکر سے متفق رہنے کا مطلب یہ تھا کہ اب میدان کار میں اتر جائیں۔ الحمدللہ یہ والد محترم کی تحریکیت ہی کا نتیجہ تھا کہ ان کی کوششوں کے نتیجے میں مرحوم حافظ شبیر صاحب اور مرحوم عبد المجید صاحب جیسی فعال شخصیتیں تحریک سے وابستہ ہو چکی تھیں۔

حلقہ کرناٹک کے ذمہ داروں کے اس وفد کے درمیان اسلامیہ عربک کالج منصورہ کا منصوبہ زیر بحث تھا۔ ان کی کمسی آمد کا مقصد اس ادارہ کے لیے ایک مناسب جگہ منتخب کرنا تھا۔ کمسی میں ایک خالی پلاٹ ہمارے گھر کے بالکل قریب، تقریباً پچاس ایکڑ پر محیط، مرحوم حافظ شبیر صاحب اور ان کے بھائیوں کا تھا۔ چند وجوہات کے پیش نظر مولانا مرحوم سراج الحسن نے اس جگہ کو ناپسند کیا۔ پھر ایک دوسری جگہ پر منصورہ کے قیام کا فیصلہ لیا گیا۔

یہ وہ موقعہ تھا جب کہ پہلی مرتبہ میں نے مولانا مرحوم کو دیکھا تھا۔ اس پہلی نگاہ کے بعد

میرے دل و دماغ پر ایک اللہ والے کی تصویر مرتسم ہوگئی تھی۔ کہتے ہیں کہ جس کے اندرون سے خلوص کی خوشبو آتی ہو، جس کی زبان میٹھی ہو اور جو ظاہری جسامت اور رعب کے باوجود دلوں پر حکومت کرنے کے ہنر سے واقف ہو، اسی کی شخصیت سحر آفرین اور اسی کا کردار متاثر کن ہوتا ہے۔ اور کچھ ایسا ہی معاملہ مولانا مرحوم کی شخصیت، میرے مشاہدے اور میرے دل و دماغ پر اس کے اثر کا تھا۔

ویسے والد صاحب کی تربیت اور ان کے معمولات زندگی نے تحریک کے لیے دل کی زمین کو زرخیز تو بنا دیا تھا لیکن حقیقی معنوں میں تحریک اسلامی کے لیے محبت، انسیت اور تعلق کا بیج دل کی زرخیز زمین میں اس وقت پڑا جب کہ مولانا مرحوم کی سحر آفریں شخصیت نے چند ہی لمحوں میں مجھے اپنا گرویدہ بنالیا۔

پھر اسی تاثیر کے نتیجے میں میں والد محترم کے ساتھ اکثر نمازِ فجر کے بعد ریڈیو پر نشر ہونے والے دروس قرآن سے مستفید ہوتا رہا۔ یہ سلسلہ کوئی سال ڈیڑھ سال چلتا رہا۔ کچی عمر میں قرآ ن مجید کے ساتھ دروس قرآن کے ذریعہ یہ تعلق بڑا مبارک ثابت ہوا۔ دل میں دینی علوم کے حصول کی آرزو پیدا ہوئی۔ 1981 میں مدرسے میں تعلیم کی غرض سے جامعہ دارالسلام عمرآباد چلا گیا۔ عمرآباد میں قیام 1989 تک رہا۔ اس عرصے میں مولانا محترم سے ملاقات کا شرف حاصل نہ ہوسکا۔ حسنِ اتفاق مولانا مرحوم سے دوسری ملاقات 2005/2006 میں اسلامیہ عربک کالج منصورہ میں ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ میری اپنی ذاتی قابلیت اور علمی استعداد مولانا مرحومؒ سے پہلی ملاقات کے مقابلے میں اگلے درجے پر تھی۔ میں نے مولانا مرحومؒ کی شخصیت میں بلا کی جاذبیت، مومنانہ رعب و وجاہت اور تحریک اسلامی کے لیے کڑی تڑپ و لگن محسوس کی۔ منصورہ میں قیام کے دوران مولانا مرحوم میں ایک ایک فرد کے لیے لگاؤ اور بے لوث جذبہ محبت پایا۔ تحریک کے نصب العین کے بارے میں مولانا مرحوم کی زبانی وضاحت اور تفصیلات جان کر اس بات کا احساس ہوا کہ ؎

میری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں میں اسی لیے نمازی

والہانہ محبت ،سادگی طبع ،مشفقانہ گفتگو۔نبض شناسی مولانا مرحوم کی شخصیت کے پرتو تھے۔یاددہانی کی خاطر نئی نئی ترکیبیں وضع کرنا آپ کا تقریری کمال تھا۔مثلاً رفقاءتحریک کو مطالعہ پر توجہ دلاتے ہوئے مولانا فرماتے کہ مطالعہ میں تین ''ت'' کو یاد رکھا جائے ایک ت سے ترتیب دوسری ت سے تسلسل اور تیسری ت سے تکرار۔والد صاحب سے میں نے یہ بھی جانا تھا کہ مولانا مرحوم حد درجہ محتاط اور تقوی شعار تھے۔چند دن پہلے مولانا کے ہسپتال میں داخل کئے جانے کی خبر سن کر دل صدمہ سے دوچار ہوا۔ابھی ہسپتال سے رہائی کی خبر پھیلی بھی نہ تھی کہ اپریل کی دوسری تاریخ کو،جب کہ کرونا وائرس کے نتیجے میں سارا ملک لاک ڈاؤن کا شکار تھا، یہ اندوہ ناک خبر موصول ہوئی کہ مولانا محترم اس دار فانی سے کوچ کر گئے اور اپنے رب حقیقی سے جا ملے۔یہ خبر ہمارے لیے بڑی دل فگار بنی۔آپ کی جدائی سے تحریک اسلامی ایک اہم قائد کے سائے سے محروم ہوگئی۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بےنوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ہم بارگاہ رب العزت میں دعاگو ہیں کہ وہ مولانا مرحومؒ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے ،آپ کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔جملہ متعلقین کو صبر جمیل اور تحریک اسلامی کے لیے آپ کا نعم البدل عطا فرمائے ،آمین۔

ایک حقیقی مومن

ابو صفا، بھٹکل

2 اپریل 2020 کی سہ پہر کو خبر آئی کہ مولانا سراج الحسن صاحب نے داعی اجل کو لبیک کہا، ابھی جنوری میں ڈاکٹر سعد بلگامی صاحب امیر حلقہ کرناٹک سے ملاقات میں معلوم ہوا تھا کہ وہ گر گئے ہیں، اور ان کی کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے، اور وہ اس حالت میں نہیں ہیں کہ رائچور سے بنگلور کسی ترقی یافتہ ہسپتال میں منتقل کر کے ان کا علاج کیا جائے، اسی وقت ذہن ٹھٹھک کر رہ گیا تھا اور ایک انجانا سا خوف دل و دماغ پر طاری ہوگیا تھا۔ کیونکہ وہ اٹھاسی سال کی عمر میں تھے، اور کچھ عرصہ سے پیرانہ سالی کی وجہ سے صاحب فراش تھے۔ آپ کی پیدائش مارچ 1923 کو کرناٹک کے ایک پس ماندہ قصبہ جوال گیرا۔ رائے چور میں ہوئی تھی۔ آپ کے والد کا نام ابوالحسن تھا۔

بلگامی صاحب سے ہم نے تذکرہ کیا کہ تحریکیں شخصیات سے بنتی ہیں، ان کے عملی نمونے آئندہ نسلوں کے لیے مشعل راہ بنتے ہیں، جب ہم نے شعور سنبھالا تو جماعت سے بڑی قد آور شخصیات وابستہ تھیں، جن کے فہم و فراست، قربانی وللّٰہیت کی زمانہ قسم کھاتا تھا، ابواللیث اصلاحی، محمد یوسف، صدر الدین اصلاحی، سید حامد حسین، سید احمد عروج قادری، محمد مسلم، محمد یوسف صدیقی، اختر حسن اصلاحی، جلیل احسن ندوی صاحبان رحمہم اللہ کیسے کیسے عظیم لوگ اس میں تھے، جنہوں نے بڑی بے نفسی اور شہرت سے بلند ہو کر خدمات انجام دیں، آج ہم ان کی سوانح اور حالات اور ان کی تحریروں کے نمونے تلاش کرتے ہیں تو نہیں ملتے، جماعت کی موجودہ نسل تنظیم اور دستور سے تو واقف ہے، لیکن ان کے عملی نمونوں اور اپنی بلند و بالا شخصیات سے زیادہ تر ناواقف ہے۔ اور صورت حال کچھ یوں بنتی جارہی ہے کہ ان کی نئی نسل کے لیے

اب اردو اجنبی ہوتی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب بڑے سلجھے اور سنجیدہ آدمی ہیں، ہماری بات ٹھنڈے دل سے سنتے رہے اور ایک طرح سے تائید کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم مولانا سراج الحسن کی زندگی میں قدر دانی کرتے ہوئے ان پر کوئی یادگار مجلّہ نکالنا چاہتے ہیں، لیکن اس کے لیے ہمیں ڈھنگ سے کوئی مواد نہیں مل رہا ہے۔

مولانا سراج الحسن صاحب کو ہم نے پہلے پہل 1995 میں ان کے رفیق کار مولانا محمد عبد العزیز مرحوم کے ساتھ بھٹکل کی جامع مسجد میں خطاب کرتے ہوئے دیکھا تھا، یہ ان کی بھرپور جوانی اور حوصلے کے دن تھے، عمر ابھی تینتیس کے آس پاس رہی ہوگی۔ یہ اس ناچیز کا لڑکپن تھا، شعور ابھی ناپختہ تھا، اس زمانے میں بھٹکل کے جو افراد منگلور، چنئی، اور وجے واڑہ میں تجارت اور معاش سے وابستہ تھے، ان میں سے زیادہ تر جماعت سے انس رکھتے تھے، اور اس کی شخصیات کے ساتھ بڑے احترام اور محبت کا تعلق رکھتے تھے۔ یہاں کے علماء حضرات کا رویہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ لیکن یہاں کے مزاج کے مطابق جماعت کے نظم سے لوگوں کی وابستگی نہ ہونے کے برابر تھی۔

گزشتہ صدی میں سنہ ساٹھ کی دہائی مسلمانان ہند کے لیے قیامت بن کر آئی تھی، وطن عزیز کے طول وعرض میں آگ وخون کا کھیل کھیلا جا رہا تھا، جہاں پر بھی مسلمان کچھ خوش حال تھے اور ان کے کاروبار تھے انہیں تباہ اور خاکستر کیا جا رہا تھا، اس زمانے میں جن جماعتوں اور اداروں نے ملت کی ڈھارس بندھائی تھی، ان میں جماعت اسلامی ہند سرفہرست تھی، اسی زمانے میں مسلم مجلس مشاورت کا قیام عمل میں آیا تھا، اور اسے تقویت پہنچانے میں جماعت ہی آگے آگے تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جماعت کے سکریٹری سید حامد حسین مرحوم کا طوطی بول رہا تھا، ان کی گھن گرج سے پورا ملک گونج رہا تھا، اور آپ کے نقش پر چلتے ہوئے جماعت کے جوانوں میں سے عبدالرزاق لطیفی، عبدالعزیز، اور سراج الحسن صاحبان رحمہم اللہ ہراول دستے کی حیثیت سے آگے بڑھ رہے تھے، اور اپنے جوش خطابت کا لوہا منوا رہے تھے۔

1980 میں جب اعلیٰ تعلیم کے لیے ہمارا چنئی جانا ہوا تو کبھی کبھار بنگلور سے گزر ہوتا، اس کے لیے شموگہ بس پر جاتے وہاں سے ٹرین کے ذریعہ بنگلور۔ ایک مرتبہ بس پر شموگہ کے مرحوم

عبدالمجید صاحب سے ملاقات ہوئی جو بعد میں کرناٹک کے امیر حلقہ بھی شاید منتخب ہوئے تھے، یہاں سے ہمارا بنگلور سٹی مارکیٹ کے قریب واقع جماعت کے پرانے مرکز سفر کی تھکاوٹ دور کرنے اور ستانے کے لیے آنا جانا ہوا، جہاں سراج الحسن صاحب کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقعہ ملا۔ انہیں اعلی تعلیم کے مواقع نہ مل سکے تھے، شاید میٹرک بھی نہ کر سکے تھے، لیکن گھریلو تربیت، اور بڑوں کی صحبت اور دعوت اور قربانی کے جذبہ نے انہیں بڑے اعلیٰ مقام تک پہنچادیا تھا، ان کی شخصیت متشرع تھی، لباس اور وضع قطع بڑی مؤثر تھی، ان کی باتوں میں ایک اپنائیت محسوس ہوتی تھی، بڑے محنتی تھے، تہجد اور سنتوں کی پابندی تھی، تھک تھکا کر آتے تو کسی لکڑی کے تختے پر پڑے سوجاتے، انہیں نرم بستر اور گدے کی کبھی ضرورت نہیں پڑتی تھی، انہوں نے مشاورت ہو، یا پرسنل لا بورڈ، مسلمانوں پر آنے والے ہر کڑے وقت میں مجاہدانہ کردار ادا کیا، ایمرجنسی کے دور میں سنت یوسفی بھی ادا کی، ان کی جدوجہد کا یہ عالم تھا کہ سفر وحضر کے ساتھی اعجاز اسلم صاحب نے ہمیں بتایا کہ شاہ بانو کیس کے زمانے میں جب کہ ملک بھر میں جلسوں اور تقریروں کا لامتناہی سلسلہ جاری تھا، پیروں میں جیسے چکر لگے ہوئے تھے اور دن دن بھر چند گھنٹے بھی آرام کے نہیں ملتے تھے، ان پر بڑے بڑے اجتماعات کی نظامت کی ذمہ داری عائد ہوتی تھی، لیکن نیند پر ان کا اتنا کنٹرول تھا، کہ جلسہ چل رہا ہے، ایک مقرر کو دعوت دی، پھر جا کر سو گئے، انہیں خراٹے دار نیند بھی آگئی، لیکن مقرر کے تقریر ختم کرنے سے پہلے خود ہی اٹھ کر اسٹیج پر آگئے اور نئے مقرر کو دعوت دی۔ ذمہ داری کا ایسا احساس اور نیند پر ایسا کنٹرول انہوں نے کسی اور میں نہیں دیکھا۔

دسمبر 1978 میں کیرالہ چمناڈ عالیہ عربک کالج کا ایک تعلیمی سیمینار تھا، جس میں نئی عمارتوں کا سنگ بنیاد بھی ڈالا جارہا تھا، اس وقت بیرون ملک، خلیجی ممالک سے بھی مہمان شریک ہورہے تھے۔ اس وقت میں جامعہ اسلامیہ بھٹکل میں تدریس سے وابستہ تھا، جامعہ کے وفد میں اس ناچیز کو بھی شامل کیا گیا تھا، وہاں مولانا سراج الحسن صاحب سے ملاقات ہوئی، مولانا اس وقت دبئی ہو کر آئے تھے، انہیں ہمارے استاد احمد نوری مرحوم کے کنڑ ترجمہ قرآن (دیویا قرآن) کی اشاعت کا خواب شرمندہ تعبیر کرنا تھا، جسے وہ بھٹکل کے ایک صاحب خیر سعید حسین

داموودی کے تعاون سے انجام دے رہے تھے۔ سراج الحسن صاحب نے ہمیں ذمہ داری سونپی کہ امارات کے مہمان شیخ علی بن عمیر مدیر اوقاف ام القیوین، اور شیخ عبداللہ المدنی مدیر اوقاف الفجیرۃ اور ان کے ساتھ ایک اور معزز مہمان کو لے کر بھٹکل جاؤں اور وہاں سے جوگ فال (آبشار) ساگر، شموگہ، بھدراوتی سے ہوتے ہوئے بنگلور لے جاؤں۔ یہ سفر تقریباً دس دن پر محیط تھا، حافظ شبیر قدوسی مرحوم اس دوران شریک سفر رہے۔ جگہ جگہ جلسے اور خاطر داریاں ہوئیں، اور مقامی لوگوں کے جنہوں نے شاید کبھی عربوں کو دیکھا نہیں تھا جذبات دیکھنے کو ملے، وہ ان سے ایسے مل رہے تھے، جیسے صحابہ کے دور کے کسی آدمی کو دیکھ رہے ہوں، ان کی آنکھیں بھی شدت جذبات سے اشکبار ہورہی تھیں، بنگلور میں مولانا کا ساتھ رہا، ترجمانی کے لیے انہوں نے اس وقت عمرآباد کے ایک مدینہ منورہ کے فارغ استاد کو بلایا تھا، لیکن انہیں اپنے جذبات کی ترجمانی اس ناچیز کے ترجمہ میں زیادہ محسوس ہوئی، اور اس پر بڑی ہمت افزائی کی۔

چمناڈ کا ایک اور منظر بھی ہماری آنکھوں میں محفوظ ہے، یہ ادارہ اس زمانے میں جماعت کے وابستگان کا تھا، اور شاید اب بھی ہو، اس میں شرکت کے لیے اس وقت کے امیر جماعت مولانا محمد یوسف مرحوم بھی تشریف لائے ہوئے تھے، دھان پان آدمی، گورا چٹا بدن، ڈاڑھی بزرگان دین کی ایک مشت سے زیادہ، کبھی الہ آباد ہائی کورٹ میں رجسٹرار رہے تھے، اس زمانے میں انہیں دیکھنے والے ایک اہل علم نے ہمیں بتایا کہ بڑے ہی خوبصورت انداز میں اس طرح انگریزی لباس کوٹ پتلون پہنا کرتے تھے کہ انگریز شرما جائیں، لیکن جب تحریک سے وابستہ ہوئے تو ایسی تبدیلی آئی اور مغربی تہذیب سے اتنی نفرت ہوگئی کہ لباس میں اگر کوٹ پہنتے تو نیچے پتلون کے بجائے شلوار پہنتے اور پتلون پہنے ہوئے ہیں تو اوپر جبہ نظر آتا، یعنی بلکہ الٹا، ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جب مسجد میں فوٹو گرافر تصویریں اتارنے لگا تو آپ غصے میں آگئے اور بھرے اجتماع میں ڈانٹ کر اسے تصویر کشی سے روک دیا، آپ نے باقاعدہ عربی زبان سیکھی تھی، عربی میں لکھے خطوط کی نوک پلک بڑی باریک بینی سے درست کرتے تھے، یہ ہمارا ذاتی مشاہدہ ہے۔ ایمرجنسی کے زمانے میں دہلی کے گورنر جگ موہن کسی زمانے میں الہ آباد میں آپ کے ماتحت رہے تھے۔ جس روز ایمرجنسی لگی تھی اسی روز یوسف صاحب کی اہلیہ کا

انتقال ہوا تھا، لوگوں نے کہا کہ جگ موہن کو بتائیں کہ جنازہ میں شرکت کی اجازت دے، لیکن آپ کی عزت نفس نے اسے گوارہ نہیں کیا، آپ نے گورنر سے درخواست کرنے کے مشورے کو ٹھکرادیا، آپ کے گھر کی دہلیز سے ایک طرف چہیتی رفیق حیات کا جنازہ جارہا تھا، دوسری طرف آپ ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنے پولیس گاڑی میں بند رفیق حیات کی قبر کو مٹی دیے بغیر تہاڑ جیل کی طرف روانہ ہورہے تھے۔

مولانا ابو اللیث ندوی رحمۃ اللہ علیہ جب دوبارہ امیر جماعت منتخب ہوئے تو سراج الحسن صاحب کی کرناٹک حلقے سے مرکز میں منتقلی ہوئی، اور یہاں آپ کو مرکزی سکریٹری منتخب کیا گیا۔ امیر جماعت کی علالت کے دوران 1989 - 1990 آپ قائم مقام مرکزی امیر جماعت رہے، یہاں تک کہ 1990 میں امیر جماعت منتخب کیا گیا، جس پر آپ 2003 تک فائز رہے۔ مولانا سراج الحسن صاحب کی مجلس مشاورت، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل کے زمانے میں ان اداروں میں فعال شرکت رہی تھی، لہٰذا ان اداروں سے وابستہ علماء واکابر سے ان کے روابط وتعلقات استوار تھے، اوران حضرات کے دل میں آپ کا بڑا احترام تھا، آپ کی امارت کے زمانے میں بابری مسجد کی شہادت کا واقعہ پیش آیا، جماعت نے تقسیم ہند کے بعد سے اب تک مسلمانان ہند کی رہنمائی کے لیے بڑا فعال کردار ادا کیا تھا، فسادات کے موقعوں پر ریلیف کے لیے جماعت ہی کے کارکنان کی طرف نگاہیں اٹھتی تھیں، یہاں پر اب تک جماعت کی قیادت نے بڑا حکیمانہ رویہ اپنا کر خود کو بہت سے فقہی اور مسلکی اختلافات سے دور رکھنے کی کوشش کی تھی، لیکن بدقسمتی سے بابری مسجد کے قضیہ کے زمانے میں جماعت اپنا وہ کردار ادا نہ کرسکی جس کی اس سے امید تھی۔ ہماری ناقص رائے میں اس کا سبب انتخابی سیاست میں داخل ہونے کے سلسلے میں جماعت کا فیصلہ تھا، جو اس سے وابستہ پرانی بعض شخصیات کو مطمئن نہ کرسکا تھا، جماعت میں یہ مسئلہ پہلی مرتبہ 31 مئی 1977 میں ایمرجنسی کے ہٹائے جانے اور جماعت کے ممبران کے جیلوں سے چھوٹنے کے بعد ابھرا تھا، اس وقت امیر حلقہ مہاراشٹر مولانا شمس پیرزادہ، اور ناگپور سے حفیظ اللہ خان جیسی شخصیات نے انتخابی سیاست میں داخلہ کی ممانعت کی وجہ سے جماعت سے علیحدگی اختیار کی تھی، لیکن جب مولانا ابو اللیث صاحب کی امارت کے

آخری ایام میں شوری نے انتخابی سیاست میں شرکت کا فیصلہ کیا تو جماعت کی کئی ایک قد آور شخصیات نے اس فیصلے سے اختلاف کیا، یہی زمانہ تھا جب بابری مسجد کا قضیہ اٹھا،اور مولانا سراج الحسن پر بحیثیت امیر جماعت ذمہ داری عائد ہوئی کہ وہ شوری کے فیصلے سے ارکان جماعت کو مطمئن کریں، لہٰذا جماعت اس داخلی مسئلے کی صفائی میں الجھ گئی اور بابری مسجد کے قضیے میں اس کے وزن کے مطابق فعال کردار ادا نہ کرسکی، ہماری ناقص رائے میں یہ مسلمانان ہند کی بڑی بد قسمتی تھی۔ لیکن حالات ایسے تھے، اس کا کسی پر الزام دینا مناسب نہیں، اب لکھے کو کون ٹال سکتا ہے؟

جب مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ کے ممبر تھے تو ایک استفسار پر مولانا نے فرمایا تھا کہ جماعت اسلامی ہند ملک کے مسلمانوں کی واحد ایسی جماعت ہے جس کے ارکان کم ہوں یا زیادہ ملک کے ہر کونے میں پائے جاتے ہیں، ممکن ہے جماعت کا عامۃ الناس پر ویسا اثر نہ ہو، لیکن اجتماعی طور کسی ایجنڈے کو حرکت دینے کے لیے پورے ملک سے مربوط جماعت کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ ہماری ذاتی رائے میں جماعت کی یہ صورت حال مولانا سراج الحسن کی امارت تک باقی تھی، دور رہ کر صحیح حقائق کا ہمیں علم ہونا ضروری نہیں، لیکن چند روز قبل باتوں باتوں میں ایک بڑی دینی شخصیت نے ہمیں بتایا کہ اب یہ صورت حال باقی نہیں رہی ہے، دوسری ملی جماعتوں نے یہ میدان مار لیا ہے، واللہ اعلم بالصواب۔ پلوں سے اب پانی بہت بہ چکا ہے، مرحوم کے بعد ڈاکٹر عبدالحق، پھر مولانا جلال الدین انصر عمری، پھر نئے حوصلوں کے ساتھ جواں سال امیر جناب سعادت اللہ حسینی صاحب منتخب ہو کر آئے ہیں، اکبر الہ آبادی کے بقول (امید اچھی خیال اچھا رکھو) پر عمل لازمی ہے، لیکن ذمہ داران کے ذہن میں یہ بات رہنی چاہئے کہ کسی تحریک کی کامیابی کے لیے صرف تنظیم کافی نہیں، سواد اعظم کو متاثر کرنے کے لیے جو تقاضے مطلوب ہیں، ان کا خیال بھی رکھنا ضروری ہے۔

مولانا سراج الحسن صاحب نے ایک مومن حقیقی کے طور پر اپنی زندگی گزاری ہے، ان کی زندگی ایک نصب العین سے معمور تھی، جب کرناٹک میں رہے تو یہاں کی مقامی زبان میں

اسلام کے تعارف کے لیے بڑے پیمانے پر لٹریچر کی تیاری پر بھر پور توانائیاں صرف کیں، ہندوستان گیر پیمانے پر ذمہ داری سونپی گئی تو اس کی بجا آوری میں بھی کوئی کمی نہیں چھوڑی، اور جب عہدوں سے فارغ ہوئے تو ایک کارکن کی حیثیت سے خدمات پیش کرنے میں کبھی جھجھک محسوس نہیں کی۔ ایسی شخصیت جب درمیان سے اٹھ جاتی ہے تو ملت ایک خلا محسوس کرتی ہے، اور شدت سے ایسوں کی ضرورت محسوس کرتی ہے، جب ان کے داغ مفارقت دینے کی خبریں آتی ہیں تو دل مسوس کر رہ جاتا ہے، اور ہاتھ دعائے مغفرت کے لیے بلند ہوتے ہیں، آئے ہم بھی دعا کریں، اللہ تعالیٰ مرحوم کی لغزشوں سے درگزر کرے، ان کی خدمات کو قبولیت سے نوازے، اور اعلیٰ علیین میں انہیں جگہ دے۔ اللھم اغفر لہ وارحمہ۔

قصبہ کرے بلچی سے مولانا سراج الحسن مرحوم کا تعلق

سید ممتاز منصوری، کرے بلچی، بنگلور ساؤتھ

ایک شخص کی سیرت و کردار کا اصل معیار اس کے مزاج کا استقلال اور توازن ہے۔ اگر ملنساری (Companionableness) اور خوش طبعی کسی شخص کی مستقل مزاجی کی روح بن جائے تو پھر اُس شخصیت کی معراجی کیفیت کے کیا کہنے! اپنے رفقاء ہوں یا دوسرے لوگ، امیر ہوں یا غریب، بڑے ہوں یا چھوٹے، اسٹیج پر ہوں یا پیدل چل رہے ہوں، سب کے ساتھ، ہر موقعہ پر خوش اخلاقی، گرمجوشی اور زود آشنائی کے ساتھ ملاقاتیں ایک ملنسار اور خوش طبع شخصیت کی پہچان ہوتی ہیں، اور ایسے ہی تھے ہمارے رہنما اور قائد مولانا مرحوم سراج الحسنؒ۔ اقبالؒ کے شعر ؎

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قُرآن

کو حضرت عائشہ صدیقہؓ کے قولِ صادق کان خلقہ القرآن کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو جو حقیقی مومنانہ تصویر ایک خوش طبع، خوش اختلاط اور زود آمیز شخصیت کی جھلکتی ہے، ویسی ہی شخصیت تھی مولانا مرحوم سراج الحسنؒ کی!

کرے بلچی کی خصوصیات اور مولانا مرحوم کی آمد

دہائیوں سے قصبۂ کرے بلچی ایک مسلم اکثریت والی بستی ہونے کے علاوہ تعلیمی اعتبار سے ایک معیاری بستی بھی رہی ہے۔ بستی کا محل وقوع اور کاشتکاری کے لیے اس کی زرخیزی شروع ہی سے مشہور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بستی ہمیشہ مذہبی قائدین، سیاسی لیڈران اور سماجی دانشوروں کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ میرے والد محترم جناب سید خلیل صاحب کی یاداشت کے

مطابق مولانا مرحوم تین مرتبہ کرے بلچی تشریف لائے۔ پہلی مرتبہ ایمرجنسی کے فوری بعد، جب کہ ابھی کرے بلچی میں جماعتی نظم بھی موجود نہیں تھا، مولانا مرحوم کی آمد ہوئی۔ تحریکات کے لیے عوامی دائروں میں اُتر کر کام کرنے کی اہمیت اپنی جگہ پر مسلّم ہے۔ جب تحریک کا ہر فرد اِس ہدف کو لے کر چلتا ہے تو یقیناً ایسی تحریک کے پھیلاؤ کا خواب عوامی سطح پر اپنے متعینہ تاریخِ ہدف سے پہلے ہی شرمندۂ تعبیر ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ جب اُس تحریک کے ذمہ داران اِس ہدف کو اپنی ترجیحات کا حصہ بنالیں اور اِس پر کام کرنا شروع کر دیں تو یہ چیز افرادِ تحریک کے لیے ایک انمٹ مثال بن جاتی ہے۔ ایمرجنسی کے فوری بعد ملک اور ریاست کے حالات کی تبدیلی کو خاطر میں نہ لانا، کسی سمجھوتے (Compromise) کا شکار نہ ہونا اور بے خوف وخطر ایک مسلم اکثریت والی بستی میں تحریک کی بنیاد ڈالنے کے لیے تشریف لانا مولانا کی مومنانہ جرأتمندی اور اسٹرٹیجک نقطہ نظر (Strategic Approach) کا ایک مثالی اقدام ہے۔ تحریکی قیادت کی یہ مومنانہ جرأتمندی کسی بھی مرحلے میں تحریک کے روشن مستقبل کی ضامن ہے۔ مولانا کی پہلی آمد ساکنینِ کرے بلچی کے لیے ایک بڑی نعمت ثابت ہوئی اور اُسی وقت سے تحریکِ اسلامی نے کرے بلچی میں اپنی جڑوں کو پھیلانا شروع کیا۔

مولانا مرحوم کا پُرمغز اور تاریخ ساز پیغام

اپنی پہلی آمد کے موقع پر کرے بلچی مِڈل اسکول گراؤنڈ میں مولانا مرحوم نے بستی والوں کے روبرو کرے بلچی کے محلِ وقوع، مسلم اکثریت، مساجد کی آبادی، تالاب کی موجودگی، زمین کی زرخیزی اور تعلیمی معیار کا تذکرہ کیا۔ مزید بتایا کہ غیر مسلم آبادیوں کے درمیان آباد ایک مسلم بستی کی کیا ذمہ داری ہے۔ وہ کس ربّانی عہد کی پاسباں ہے اور کس عظیم الشان دعوتی منصب پر فائز ہے۔ اُس موقعہ پر مولانا مرحوم نے آسام کی ملتی جلتی مسلم بستی کا حوالہ دیا جس نے اپنی دعوتی ذمہ داری کی ادائیگی میں تساہل سے کام لیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ بستی فسادیوں کی شرانگیزیوں کا نشانہ بن کر رہ گئی تھی اور اپنی انفرادیت کھو بیٹھی تھی۔ اُس موقعہ پر مولانا مرحوم نے اپنی تقریر میں اِس ملک میں امت کے روشن مستقبل اور وجود کو امت کی دعوتی سرگرمیوں اور حسنِ کردار کے ساتھ جوڑا۔ (ماخوذ والدِ محترم کے نوٹس سے)

بستی والوں کے لیے، جو کہ اُس وقت ایک روایتی فکر کے ہم راہ تھے، یہ پیغام ایک انوکھا پیغام تھا۔ اُس وقت بستی والوں کے لیے یہ بات سہل نہ تھی کہ وہ بآسانی یہ باور کرلیں کہ جس دین کے وہ پیروکار ہیں اور جس کتاب پر وہ ایمان رکھتے ہیں وہ اُن کے پاس ایک قرض ہے اُن لوگوں کا جو اُس دین اور کتاب کو جانتے نہیں ہیں۔ ایک وہ دن تھا اور ایک آج کا دن ہے، جبکہ مولانا اس دنیا میں نہ رہے، دعوتی پہلو سے بستی والے آج بھی سرد مہری، بے مروّتی اور بے رخی کا شکار ہیں۔ الا ماشاء اللہ!

اللہ رب العزت نے اپنے فضل سے کرے بلچی میں ذرائع و وسائل کی بہتات فرمادی ہے، ساکنینِ وطن کی معاشی حالت ہزارہا درجے بہتر ہوئی ہے، مدارس، اسکولز اور کالجز میں اضافہ ہوا ہے، اے کاش کہ بستی والوں کا دعوتی شعور بھی مولانا مرحوم کی اُس جھنجھوڑنے والی تقریر اور اُس کے بعد دیگر تحریکی ذمہ داروں اور افراد کی جانب سے ہونے والی پیہم کوششوں کے نتیجے میں زندہ ہوجاتا۔ دعوت الی اللہ، اُمّت کا متاعِ کارواں تھا جو لُٹ گیا۔ اِس سے زیادہ اچھنبے کی بات یہ ہے کہ اِس عظیم متاع کے لُٹ جانے کا اِحساس بھی ضمیرِ اُمّت سے ختم ہوگیا۔ اِسی لیے اقبالؒ نے فرمایا۔

وائے ناکامی! متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا
جن کے ہنگاموں سے تھے آباد ویرانے کبھی
شہر اُن کے مِٹ گئے آبادیاں بَن ہو گئیں
سطوَتِ توحید قائم جن نمازوں سے ہوئی
وہ نمازیں ہند میں نذرِ برہمن ہو گئیں

مولانا مرحوم نے اپنے تقریباً 70 سالہ تحریکی سفر کے دوران جن انتھک کوششوں اور پیہم کاوشوں کے ذریعے اپنی ذاتی زندگی میں دعوت الی اللہ کے کام کو جاری رکھا اور جماعتی زندگی میں دعوتی مزاج کو تحریکی کیڈر میں پیدا کیا اور قائم رکھا وہ اپنی جگہ پر ایک داعی قائد کی بہترین مثال ہے۔ اے کاش کہ ہر بستی اور شہر والے اپنے متعلقہ برادران وطن کی آبادیوں میں اِس

دعوتی مشن کے علمبردار بن جائیں۔ پھر بعید نہیں کہ دعوت کے نتیجے میں ملک میں وہ مطلوبہ تبدیلی رونما ہو جس کے ہم سب منتظر ہیں۔ بقولِ اقبالؒ ؎

شامِ غم لیکن خبر دیتی ہے صبحِ عید کی
ظلمتِ شب میں نظر آئی کرن اُمّید کی

قصبۂ کرے بلچی حلقۂ کرناٹک کی ایک مثالی بستی

رواں میقات میں حلقہ کرناٹک کی میقاتی پالیسی اور پروگرام میں ہندوستانی سماج کے ذیل میں صفحہ نمبر 13 پر حلقۂ کرناٹک نے کرے بلچی کی بستی کو ایک مثالی بستی کی حیثیت سے پروان چڑھانے کے لیے نشاندہی (Identify) کی ہے۔ دوسری مرتبہ کرے بلچی مولانا مرحوم سراج الحسنؒ اُس وقت تشریف لائے جب کہ بستی میں ابتدائی کوششوں کے بعد دو چار احباب پر مشتمل جماعتی نظم قائم ہو چکا تھا۔ مرحوم عبدالجبار صاحب اُس وقت کرے بلچی کے حلقۂ کارکنان کے ناظم تھے۔ کرے بلچی میں تحریکِ اسلامی کے السابقون الاوّلون میں مرحوم عبدالجبار صاحب کے علاوہ مرحوم شیخ احمد صاحب، مرحوم عبدالرشید صاحب، سید خلیل صاحب، سیف اللہ صاحب، محمد سراج الدین صاحب، نصراللہ صاحب، الطاف بیگ صاحب، محمد حفیظ اللہ صاحب اور استاد رحمت اللہ صاحب کے نام شامل ہیں۔ خواتین میں افروز صاحبہ اور سعید النساء صاحبہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ کرے بلچی سے متّصل بستی حمید آباد (ہسور) اِس پہلو سے قابلِ ذکر ہے کہ وہاں پر تحریکِ اسلامی مرحوم عبداللطیف صاحب داونگیرے کی تقاریر کے ذریعے، کرے بلچی میں اپنے تعارف سے پہلے، متعارف ہوئی۔ حمید آباد میں مرحوم استاذ شیخ محی الدین صاحب (شیخ حضرت) اور سالار خان صاحب تحریکِ اسلامی کے اوّلین چراغ کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ اِن تمام احباب کی زندگیاں تحریکِ اسلامی کے لیے وقف رہی ہیں۔ یہ تمام احباب مولانا مرحوم کی متحرّک شخصیت سے متاثر تھے۔ سید خلیل صاحب، سعید النساء صاحبہ اور مرحوم شیخ محی الدین صاحب کے نام اس پہلو سے قابلِ ذکر ہیں کہ یہ تین احباب تحریکِ اسلامی کے قصبہ کرے بلچی میں سب سے پہلے ارکان بنے۔ ماضی قریب میں کرے بلچی میں تحریکی کام کے استحکام اور پھیلاؤ میں یم پی بشیر احمد صاحب ہری ہر اور ملّا

لیاقت احمد صاحب ہبلی کا رول انتہائی اہم اور مثالی رہا ہے۔ کرے بلچی اور حمید آباد کے مابین خاندانی رشتوں ناطوں کے علاوہ تحریکی ربط و نسبت نے ان دو متصل بستیوں کے درمیان گہرا تعلق پیدا کیا ہے۔

اُن ایاّم میں مولانا مرحوم سراج الحسنؒ بحیثیتِ امیرِ حلقہ شہرِ شیموگہ کے دورے پر تھے۔ شیموگہ میں بعد نمازِ مغرب خطابِ عام کے فوری بعد مولانا کو کرے بلچی کے لیے روانہ ہونا تھا۔ مولانا مرحوم اور دیگر ذمہ دارانِ جماعت (جن میں اعجاز اسلم صاحب اور مرحوم حافظ شبیر صاحب شامل تھے) کو بذریعہ کار کرے بلچی لانے کی ذمہ داری میرے والدِ محترم، جناب سید خلیل صاحب، کی تھی۔ سفر تقریباً دو گھنٹے کا تھا۔ سفر کے دوران مولانا مرحوم نے کار میں میرے والد صاحب کو اپنے بازو والی سیٹ پر بٹھایا۔ والد صاحب فرماتے ہیں کہ وہ کار میں مولانا مرحوم کے پہلو میں بیٹھ کر ایک عجیب قسم کی کیفیت سے ہم دوش تھے۔ جہاں ایک طرف ایک امیر حلقہ اور ذمہ دارِ جماعت کی قد آور شخصیت کا رعب طاری تھا وہیں دوسری طرف مولانا مرحوم کی بلا تکلّف گفتگو اور خوش طبعی اُس دباؤ کو ہلکا کر رہی تھی۔ مولانا مرحوم نے والد صاحب سے ان کی تعلیم و تدریس کے بارے میں جان کر انتہائی خوشی کا اظہار فرمایا (والد صاحب نے اُن دِنوں میں BA(Arts) کی ڈگری حاصل کی تھی)۔ پھر مولانا مرحوم کو بتایا گیا کہ گریجویشن کے باوجود میرے والد کا ذریعہ معاش زراعت اور زمینداری سے ہے تو مولانا مرحوم نے انتہائی پُر جوش جذبات کا مظاہرہ فرمایا۔ اگلے دن ٹماٹر کے کھیت لے جائے جانے کا تقاضا بھی کیا۔ ماحول ذرا بے تکلُّف ہوا تو والد صاحب نے مولانا مرحوم سے سوال کیا کہ اُن کے تحریکی مشاغل اور ذمہ داریوں کے علاوہ پیشہ ورانہ مصروفیات کیا ہیں۔ والد صاحب فرماتے ہیں کہ مولانا مرحوم نے اُس وقت جو جواب دیا اُس جواب نے والد صاحب کو انتہائی تعجب میں ڈال دیا۔ مولانا کا جواب یہ تھا: ’’خلیل صاحب میں ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں، زمینوں کی دیکھ بھال میری والدہ کرتی ہیں، انہوں نے مجھے اللہ کے دین کے لیے فارغ کر دیا ہے‘‘۔

بلاشک وشبہ ہماری نگاہیں بلند و بالا پہاڑوں کو دیکھتی ہیں اور اُن پہاڑوں کی مضبوط بنیادیں ہماری نگاہوں سے اوجھل رہتی ہیں، ہماری نظریں ہرے بھرے ثمر آور درختوں کو دیکھتی

ہیں اور اُن درختوں کی خوب پھیلی ہوئی جڑیں ہماری نظروں سے پوشیدہ رہتی ہیں۔ ہم انسانوں کے درمیان چند مرجع خلائق شخصیات سے فیضیاب تو ہو رہے ہوتے ہیں لیکن جس چیز نے اُنہیں وہ مقام و مرتبہ عطا کیا وہ ہماری قوتِ غور وفکر سے دور رہتی ہے۔ جس عورت کا شوہر زندگی کے ایک اہم اور نازک موڑ پر داغِ فراق دے کر اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملا ہو، جس عورت کی چار بیٹیاں اور اکلوتا بیٹا ہو، جس عورت کے روبرو سینکڑوں ایکڑ زمین کی دیکھ بھال کا مرحلہ درپیش ہو، بدخواہ لوگ جس کی اولاد کی تاک میں بیٹھے ہوں، وہ خاتون تو یہی چاہے گی کہ جلد از جلد اس کا بیٹا جوان ہو جائے، اپنی اور دیگر اہل خانہ کی حفاظت کی ذمہ داری سنبھال لے، اپنی بہنوں کی شادیوں کی ذمہ داری ادا کرے اور باپ کی چھوڑی ہوئی میراث کی حفاظت ونگرانی میں لگ جائے۔ لیکن قُربان جایئے اُس زندہ دل خاتون کے جذبۂ اخلاص وللہیت، فہم و فراست اور جرأت وظرافت پر کہ اس نے اپنی اکلوتی اولاد کو اللہ تبارک وتعالی کے دین کے لیے فارغ کر دیا۔ تبھی تو ایسی کوکھ نے نابغہ روزگار شخصیت کو جنم دیا ہے جس پر آسمان وزمین والے فخر محسوس کرتے ہیں۔

اپنی دوسری آمد کے موقع پر مولانا مرحوم نے کرے بلچی میں اپنے احباب اور رفقاء کے ذہن پر تحریکیت، مومنانہ جذبے، خوش طبعی اور گرمجوشی کے وہ انمِٹ نقوش چھوڑے جنہیں کرے بلچی کے سینئر رفقاء آج بھی یاد کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ثناء اللہ شریف صاحب (فی الحال ساکنِ بنگلور ساؤتھ) اُن کئی نوجوانوں میں سے ایک تھے جنہیں اپنی دوسری آمد کے موقع پر مولانا مرحوم کے خطاب کی تاثیر اور بازوؤں کی گرمی نے تحریک اسلامی سے منسلک ہونے کے لیے آمادہ کر دیا۔ غالبًا آج کتنے ایسے نوجوان خطاب کی اُس تاثیر اور بازوؤں کی اُس گرمی کے لیے ترس رہے ہیں۔

قصبۂ کرے بلچی میں مولانا مرحوم کی آخری آمد

قصبۂ کرے بلچی میں اپنی تیسری اور آخری آمد کے موقع پر مولانا مرحوم نے اپنے خطاب کا آغاز غیر متوقّع طور پر کرے بلچی میں اپنے ایک قریبی دوست کے تذکرے سے کیا۔ مولانا مرحوم کی زندہ دلی، لُطفِ طبع اور کشادہ رُوئی کا یہ عالَم تھا کہ وہ اپنی تقاریر کو بھی مزاح سے پُر

رکھتے تھے۔ مولانا مرحوم کے یہ انتہائی قریبی دوست، جن کا تذکرہ مولانا نے اپنے خطاب کے آغاز میں کیا، مرحوم عبدالحمید خان صاحب (بڑے چیئرمن) تھے۔ مولانا نے فرمایا "اِس بستی میں میرے قریبی دوست، حمید خان صاحب، نے مجھ سے اپنی پہلی ملاقات میں اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ مولانا میں پٹھان ہوں۔ میں نے جواب میں یہ عرض کیا کہ بھائی حمید خان، تم اکیلے پٹھان تھوڑی ہو، پٹھان تو میں بھی ہوں"۔ یہ سُننا تھا کہ پوری مجلس مولانا مرحوم کی طبیعت کی ظرافت، لہجے کی لطافت اور بات کی نزاکت سے جھوم اٹھی۔

حمید خان صاحب (بڑے چیئرمن) سیاسی بصیرت والی شخصیت کے مالک انسان تھے۔ مطالعہ کا ذوق اُن کے رگ و ریشے میں بسا ہوا تھا۔ اُن ایام میں ہزاروں کتابیں حمید خان صاحب کی ذاتی لائبریری میں موجود تھیں۔ ایمرجنسی کے موقع پر پٹنہ کانفرنس کے لیے سفر کے دوران مولانا مرحوم کی پہلی ملاقات حمید خان صاحب سے ہوئی تھی۔ مِزاج کی ہم آہنگی اور طبیعت کے اِنسجام نے اِن دو ہم مزاج احباب کو گہرے رشتہ رفاقت میں باندھ دیا تھا۔ یہ دوستی اور رفاقت گزرتے وقت کے ساتھ اِتنی گہری ہوتی چلی گئی کہ سات سال پہلے بنگلور میں حمید خان صاحب کے انتقال کے دس بارہ سال بعد اُن کے فرزند انجینئر حبیب اللہ خان صاحب (فی الحال ساکنِ بنگلور ساؤتھ) نے ایک مرتبہ مولانا مرحوم کے روبرو اپنا تعارف مرحوم حمید خان صاحب کرے بلچی کے فرزند کی حیثیت سے کرایا تو مولانا مرحوم کی آنکھیں اُمڈ آئیں۔ رشتہ رِفاقت (Friendship) کو داغِ مفارقت (Dot of Separation) دے کر جدا ہونے والے دوست کو یاد کر کے مولانا نے بیساختہ اپنے مرحوم دوست کے فرزند، انجینئر حبیب اللہ خان صاحب، کو اپنے گرم بازوؤں میں سمیٹ لیا اور خود ہی خود کو سنبھالنے لگے۔ اِس سے مولانا مرحوم کے جذبہ رفاقت، سچی دوستی کی لگن، خیر خواہی اور مخلصانہ تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ مولانا مرحوم اپنے دوستوں کے دوست اور اپنے یاروں کے یار تھے۔ اپنے دوستوں کے ساتھ مولانا مرحوم کے تعلقات انتہائی مخلصانہ اور بے تکلّفانہ تھے۔ ایک سچا دوست ہی دوستی نبھاتا ہے۔ آج کی اِس مصروف اور خودغرض دنیا میں کوئی کہاں کسی کا مخلص دوست بنے گا اور کہاں کسی کو اپنا مخلص ساتھی بنائے گا۔ مولانا مرحوم حقیقی معنوں میں اپنے دوستوں کے چارہ ساز

اور غمگسار تھے۔

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

عموماً باوقار اور بارعب شخصیت میں نرم خوئی اور کشادہ روئی کا پہلو کم ہوتا ہے، لیکن مولانا کی شخصیت میں زندہ دلی کی صفت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ہر کوئی آپ کی شخصیت کا مختصر سے وقت میں گرویدہ بن جاتا تھا۔

مولانا مرحوم سراج الحسن ہم سے رخصت تو ہو چکے، لیکن آج بھی ہمارے درمیان مولانا مرحوم کے لبوں کی مسکراہٹ، ملاقاتوں کی گرمجوشی، بازوؤں کی گرمی، برتاؤ کی ظرافت اور دوستوں کے ساتھ مخلصانہ رویّے کی یادیں زندہ ہیں۔ مولانا ہم آپ کی انتھک کوشش، والہانہ محبت، سخت جدوجہد، مثالی وابستگی، مومنانہ بصیرت، داعیانہ تڑپ اور قائدانہ کردار کو سلام کرتے ہیں۔

میں اس کے چہرے کی مسکراہٹ سے ایسا محسوس کر رہا ہوں
کہ جیسے کوثر پہ شام ہوتے کوئی دیا جھلملا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ
اسی کی صورت کو تک رہا ہے سفر سے لوٹا ہوا زمانہ

حقیقت تو یہ ہے کہ

لحد میں سو رہی ہے آج بے شک مشت خاک اُس کی
مگر گرم عمل ہے جاگتی ہے جانِ پاک اس کی

پھر اسے ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر

غزالہ اطہر، سابق سکریٹری جی آئی او آندھرا پردیش

آنکھیں کھولی ہی تھیں کہ اپنے آپ کو اس ماحول میں پایا جہاں کئی لوگ تحریک سے وابستہ تھے، کم وبیش دن کے بڑے حصے میں تحریک سے متعلق ہی باتیں ہوتی تھیں۔ تفہیم القرآن کا پڑھنا، تحریکی قائدین کا گھر آنا جانا ایک معمول کی بات تھی، اجتماعات، ملاقاتیں، میٹنگیں یہ وہ الفاظ تھے جو ہر روز کانوں میں پڑتے تھے۔

سابق امیر محترم سراج الحسن صاحب کے لیے بھی ایک عام کارکن کی طرف سے لکھی جانے والی یہ چند سطور بھی ایک ایسی ہی ملاقات کا تذکرہ ہے جو ایک عرصہ پہلے ہوئی تھی۔ اسلامی خاندان مہم 2004ء کے سلسلے میں مولانا محترم حیدرآباد تشریف لائے تھے، خطاب عام رکھا گیا تھا، اس سے فراغت کے بعد ہمارے ہاں مدعو تھے، اس وقت کچھ فیملیز جو (تحریک سے وابستہ ہیں) سب اکھٹے مقیم تھے۔ زندگی میں ہونے والی اس واحد ملاقات میں ان سے بہت سی دعائیں وصول کیں اور کچھ قیمتی نصائح بھی جو آج بھی میری ڈائری کے اوراق کی زینت ہیں اور میرا ایک قیمتی ورثہ!!

سرمئی کلر کی شیروانی، ہوائی چپل پاؤں میں پہنے سادگی کا وہ پیکر، طبیعت میں حد درجہ انکساری، عاجزی، جھکی ہوئی نگاہیں آج بھی ذہن کے پردوں پہ تازہ ہے۔

چونکہ تحریک سے خاندانی وابستگی ہے۔ اپنے بڑوں سے بھی قائدین کی سادگی، خلوص، عجز کا حال سنا تھا کہ سادہ سی زندگی، چٹائیوں پر بیٹھ جانا' عام سی پوشاک جو کہ اسلام کا شعار بھی ہے ان قائدین سے مل کر اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔

بس وہ ایک چھوٹی سی ملاقات ایک پسندیدہ امیر محترم کے طور پہ وابستگان تحریک کی

یادوں کے حوالے سے گہرے نقوش چھوڑ گئی۔

کچھ زیادہ تو میرے پاس کہنے کو نہیں لیکن ان کی امارت کے دوران ہونے والے دو بڑے پروگرامس جو بنگلور اور وجے واڑہ میں 1999 اور 2002 میں منعقد ہوئے تھے جس میں بذات خود میں شریک نہیں تھی لیکن ان دو پروگرامس میں ہونے والے ان کے صدارتی خطابات کو بارہا سنا ہے ان کے درد بھرے انداز نے دل کو چھوا ہے اب بھی وجے واڑہ میں دیا جانے والا خطبہ صدارت اس اجتماع کے ایک یادگار مجلّے میں محفوظ ہے۔

آخری دفعہ 2015 دسمبر میں منعقد ہونے والے اجتماع ارکان بمقام وادی ہدی حیدرآباد کے اسٹیج پہ دیکھا تھا نحیف، کمزور سے، ایک آدمی جو پردرد خطابت کا فن رکھتا تھا اپنی ناسازی صحت کی بنا پر بہت مشکل سے تھوڑا سا کچھ کہہ پائے۔

جن کا بولنا دل کو اچھا لگتا تھا پھر ان سے بولنے کی ہمت کا پست پڑ جانا یہ بھی دکھ دیتا تھا لیکن یہ تو خدائی قانون ہے اس کو ہر حال قبول کرنا ہی ہے۔

وہ ایک فرد کے طور پر، امیر جماعت کی حیثیت میں ہمیشہ یاد رہیں گے۔

اللہ تعالی ان کے درجات بلند فرمائے۔

اہل خانہ کے تاثرات واحساسات

پیشکش: محمد عبداللہ جاوید

محمد سراج الحسن صاحبؒ اپنے والدین کے بڑے بیٹے تھے' چار بہنیں عائشہ بیگم صاحبہ' اصغری بیگم صاحبہ' خدیجہ بیگم صاحبہ اور کنیز فاطمہ صاحبہ آپ سے چھوٹی ہیں۔ مولانا کے کل چھے بیٹے اور ایک بیٹی' محمد ابوالحسن صاحب' محمد ابوالحسن صاحب' شہناز پروین صاحبہ' محمد نجم الحسن صاحب' محمد نجیب الحسن صاحب' محمد انوارالحسن صاحب اور محمد فیض الحسن صاحب۔ ان سب سے جو اولادیں ہوئیں' یعنی آپ کے پوتے' پوتیاں' نواسے اور نواسیاں' ان کی تعداد 18 ہے۔ مولانا کے تیسرے صاحبزادے محمد نجم الحسن صاحب کا 2019 میں انتقال ہوا۔ اوراس سے قبل آپ کی ایک بہن خدیجہ بیگم صاحبہ کا انتقال ہوا۔

آپ کی چھوٹی بہن عائشہ بیگم صاحبہ کہتی ہیں کہ جب مولانا پانچویں جماعت میں تھے تب' والد محترم نے آگے کی تعلیم کے لیے رائچور کے فوقانیہ اسکول میں ان کا داخلہ کرایا۔ تعلیم جاری رہی' عمر کے ساتھ دینی مزاج میں پختگی آتی گئی۔ خود کو اور اپنے اطراف کے ماحول کو دین کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔ آپ تمام بہنوں اور ان کے سسرالی رشتہ کی خواتین کو بلا کر ان کے سامنے اسلام کا پیغام پیش کرتے اور اصلاح وتربیت کے لیے متعین امور کی نشاندہی کرتے جیسے نمازوں کی وقت کے ساتھ پابندی' اولاد کی تربیت' کن برائیوں سے بچیں اور کن خوبیوں کو اپنائیں وغیرہ۔ جب آپ کسی اجتماع کے لیے خواتین کو مدعو کرتے تو وہ بڑے شوق سے حاضر ہوتی تھیں اور کہتیں کہ سراج میاں بلا رہے ہیں۔ بہر حال شرک وبدعت سے منع کرنا اور آخرت میں کامیابی کی یقینی دہانی کرانا پیش نظر رہتا' اس وقت آپ تقریباً 15 سال کے تھے' اس عمر کے لحاظ سے آپ کی باتیں بڑی اثر کر جاتی تھیں۔

جب 1951 میں جماعت کا تعارف ہوا اور اس کے بعد شعوری طور پر جماعت کے نصب العین کو سمجھا تو بلا تاخیر' میدان عمل میں سرگرم ہو گئے۔ شہر رائچور کے جہانیہ محلّہ کی مسجد رحمانیہ میں نوجوانوں کے اجتماعات کا اہتمام کرتے تھے۔ تقریر کا شروع ہی سے آپ کو ملکہ تھا۔ اصلاح المسلمین کے علاوہ دیگر مقامی تنظیموں کی جانب سے ہونے والے جلسوں میں آپ کو بحیثیت مقرر مدعو کیا جاتا تھا۔

مولانا کی والدہ محترمہ بڑی اچھی منتظم اور زیرک خاتون تھیں۔ بہت کم عمری میں شوہر کے انتقال کے بعد اپنے بچوں کی بہترین پرورش کی اور وسیع وعریض زمین پر کی جانے والی کھیتی باڑی کی نہ صرف کڑی نگرانی کی بلکہ ہر طرح کا حساب کتاب ٹھیک ٹھیک رکھا۔ اسی ماحول میں مولانا بڑے ہوئے اور اپنی والدہ کو والد کی صورت میں بھی دیکھا۔ جب آپ اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لیے گھر سے نکلتے تو والدہ نے کبھی نہیں روکا اور نہ ہی گھر کے کام کاج میں لگے رہنے کی بات کی۔ ان کی یہ سہولت تھی کہ مولانا بڑے جی جان سے اللہ کے دین کی خاطر وقت فارغ کرنے لگے۔ جب آپ پر امارت حلقہ کی ذمہ داری پڑی تب بھی والدہ کا بھر پور تعاون رہا اور گھر کے تمام ہی مصروفیات سے آپ کو یکسو رکھا۔ ایک خط میں مولانا اس کا اعتراف یوں کرتے ہیں:

"......جب سے حلقہ میسور کے نام سے حلقہ کرناٹک کو منظّم کیا گیا' باقاعدگی کے ساتھ اور برابر پابندی کے ساتھ یہ دورے ہو رہے ہیں۔ رہی اپنے دل کی کیفیت تو آج بھی اس کی کیفیت وہی ہے بلکہ 1992 سے جبکہ والدہ محترمہ مفلوج ہوگئی ہیں یہ کیفیت اور بڑھ گئی ہے۔ جی کڑا کر کے گھر سے نکلتا ہوں۔ والدہ کی دعائیں لیتا ہوں۔ ان کے شفقت بھرے ہاتھ کو اپنے سر پر رکھ لیتا ہوں اور پرنم آنکھوں سے رخصتی نگاہ ڈالتا ہوں اور وداع ہوتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ میری والدہ جو کہ والد محترم کا رول بھی ادا کرتی ہیں کبھی راہ خدا میں مانع نہیں ہوئیں بلکہ عملاً معاون رہیں' اللہ تعالیٰ انہیں تادیر سلامت رکھے۔" (مرقوم: 16 مارچ 1998)۔

مولانا کی راہ خدا میں ان تھک جدوجہد کے ساتھ ساتھ ان کی والدہ کی بے مثال قربانی اور آسانیاں پیدا کرنے والی اداؤں' حسن تعاون کا پیکر رہیں شریک حیات کے جذبہ ایثار اور

بچوں کی آداب فرزندی کو بھی دیکھنا اور محسوس کرنا چاہیے۔رب کریم سے امید ہے کہ تحریک اسلامی کے لیے انجام دی گئی بیش بہا خدمات کے عوض ملنے والے اجر میں، ماں، بیٹے اور اہل وعیال سب شریک ہوں گے۔

جب آپ پر حلقہ کی ذمہ داری پڑی تو مستقر پر رہنا بہت کم ہوتا گیا۔وقت کے ساتھ مولانا کی مصروفیات بڑھتی گئیں اور ادھر خاندان بھی کافی پھیلتا گیا۔مولانا جب بھی مستقر پر ہوتے سب کی خیر خیریت دریافت کرتے اور جہاں ضرورت محسوس ہوتی، متعلقہ افراد کو یا تو گھر بلا کر یا خود ان کے گھر جا کر ملاقات اور گفتگو کا اہتمام کرتے تھے۔

اہل وعیال کی تربیت

نصب العین کے حصول کے لیے طے شدہ منصوبہ پر عمل درآمد جتنا ضروری ہوتا ہے اتنا ہی ضروری اہل وعیال کی تربیت کا معاملہ بھی ہے۔اللہ کے رسول ﷺ نے کسی شخص کے اچھے ہونے کا معیار بھی اسی کو قرار دیا ہے کہ وہ گھر میں دین کے قیام کی کوشش کرے اور عملاً اس کا نمونہ بنے رہے۔جو فرد اپنی اولاد کے تئیں فکر مند ہے وہ لازماً اپنے نصب العین کے لیے بھی فکر مند ہوگا، اور جو نصب العین کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کا جذبہ رکھتا ہے وہ اہل وعیال کی اصلاح وتربیت کے لیے بھی سب کچھ کر گزرے گا۔مولانا نے شروع ہی سے اپنی بہنوں اور تمام بچوں کی تربیت پر توجہ فرمائی۔ان کی بنیادی تعلیم کے لیے حیدرآباد سے مولانا احمد محی الدین صاحب کو خاص کر مدعو کیا۔موصوف اپنے وطن سے ہجرت کرکے تقریباً 30 سال تعلیم وتعلم کے فرائض انجام دیتے رہے۔دینی اور عصری تعلیم سے فراغت کے بعد مولانا نے حلال ذرائع کے مطابق روزگار اختیار کرنے کی تلقین فرمائی اور عملاً اس کی نگرانی بھی کرتے رہے۔چنانچہ تمام بیٹوں نے روزی کے حلال ذرائع اختیار کیے، جس کی کچھ تفصیل آگے آئے گی۔

مولانا نے اپنی چاروں بہنوں، اکلوتی بیٹی اور بیٹوں کی شادیاں کرائیں۔ تمام ہی کارروائیاں بڑی سادگی کے ساتھ انجام پائیں۔الحمدللہ سب کی ازدواجی زندگیاں خوشگوار ہیں۔ آپ کے تین بیٹے اور ایک بیٹی رائچور میں مقیم ہیں جبکہ دو بیٹے اپنی ملازمت کی وجہ سے بنگلور میں قیام پذیر ہیں۔

مولانا نے اپنے بچوں اور افراد خاندان کو جن باتوں پر کثرت سے متوجہ کیا ہے ان میں باجماعت نمازوں کی پابندی' جماعت کے اجتماعات میں شرکت' زبان کا احتیاط سے استعمال' وقت کی پابندی'لوگوں کی بے لوث خدمت' افراد خاندان کے ساتھ بہتر تعلقات' حلال کمائی' بدگمانی سے پرہیز جیسے امور خاص ہیں۔

ذیل میں مولانا کی بہنوں' بیٹوں'بیٹی' داماد اور پوتے'پوتیوں کے علاوہ آپ کے نواسے نواسیوں کے تاثرات درج ہیں' جو نہ صرف ان کے دلی جذبات کے ترجمان ہیں بلکہ ہمارے سامنے مولانا کے انداز تربیت کے مختلف پہلو پیش کرتے ہیں۔تفصیلات ملاحظہ فرمائیں:

اصغری بیگم صاحبہ' مولانا کی دوسری بہن:

میں مولانا کی دوسری بہن ہوں۔ جب میری عمر آٹھ سال کی تھی' تب ہمارے والد محترم کا انتقال ہوا۔ ہمارے والد ابوالحسن صاحب نماز کے بڑے پابند تھے۔سب سے اچھا سلوک کرنے والے اور بہتر تعلقات قائم رکھنے والے تھے' والد صاحب کا29 سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ ہماری والدہ محترمہ پاشاہ بیگم صاحبہ نے ہماری اچھی تربیت کی۔ مولانا سراج الحسن صاحب نے ایک والد کی طرح ہماری پرورش کی۔ کسی قسم کی کمی محسوس ہونے نہیں دی۔ بہترین انداز سے ہمارا خیال رکھا۔کبھی اونچی آواز سے بات نہیں کی۔وہ ہم تمام بہنوں کو دینی تعلیم دیتے تھے۔ فجر کی نماز کے لیے اٹھاتے تھے اور ان کے ہاتھ میں چھڑی ہوتی تھی' جب ضرورت ہو تو سختی بھی کرتے تھے۔آج اگر میں روزانہ بعد نماز فجر پابندی سے قرآن پڑھتی ہوں تو اس کا سہرا مولانا کے سر جاتا ہے۔

آپ نے ہم چاروں بہنوں کی شادی ہونے کے بعد کبھی ہمیں احساس ہونے نہیں دیا کہ ہم دوسرے گھروں میں رہتے ہیں۔ اپنے بچوں کی طرح ہم سب کے بچوں سے محبت کیا کرتے تھے۔ ہمیں نصیحت کرتے تھے کہ سب کے بچوں کے ساتھ پیار محبت سے مل جل کر رہنا چاہئے۔ ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے ہم بہنوں اور بہنوئیوں سے مشورہ کرتے تھے۔ جماعت کی ذمہ داری ہونے کی وجہ سے آپ کثرت سے دورے کرتے تھے' ہمارے امی جان اور ان کی اہلیہ محترمہ یعنی ہماری بھاوج ان کا بھرپور ساتھ دیتے تھے' کبھی کچھ پوچھا نہیں اور نہ ہی اعتراض کیا۔ مولانا

سے ملنے ہندوستان بھر سے لوگ جوگلیرہ آتے تھے'ان سب کی خاطرداری اور مہمان نوازی کے لیے دونوں بڑے جی جان سے لگ جاتے تھے۔

ہم چاروں بہنوں کے شوہر'یعنی مولانا کے بہنوئی' آپ سے بہت محبت کرتے تھے' کیونکہ مولانا نے ہمیشہ ان سے اپنے چھوٹے بھائیوں کی طرح سلوک کیا ہے۔اس لیے تمام بہنوئی مولانا کی بڑی عزت کرتے تھے اوران کی کسی بات کوکبھی ٹالتے نہیں تھے۔آج جب کے ہمارے بھائی نہیں رہے' میرے غم کی کیفیت میں بیان نہیں کرسکتی۔بس اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی ہوں کہ پروردگار میرے بھائی مولانا محمد سراج الحسن صاحب کی مغفرت فرما اور انہیں جنت الفردوس عطا فرما۔آمین۔

کنیز فاطمہ صاحبہ' مولانا کی چوتھی بہن:

جب میں گیارہ ماہ کی تھی تب والدمحترم کا انتقال ہوا۔تب سے مولانا کی صورت میں ہم پر ہمارے بھائی کا نہیں بلکہ باپ کا سایہ تھا۔ہم سب بھائی بہنیں'والدہ کے ساتھ محبت واتفاق سے رہے۔دم آخرتک آپ کا سایہ ہمارے سروں پر تھا۔آج ہم ایک باپ کی شفقت سے محروم ہوگئے ہیں۔آپ ہم چاروں بہنوں کو بہت چاہتے تھے۔میں سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے مجھ سے بہت زیادہ لاڈ پیار کرتے تھے۔اہم معاملات میں جیسے بڑی بہنوں سے مشورہ لیتے تھے'مجھ سے بھی پوچھتے کہ تمہاری کیارائے ہے؟

وہ ہمیں نمازوں کی پابندی کرنے کی تاکید کرتے تھے۔ہم سب کو فجر کی نماز کے لیے اٹھایا کرتے تھے۔آپ نے ہماری تربیت کی' ہمیں رہن سہن کے آداب سکھائے۔بڑوں کا احترام کرنا اوران کی خدمت کرنے کی نصیحت کی۔اچھی طرح سمجھاتے تھے کبھی ڈانٹے نہیں تھے اور نہ ہی کبھی اونچی آواز میں بات کرتے تھے۔دم آخرتک وہ اور ہماری بھاوج ہم سے محبت کرتے تھے اور ہمیں ان سے محبت تھی۔ہماری بھاوج بھی بڑی نیک خاتون تھیں۔وہ میری بھاوج بھی تھیں اور نند بھی۔ہمارے بھائی سے ہماری کوئی حق تلفی نہیں ہوئی۔مجھے میرے بھائی سے کوئی شکایت نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی ہوں کہ اللہ انہیں جنت الفردوس نصیب فرمائے۔میں تمام رفقائے جماعت' مردوخواتین سے گزارش کرتی ہوں کہ وہ مولانا کے بتائے

ہوئے اصولوں پر چلنے کی کوشش کریں‘ ان کے حق میں ہمیشہ دعا کرتے رہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس عطا فرمائے۔

شہناز پروین صاحبہ‘ مولانا کی دختر:

میں مولانا کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ میری شادی کے بعد جب وداعی ہو رہی تھی تو اس وقت ابا جان نے مجھے خاص نصیحتیں کیں اور کہا کہ اب تک تم ہمارے زیر پرورش تھیں‘ اب تمہیں ایک نئے گھر جانا ہے۔ وہاں تم نمازوں کی پابندی کرنا۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی کبھی خلاف ورزی نہیں کرنا۔ بدعتوں سے دور رہنا۔ اپنے گھر والوں کو دین کی طرف راغب رکھنا۔ حلال وحرام کی تمیز رکھنا۔ آخرت کے حساب سے ڈرتی رہنا۔ ایک دوسروں کے ساتھ ہمیشہ محبت سے رہنا۔ اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت کرے۔ میں دعا کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ ابا جان کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس عطا فرمائے۔

احمد ابوالمحسن صاحب‘ مولانا کے بڑے بیٹے:

حکومت کرناٹک کے محکمہ صحت سے وابستہ رہے اور ریٹائرمنٹ سے قبل ایک عرصہ تک ڈپیوٹی ڈرگ کنٹرولر کے عہدے پر فائز تھے۔ آپ کا بے داغ کردار اور امانت ودیانت سے ادا کی گئی ذمہ داریوں کو پورا محکمہ اور اس سے متعلق افراد بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ آپ مولانا کو اپنی ایسی صالح تربیت کا ذریعہ مانتے ہیں۔

محمد ابوالحسن صاحب‘ مولانا کے دوسرے بیٹے:

یہ وہ بیٹے ہیں جو مولانا کی والدہ کے انتقال کے بعد تمام کاروباری معاملات کو دیکھ اور سنبھال رہے ہیں۔ مولانا ان سے کبھی تفصیل سے معلومات حاصل نہیں کرتے تھے کہ کیا کاروبار ہو رہا ہے اور کیسے ہو رہا ہے؟ بس سب کا حق ادا کرنے اور حلال کمائی پر توجہ دینے کی تاکید کرتے‘ پیسوں کے بروقت اور صحیح استعمال پر بھی توجہ دلایا کرتے تھے۔

ڈاکٹر محمد نجیب الحسن صاحب‘ مولانا کے چوتھے بیٹے:

ابا جان مجھ سے پوچھتے کہ سرکاری تنخواہ میں PF وغیرہ کے تحت جمع ہونے والی سود کی رقم کا کیا کرتے ہو؟ جب میں نے کہا کہ اس رقم کو بغیر کسی ثواب کی نیت سے غریبوں کو دیتا ہوں تو

وہ بڑے خوش ہوتے اور میری پیٹھ تھپتھپاتے۔

انوار الحسن صاحب' مولانا کے پانچویں بیٹے:

یہ مولانا کے وہ بیٹے ہیں جنہیں مستقر رائچور پر ہونے کی وجہ سے خدمت کا زیادہ موقع ملا۔ان کے لیے مولانا کی خاص ہدایات باجماعت نماز کی پابندی اور اجتماعات میں شرکت سے متعلق ہوتی تھیں۔آپ کہتے ہیں کہ اگر کوئی ضروری خدمت کرنی ہوتی اور نماز کا وقت آتا تو اباجان نماز کے لیے مسجد جانے کی تاکید کرتے تھے۔اس کے علاوہ خدمت کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دینے کی تاکید کرتے اور یہ بھی کہتے کہ خدمت بے غرض اور بے لوث ہونی چاہئے۔

محمد فیض الحسن' مولانا کے چھوٹے بیٹے:

اباجان مجھے بھی سودی رقم سے متعلق ہدایت دیتے کہ اس کا کیا کرنا چاہئے۔وہ مجھ سے اکثر پوچھتے کہ میں اپنے دفتر میں ساتھ کام کرنے والوں سے کیسا رہتا ہوں؟ کیا صرف اپنے کام سے کام رکھتا ہوں یا ملاقاتیں وغیرہ بھی ہوتی ہیں؟ اور یہ بھی پوچھتے کہ کام کرنے کے دوران دوسروں سے گفتگو کرتے ہوئے وقت تو ضائع نہیں کرتا؟ اور یہ بھی معلوم کرتے کہ دوپہر کے کھانے کے وقفے میں کن کن سے بات کرتا ہوں وغیرہ۔غرض ابا جان ہمارے ذاتی اور معاشی معاملات سے متعلق نہ صرف مکمل معلومات حاصل کرتے بلکہ ہماری اصلاح ورہنمائی بھی فرماتے۔اورسب سے روابط وتعلقات رکھنے پر ہمیشہ متوجہ کرتے۔

مولانا کے بیٹوں اوران کے بچوں کا بھی کہنا ہے کہ مولانا کا اپنی وقتی غلطی پر نادم ہونا اور پچھتانا' بہت خاص تھا اورآپ نے اس ضمن میں کبھی تاخیر نہیں کی۔خود بھی حقیقت پسند بنے رہتے اورسب بچوں کو بھی تاکید کرتے کہ عجز وانکساری شخصیت کی پہچان ہونی چاہئے۔ان سبھی حضرات کا کہنا ہے کہ مولانا ہرایک کی بات بڑی توجہ سے سنتے' بیچ میں کبھی نہیں ٹوکتے' چاہے بات بڑا کرے یا چھوٹا۔اورفرماتے کہ جب آپ کسی کی بات سنیں گے تب ہی کہنے کا حق حاصل ہوگا۔

سلمی یاسمین صاحبہ' مولانا کی بڑی بہو:

اباجان کی روح عصر اور مغرب کے درمیان پرواز کرگئی۔جس طرح سورج غروب ہوتا

ہے‘ہمارا سورج بھی غروب ہوگیا۔مگر کرنیں ہمیشہ روشن رہیں گی‘قیامت تک‘ان شاء اللہ۔

جانے والے کبھی لوٹ کر نہیں آتے

جانے والوں کی یاد آتی ہے

اخلاق کے لحاظ سے ابا جان کا رتبہ بہت بلند تھا۔نرم دل‘ محبت‘عفوودرگزر اور شفقت سے بھرپور تھا۔دشمنوں تک کو معاف کردیتے تھے۔بے حد فیاض‘ مہمان نواز اور غرباء پرور تھے۔جو بھی مہمان گھر آتے‘ان کی خاطر کیے بغیر نہیں بھیجتے تھے۔یہاں تک کہ گھر کے خادم کو بھی اپنے ساتھ کھانے میں شریک کرلیتے تھے۔گھر میں تمام بہوؤں اور بچوں کے ساتھ فیملی اجتماع کیا کرتے تھے۔آپ سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔سب کو نمازوں کی پابندی اور قرآن کی تلاوت کرنے کی نصیحت کرتے تھے۔ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر محبت سے رہنے کی تاکید کرتے تھے۔ہم سب کو اپنی ذمہ داریاں سمجھاتے تھے۔کبھی آپ کے چہرے سے غصہ یا ناراضگی ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ہمیشہ مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کر سب کی پریشانیاں دور ہوجاتی تھیں۔ابا جان کے بارے میں جتنا بھی کہا جائے کم ہے‘الفاظ ختم ہی نہیں ہوتے۔اس ناچیز کی دعا ہے کہ اللہ رب العزت ابا جان کے درجات بلند فرمائے۔

فوزیہ سلطانہ صاحبہ‘ مولانا کی دوسری بہو:

میں مولانا کی بہن عائشہ بیگم صاحبہ کی بیٹی ہوں‘ آپ کی بھانجی اور بہو ہوں۔الحمد للہ مرحوم ماموں جان ہم بھائی بہنوں سے بے انتہا محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے۔اکثر رائچور میں قیام کے دوران وہ ہمارے ہی گھر میں رہتے تھے۔تمام بہنوں اور بچوں کو اکٹھا کرکے اجتماعی پروگرام رکھتے تھے۔آپ کے ذریعہ دینی ماحول ملا۔میری شادی کے بعد‘اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مجھے آپ کی بہو بننے کا شرف حاصل ہوا۔میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتی ہوں کہ شادی کے بعد سے رحلت تک آپ کی خدمت کرنے کا موقع ملا۔مجھے آپ کی خدمت سے بڑا دلی سکون ملتا تھا۔اور آپ مجھے ہمیشہ دعاؤں سے نوازتے تھے۔فرماتے کہ اس خدمت کا اللہ تعالیٰ آپ کو بھرپور اجر دے گا۔اب ہم اس عظیم ہستی سے محروم ہوگئے ہیں۔دل رنجیدہ اور غمگین ہے۔گھر میں سب لوگ ہونے کے بعد بھی گھر بے رونق لگ رہا ہے۔ہر دم مرحوم ماموں جان

کی باتیں اور ان کا چہرہ یاد آتا ہے۔ ماموں جان مجھ سے ہمیشہ کہتے تھے کہ تم کو سب کا خیال رکھنا ہے۔ خاص طور پر میرے دیور نجم الحسن صاحب اور ان کے اہل وعیال کی خیر خیریت معلوم کرنے کو کہتے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم نجم الحسن صاحب کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس عطا فرمائے۔ دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ماموں جان کی کروٹ کروٹ مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

نعیمہ پروین صاحبہ' مولانا کی تیسری بہو:

میں مولانا کی تیسری بہو ہوں۔ میرے خسر' شادی سے پہلے میرے ابا کے بہت قریبی دوست تھے۔ ہمارے گھر ان کا آنا جانا ہوتا تھا۔ مولانا جب بھی ہدایت دیتے ان کی باتوں میں اتنی تاثیر ہوتی کہ ہم انہیں فوراً مان لیتے تھے۔ آپ کا جب بھی بنگلور آنا ہوتا' ہمارے گھر میں قیام کرتے۔ اس وقت ہم اپنے گھر میں کافی رونق محسوس کرتے' عید جیسا ماحول لگتا تھا۔ آپ جب بھی میرے گھر آتے' سب کے ساتھ مل جل کر رہتے' مل کر نماز پڑھتے اور مل کر کھانا کھاتے تھے۔ مولانا سے مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ آپ کے اخلاق وکردار اتنے اچھے تھے کہ جو بات بھی وہ کہتے ہم فوری اس پر عمل کرتے تھے۔ میں اپنے خسر محترم کو دنیا کے لیے ایک مثال سمجھتی ہوں۔ امیر ہوں یا غریب سب کے ساتھ آپ کا ایک جیسا برتاؤ ہوتا تھا۔ جب وہ کچھ کہتے تو ان کے الفاظ دلوں کو چھو جاتے تھے۔ پردے کے معاملہ میں بہت سخت تھے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ میرے خسر کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس عطا فرمائے۔ آمین۔

یاسمین فاطمہ صاحبہ' مولانا کی چوتھی بہو:

میں مولانا کی بھانجی اور چوتھی بہو ہوں۔ ماموں جان کی شخصیت عظیم تھی۔ آپ بلند اخلاق وکردار کے مالک تھے۔ آپ نے اپنی زندگی میں رشتوں کو بہت خوبصورت طریقے سے نبھایا ہے۔ اپنی اہلیہ' بچوں' بہنوں اور ان کے بچوں سے بڑی محبت وشفقت سے پیش آتے تھے' ایسا ان کے جیسا بہترین انسان ہی کرسکتا ہے۔ ماموں جان ہمیشہ یہ بات بتاتے تھے کہ دنیا میں جیو لیکن دنیا پر مرومت۔ جو انسان' دنیا کے پیچھے بھاگتا ہے اسے دنیا نہیں ملے گی۔ مجھے نصیحت کرتے ہوئے کہتے کہ زندگی' بے بندگی' شرمندگی۔ مجھے اولاد کی دینی لحاظ سے تربیت

کرنے اور دنیا کی تعلیم سے انہیں روشناس کرانے کی تاکید کیا کرتے تھے۔ یہ بھی کہتے کہ اگر تم تحریک کو کچھ دے نہیں سکتے تو اس کو نقصان بھی مت پہنچاؤ۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ ماموں جان کے درجات بلند فرمائے۔ اور جنت الفردوس عطا فرمائے۔

جبین فاطمہ صاحبہ' مولانا کی پانچویں بہو:

الحمدللہ میں مولانا محمد سراج الحسن صاحب کی بھانجی بھی ہوں اور پانچویں بہو بھی۔ اللہ تعالیٰ کا بے انتہا شکر ہے کہ مجھے اس عظیم اور بے مثال شخصیت کی سرپرستی میں رہنے کا شرف حاصل ہوا۔ والدین کی عمدہ تربیت کے بعد سسرال میں مولانا محترم کے زیر سایہ ذاتی اصلاح وتربیت کرنے اور نیک اعمال انجام دینے کا ایک اچھا موقع حاصل رہا۔ ماموں جان کی اچھی اچھی خوبیاں میرے اندر پیدا ہوئیں جیسے صبر' شکر' فرائض کی پابندی' محبت' بڑوں کا ادب واحترام' غریبوں کے ساتھ حسن سلوک وغیرہ۔ اس بے مثال اور عظیم شخصیت کے زیر سایہ میں نے اپنی شادی کے 23 سال گزارے۔ آپ ہر دن تحریک سے جڑ کر کام کرنے کی نصیحت کرتے تھے۔ خصوصاً پچھلے پانچ' چھ سالوں سے ہفتہ واری اجتماعات اور بڑے پروگراموں کی روداد سننا آپ کا معمول بن گیا تھا۔ جب بھی میں ہفتہ وار اجتماع یا کسی پروگرام سے واپس آتی تو ساری تفصیلات معلوم کرنے کے بعد خوشی اور اطمینان کا اظہار کرتے تھے۔ میری ہمت افزائی کرتے اور دعا دیتے تھے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری کوششوں کو قبول فرمائے اور مزید ترقی دے۔

پھر ذاتی اور نجی معاملات کے سلسلہ میں ہم سے فرداً فرداً پوچھتے اور بہترین راہنمائی کرتے تھے۔ مجھ سے گھریلو معاملات کے بارے میں بھی پوچھتے کہ میں خوش ہوں یا نہیں۔ دیگر بہوؤں کے ساتھ اتفاق واتحاد کے بارے میں پوچھتے۔ اور ہمیشہ مل جل کر رہنے کی نصیحت کرتے تھے۔ تحریک سے وابستہ رہنے کے لیے ترغیب دلاتے۔ الحمدللہ جب جنوری 2019 میں میری رکنیت منظور ہوئی تو سب سے پہلے جب ماموں جان کو اس کی اطلاع دی تو وہ بہت خوش ہوئے اور دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ استقامت عطا کرے۔

یہ عظیم شخصیت قرآنی احکامات کا عملی نمونہ تھی۔ آپ کے اندر بے شمار اعلیٰ صفات تھیں جیسے آپ نے کبھی کسی کا مذاق نہیں اڑایا۔ کبھی جھوٹ نہیں بولے' کبھی بدکلامی نہیں کی۔ تمام اخلاقی

برائیوں سے محفوظ رہے۔دم آخر تک نمازوں کے پابند اور وقت پر نماز ادا کرنے کا جذبہ رہا۔ ایک نماز ادا کرنے کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا.... یہ سب خوبیاں مجھے اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع ملا۔مولانا کی رحلت امت مسلمہ کے ساتھ ساتھ ہمارے خاندان کے لیے بھی بہت بڑا نقصان ہے۔غرض ماموں جان دم آخر تک تحریکی مشن کے لیے کوشاں رہے۔اللہ تعالیٰ ماموں جان کی خدمات قبول فرمائے' آپ کے درجات بلند فرمائے' آپ جیسی عظیم شخصیت کا نعم البدل عطا فرمائے۔میرے خاندان میں' اپنی اولاد میں اور نسلوں میں کئی سراج پیدا کرے۔آمین ثم آمین۔

بتول فاطمہ صاحبہ' مولانا کی چھوٹی بھو:

میں مولانا کی بہن عائشہ بیگم صاحبہ کی پوتی ہوں' اور مولانا کی چھوٹی بہو ہوں۔ مجھے شادی کے بعد سے مولانا کی سرپرستی میں رہنے کا شرف حاصل ہوا۔آپ بڑی ہی عمدہ شخصیت کے مالک تھے۔ مجھے اپنے ماموں جان سے اچھی اچھی خوبیاں سیکھنے اور انہیں اپنانے کا موقع ملا۔ جب بھی موقع ملتا' آپ ہمیں بڑی ہی عمدہ نصیحتوں سے نوازتے تھے'یہ میرے لیے بڑی خوش نصیبی کی بات ہے۔میرے سامنے یہ شعر سنایا کرتے تھے:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان' لیکن پھر بھی کم نکلے

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عظیم ہستی کی خدمات قبول فرمائے۔اور جنت الفردوس عطا فرمائے۔آمین ثم آمین۔

شیخ احمد سوداگر صاحب' مولانا کے داماد:

افراد خاندان کے لیے منعقدہ تعزیتی نشست میں اپنے تاثرات کا اس طرح اظہار کیا:

مولانا محمد سراج الحسن صاحب جیسی شخصیت بہت کم پیدا ہوتی ہے۔ہماری خوش نصیبی کہ ان کے ساتھ ہم نے زندگی گزاری ہے۔میں نے زندگی میں کبھی آپ کو ناراض ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔کبھی کسی سے بدکلامی کرتے ہوئے نہیں سنا۔جس سے بھی ملتے' محبت سے ملتے تھے۔میں نے کئی لوگوں کو دیکھا جو آپ کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن آپ کے حسن اخلاق سے وہ گرویدہ ہوگئے۔آپ نے اپنے گھر' خاندان اور رشتہ داروں کے معاملات میں کبھی کوئی خلاف

شریعت کا م نہیں کیا۔ آج ہمارا پورا خاندان ایک دینی ماحول میں ہے' تو یہ آپ ہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ آج سب افراد خاندان مل جل کر خوشی سے رہتے ہیں' یہ آپ کی تربیت کی بدولت ہے۔ مولانا کے بیٹے بڑے خوش قسمت ہیں کہ انہوں نے آخری وقت تک ان کی خدمت کی ورنہ ہم دیکھتے ہیں کہ بچے اپنے بوڑھے والدین کی ایسی خدمت نہیں کرتے۔ یہ مولانا کے حسن اخلاق ہی کا اثر ہے کہ آج ہم میں سے کوئی آپ سے ناراض نہیں ہے۔ جو راستہ اور اصول مولانا نے بتائے ہیں اس پر چلنا' اس پر قائم رہنا اور انہیں آگے بڑھانا اب ہم سب کی ذمہ داری ہے' ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ ایک شخصیت آئی' چلی گئی اور ہم اپنے کاموں میں مصروف ہو جائیں۔

میرے خیال میں قرآن مجید کی اس آیت کے مولانا حق دار ہیں:

اَلَا اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ (سورہ یونس:۶۲)

سُنو! جو اللہ کے دوست ہیں، جو ایمان لائے اور جنہوں نے تقوٰی کا رویّہ اختیار کیا، ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔

..... آپ پر بھی کئی مصیبتیں اور پریشانیاں آئیں لیکن کبھی آپ مایوس اور غمزدہ نہیں ہوئے' ہر حال میں صبر وشکر کے پیکر بنے رہے۔

وحیدہ نسیم صاحبہ' مولانا کی بھانجی:

میں مولانا کی بہن خدیجہ بیگم صاحبہ کی بیٹی ہوں۔ میری والدہ' اپنے بھائی کی طرح تحریک سے وابستہ تھیں۔ ماموں جان کی شخصیت بہت عمدہ تھی۔ آپ کے اخلاق وکردار اور صفات اعلیٰ تھیں۔ ان کے خیالات بڑے نیک تھے۔ تہجد گزار' اعتکاف کے پابند' شوال کے پابندی سے روزے رکھنے والے۔ مہمان نواز اور ہر ایک سے نیک سلوک کرنے والے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی بندگی میں اپنی ساری زندگی گزار دی' اور اسی حال میں اپنے رب سے جا ملے۔ میں دعا کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ ماموں جان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

شاهده پروین صاحبه' مولانا کی پوتی:

میں مولانا کی پوتی ہوں۔ اللہ کا بے انتہا شکر ہے کہ میں دادا جان کے زیر سایہ پلی اور

بڑھی ہوں۔ ہمارے داداجان ہم سب پوتے پوتیوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ داداجان کی ہمیشہ ہمارے لیے بہت نصیحتیں ہوتی تھیں۔ بچپن سے لے کر ان کی رحلت تک وہ ہمیں بہت کچھ سکھا کر اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان کی یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ' تادم حیات قائم رہے گی۔ ان کی شخصیت کا کوئی جواب نہیں۔ وہ تحریک سے جڑے افراد سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ داداجان کو ہمیشہ تحریک کے بارے میں بہت فکر رہتی تھی۔ ہم جب بھی کسی اجتماعی پروگرام سے لوٹتے تو اس کا برابر جائزہ لیتے تھے۔ داداجان گھر کے افراد کی بھی بہت فکر کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ دسترخوان پر بھی ہوں تو سب کا انتظار کرتے اور کسی کے آنے میں دیر ہو تب بھی انتظار کرتے اور سب کے آنے کے بعد کھانا کھاتے۔ آپ کا رویہ بہت عمدہ ہوتا تھا۔ ہر بات میں کوئی نہ کوئی نصیحت چھپی ہوئی ہوتی تھی۔ سب پوتے پوتیوں میں مجھے داداجان کے ساتھ زیادہ رہنے کا موقع ملا۔ داداجان ہمارے خاندان کا چراغ تھے۔ اب صرف تحریک ہی نہیں بلکہ پورا خاندان آپ سے محروم ہوگیا ہے۔ داداجان لوگوں کے لیے مثال تھے۔ ہم جب بھی کسی تقریب میں جاتے' واپس آنے تک ہمارا انتظار کرتے تھے۔ جب ہم داداجان سے کہتے کہ رات بہت ہوگئی سو جائیں تو کہتے کہ سب گھر کے باہر ہیں تو میں بے فکری کے ساتھ کیسے سو سکتا ہوں؟

داداجان ہم سب کو پابندی سے نماز پڑھنے کی تلقین کرتے تھے۔ ہمیں آپ سے جو سیکھنے کو ملا بس یہ کہنا چاہوں گی:

مری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں' میں اسی لیے نمازی

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ میرے داداجان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ انہیں اعلیٰ علیین میں جگہ عنایت فرمائے۔ اور جنت الفردوس عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

عاتکہ پروین صاحبہ' مولانا کی پوتی

میں عاتکہ پروین' مولانا کی پوتی اور ان کے صاحبزادے محمد ابوالحسن صاحب کی تیسری بیٹی ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا بے حد شکر و احسان ہے جس نے مجھے اس عظیم شخصیت کے گھر کا فرد

بنایا۔ الحمدللہ۔ میں دادا جان کے بہت قریب تھی۔ دادا جان مجھے اپنا دوست سمجھتے تھے۔ مجھ سے بہت ساری باتیں کرتے تھے، ایسی باتیں جن سے مجھے سیکھنے کو ملا۔ دادا جان کھانے پینے کے شوقین تھے لیکن کبھی فرمائش نہیں کرتے تھے۔ نماز کے پابند اور وقت کے پابند تھے۔ صفائی پسند تھے۔ مہمان نواز تھے۔ ہر کسی سے خلوص و محبت کے ساتھ مسکرا کر بات کرتے تھے۔ پوتے پوتیوں کے ساتھ کھیلتے، ان کے حال چال جانتے۔ دادا جان مہمانوں سے سلام دعا کی درخواست کرتے اور ان کو بھی دعائیں دیتے تھے۔ آپ میری سہیلوں کے بارے میں پوچھتے تھے اور یہ بھی پوچھتے کہ میرے پسندیدہ شوق کیا ہیں اور زندگی کا مقصد کیا ہے؟ میری پڑھائی کے بارے پوچھتے۔ میں جی آئی او کی ممبر ہوں تو مجھ سے تنظیم اور تحریک سے جڑے کاموں کی رپورٹ لیتے اور نصیحت کرتے کہ ہم جو بھی کام کریں صرف اللہ کے لیے اور اپنی آخرت کے لیے کریں، ہر کام چھوٹا ہو یا بڑا، دل سے کرنا چاہئے پوری آمادگی کے ساتھ۔ اور یہ کہتے کہ جو لوگ کوشش نہیں کرتے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ دادا جان جو کہتے اس پر عمل کرتے تھے۔

میں خوش نصیب ہوں کہ دادا جان کی خدمت میرا مقصد بن چکا تھا۔ آپ کی خدمت میں سکون محسوس ہوتا تھا۔ وہ مجھ سے اکثر پوچھا کرتے تھے کہ کہیں میں تم کو تکلیف تو نہیں دے رہا ہوں؟ میں ایسے جواب دیتی کہ وہ بہت خوش ہوتے اور مجھے بہت ساری دعائیں دیتے۔ دادا جان کو دین و دنیا کے علاوہ اپنی آخرت کی بہت فکر تھی۔ وہ ہماری آخرت کی بھی فکر کیا کرتے تھے اس لیے ہمیں نصیحت کرتے اور ہدایت دیتے تھے۔ پچھلے چند مہینوں سے دادا جان کی طبیعت ناساز تھی۔ وہ اکثر باتیں بھول جاتے تھے۔ میں جب ان کے پاس بیٹھتی تو میرا ہاتھ بہت دیر تک پکڑے رہتے تھے۔ نماز پڑھنے کے دوران اگر کوئی سورہ بھول جاتے تو رونے لگتے۔ بعد میں جب میں پوچھتی تو کہتے کہ میرے حق میں دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ مجھے معاف کرے، مجھے یاد نہیں آرہا ہے کہ نماز میں آگے کیا پڑھنا ہے؟ پھر نماز پڑھنے لگتے اور جب تک پوری نماز نہیں پڑھتے تب تک کوشش کرتے رہتے تھے۔

عید کے موقع پر جب سب لوگ جمع ہوتے تو دادا جان بہت خوش ہوجاتے تھے۔ سب کو دعائیں دیتے۔ اور فیملی اجتماعی کرتے۔ ایسی اور بھی بہت ساری باتیں ہیں، جتنا بھی کہوں دادا

جان کے بارے میں کم ہے۔میں بس دعا کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ دادا جان کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس عطا فرمائے۔آمین

سمیہ پروین صاحبہ' مولانا کی پوتی

میں سمیہ پروین' مولانا کی پوتی اور مرحوم محمد نجم الحسن صاحب کی بیٹی ہوں۔الحمد للہ اچھے والد ہی اچھے دادا کا مقام حاصل کرتے ہیں۔دادا جان بڑے ہی مخلص' ملنسار اور پاکباز تھے جنہوں نے اپنی ساری زندگی اللہ کے دین کے لیے لگادی۔ہر کسی کے ساتھ ہمیشہ یکساں رویہ رکھا۔آپ کی شخصیت کی تعریف میں میرے الفاظ کم پڑ رہے ہیں۔اللہ کا فضل کہ میں دادا جان کی پوتی ہوں، اس پر اس کی شکر گزار ہوں۔دادا جان اپنے وقت کے ایک اہم ترین قائد تھے جو آنے والی نسلوں کے لیے ان شاء اللہ ترغیب کا ذریعہ بنیں گے۔دادا جان کی تعلیمات نے ہماری خوب تربیت کی ہے' ہمیں یہ سکھایا ہے کہ کیسے مشکل حالات میں صبر کرنا چاہئے اور کیسے خوشحالی کے موقع پر دوسروں کے دکھ سکھ بانٹنے کی کوشش کرنی چاہئے۔دادا جان کی کمی ہمیشہ ہمیش محسوس ہوگی۔لیکن ہمیں ایک طرح کا اطمینان ہے کہ ہمارے والد اور دادا جان اللہ تعالیٰ کے حوالے ہیں' زندگی دراصل ایک ایسا سفر ہے جو اللہ سے شروع ہوکر اللہ ہی پر ختم ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ دادا جان کو جنت الفردوس کی تمام نعمتیں عنایت فرمائے اور انہیں سکون وراحت پہنچائے۔آمین

شاہین فاطمہ صاحبہ' مولانا کی نواسی

میں شاہین فاطمہ' مولانا کی بڑی نواسی ہوں۔الحمد للہ میں خود کو خوش نصیب سمجھتی ہوں کہ میں اپنے نانا جان کی نواسی ہوں۔الحمد للہ علی کل حال۔ہر حال میں اللہ کی تعریف بیان کرنا اور ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا' یہ میں نے نانا جان سے سیکھا ہے۔نانا جان مجھے اللہ ہی کی بندگی کرنے اور اللہ کے بندوں کی خدمت کرنے کی نصیحت کرتے تھے۔مجھے اچھی طرح یاد ہے جب بچپن میں ہمارے سر سے اوڑھنی نکل جاتی تو آپ فوری سر ڈھانک لینے کے لیے کہتے تھے۔جب ہم نانا جان کے گھر سے اپنے گھر کے لیے نکلتے تو کہتے کہ گھر پہنچنے کے بعد اطلاع دو۔اگر ہم اطلاع دینا بھول جاتے تو نانا جان کسی نہ کسی کے ذریعہ فون سے بات کراتے اور پوری خبر لیتے۔علم تو سبھی لوگوں کے پاس ہوتا ہے لیکن علم کے ساتھ عمل بہت کم لوگوں کے پاس

ہوتا ہے نانا جان کی شخصیت ایسی تھی کہ جو آپ کے پاس علم تھا اس کے مطابق عمل کرتے تھے۔اللہ کو راضی کرنے کے لیے نانا جان نے اپنی ساری زندگی قرآن وسنت کے مطابق گزاری' ساری زندگی اللہ کی عبادت کی۔اس لیے اپنی زندگی کے آخری مہینوں میں سب کچھ بھول گئے لیکن اللہ کی عبادت کرنا نہیں بھولے۔اپنی نمازوں کے علاوہ ہم سب کی نمازوں کی برابر فکر کیا کرتے تھے۔اللہ تعالیٰ نانا جان کی مغفرت فرمائے' انہیں جنت الفردوس عطا فرمائے اور ہم سب کو قرآن وسنت پر پابندی سے چلنے کی توفیق عنایت فرمائے۔آمین

عظمیٰ پروین صاحبہ' مولانا کی نواسی

میں عظمی پروین' مولانا کی تیسری نواسی ہوں۔نانا جان جیسی شخصیت شاید ہی ہمیں دیکھنے کو ملے۔میری خوش قسمتی کہ میں نے نانا جان کی خدمت کی۔اگر میں کسی دن ان کے گھر نہیں جاتی تو وہ یاد سے مجھے بلایا کرتے تھے اور میں جا کر ان کی خدمت کرتی تھی۔جب بھی مجھے نانا جان بلاتے میں فوری ان کی خدمت میں حاضر ہوتی تو نانا جان میرے رویے پر بہت خوش ہو کر دعائیں دیتے تھے۔نانا جان گھر میں جب نماز پڑھتے تو بازو بیٹھے رہنے کی میری ذمہ داری ہوتی تھی۔ایک دن آپ نے کہا کہ تم نے خدمت کا سارا ریکارڈ توڑ دیا۔نانا جان کی خوشی دیکھ کر الحمد للہ ہم آپ کی اور زیادہ خدمت میں لگ جاتے تھے۔بس دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے نانا جان کو جنت الفردوس عطا فرمائے۔آمین

عطیہ پروین صاحبہ' مولانا کی نواسی:

میں مولانا کی دوسری نواسی ہوں۔ نانا جان کی تعریف زندگی بھر کی جائے تو بھی کم ہے۔آپ کی زندگی ایک مثال ہے۔آپ کو بھلانا آسان نہیں۔نانا جان جیسی شخصیت شاید ہی ہمیں دنیا میں دیکھنے کو ملے۔

آپ نے ہمیشہ ہمیں دین او دنیا کے سلسلہ میں بہترین نصیحتیں کی ہیں' ان باتوں کو ہم بھلا نہیں سکتے۔آپ کے بولنے کا انداز اتنا میٹھا ہوتا تھا کہ ہم آپ کی باتوں میں کھو جاتے تھے۔اللہ تعالیٰ نانا جان کی مغفرت فرمائے۔ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔اور جنت الفردوس عطا فرمائے۔آمین۔

غزالہ نازنین صاحبہ' مولانا کی نواسی:

میں مولانا کی بہن خدیجہ بیگم کی نواسی ہوں۔نانا جان بہت نیک اور ہمدرد انسان تھے۔نانا جان نے نہ صرف تحریک بلکہ خاندان کے افراد کی بھی تربیت کی۔بڑے سکون اور اطمینان کے ساتھ وہ افراد خاندان کی تربیت کیا کرتے تھے۔آپ ہمیشہ یہی بات کہتے تھے کہ سب اپنے اعمال اچھے کرلوٗ ان شاءاللہ ہم سب جنت میں بھی ساتھ رہیں گے۔وہ ہمیں نمازوں اور وقت کی پابندی کے علاوہ آخرت اچھی بنانے کے بارے میں نصیحت کرتے تھے۔نانا جان کو نہ صرف اپنی بلکہ سب کی نمازوں کی فکر رہتی تھی۔وہ اگر غصہ بھی کرتے تو وہ غصہ ہمارے دلوں میں اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا کرنے کے لیے ہوتا تھا۔اللہ تعالیٰ ہمیں بھی نانا جان جیسا بنائے' یقیناً آپ کا کردار سب کے لیے مثالی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے' بلند درجات عطا فرمائے۔آمین ثم آمین۔

نوشین رانا صاحبہ' مولانا کی نواسی

میں نوشین رانا' مولانا سراج الحسن صاحبؒ کی بہن کنیز فاطمہ صاحبہ کی پوتی اوران کی ایک اور بہن اصغری بیگم صاحبہ کی نواسی ہوں۔نانا جان بہت بڑی ہستی تھے۔ہم بچپن ہی سے اپنی دادی جان اور نانی جان سے آپ کی نیکی اور سچائی کے قصے سنتے آرہے ہیں۔نانا جان بڑے نیک اور سچے انسان تھے۔آپ ہمیں ہر طرح کی نیکی کا علم دے کر گئے ہیں۔آج نانا جان ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن وہ ہم سب کے دلوں میں ہیں۔ان شاءاللہ ہم سب نانا جان کا نام روشن کریں گے اور ان کی بتائی ہوئی نصیحتوں پر عمل کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نانا جان کی مغفرت فرمائے اورانہیں جنت الفردوس عطا فرمائے۔آمین۔

مولانا کے پوتے انصار الحسن' نوید الحسن اور نواسے محمد عرفان

نماز کے حوالے سے مولانا کی نصیحتیں یاد کرتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ دادا جان نماز کی بڑی سختی سے پابندی کرتے تھے حتی کہ جب آخری دنوں میں آپ ہاسپٹل میں ایڈمٹ تھے، جب بھی ہوش آتا وقت اور قبلہ کا رخ ضرور پوچھتے تھے۔کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے دادا جان ہاسپٹل میں

ایڈمٹ تھے، حالت بڑی نازک تھی، ہاتھ میں سوئیاں لگی تھیں، پیروں میں درد تھا، جس کی وجہ سے جسم کو حرکت دینے میں وہ تکلیف محسوس کر رہے تھے۔ جب میں نے دیکھا کہ دادا جان ہاتھ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں تو میں نے سیدھے لیٹنے کے لیے مدد کی اور آپ کو تھوڑا سے اوپر کی طرف کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد دادا جان نے کہا کہ تم نے میری نماز خراب کر دی۔ تب ہم نے سمجھا کہ دادا جان اس حالت میں بھی نماز ادا کر رہے تھے۔

آپ کے پوتے کہتے ہیں کہ رات سونے سے قبل کے معمولات میں تھوڑا سا بھی فرق آتا تو دادا جان غصہ کرتے اور پھر تھوڑی دیر بعد اس کا افسوس کرتے کہ میں نے خوامخواہ تم پر غصہ کر دیا، حالانکہ وہ غصہ برائے نام ہوتا تھا، پھر بھی دادا جان فوری رجوع ہوتے اور پچھتاتے کہ غصہ کر دیا۔

محمد امین الحسن صاحب، مولانا کا پوتا

میں محمد امین الحسن، مولانا کا پوتا اور مرحوم محمد نجم الحسن صاحب کا بیٹا ہوں۔ دادا جان کے بارے میں جتنا بھی بولو کم ہے۔ میں ان کا پوتا ہوں اس پر میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ دادا جان اور دوسروں میں فرق یہ ہے کہ جو کچھ پڑھتے اور سیکھتے ہیں اس پر وہ عمل کرتے ہیں لیکن دادا جان کبھی سیکھنے سے پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھے پیٹ کے درد کی وجہ سے پوری رات نیند نہیں آرہی تھی۔ فجر کے وقت دادا جان اٹھے اور مجھے پریشان دیکھ کر پوچھا کہ کیا ہوا ہے۔ میں نے اپنی تکلیف بیان کی تو دادا جان نے ایک گلاس پانی لانے کو کہا۔ انہوں نے پانی پر دعا پڑھ کر پھونکی اور مجھے پینے کو کہا اور پھر اپنا ہاتھ میرے پیٹ پر درد کی جگہ رکھ کر خوب دعائیں پڑھیں، اس کے بعد پوچھا اب درد کیسا ہے؟ میں نے کہا کہ ابھی تھوڑا باقی ہے تو پھر دعائیں پڑھتے اور پوچھتے رہے یہاں تک کہ میرے پیٹ کا درد دور ہو گیا۔ جب میں نے دادا جان سے یہ کہا تو آپ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور مجھ سے بھی کہا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

دادا جان ہمارے درد کو اپنا درد سمجھتے تھے اور ہماری خوشی کو اپنی خوشی سمجھتے تھے۔ جب بھی وہ بنگلور میں ہمارے گھر آتے میں ان کی خدمت کرتا۔ جب ان کی طبیعت ناساز تھی تو ایک مرتبہ غسل کرتے وقت حمام میں ساتھ تھا، دیکھا کہ آپ پانی کا بہت ہی احتیاط سے استعمال

کررہے ہیں، مجھ سے بھی کہتے کہ ہمیشہ پانی کا احتیاط سے استعمال کرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر چیز کا جواب دینا ہے۔

دادا جان نماز کے بڑے پابند تھے، فجر کی نماز اور ناشتے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد سونے سے پہلے ہمیں پوچھتے کہ ظہر کی اذان کب ہوگی؟ اور اذان ہونے سے پہلے ہی اٹھ کر نماز کی تیاری کرتے تھے۔ میں نے کبھی ان کو نماز قضا کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ میں نے دادا جان سے بہت کچھ سیکھا ہے جیسے نمازوں کو وقت کی پابندی کے ساتھ ادا کرنا، وقت کی پابندی کرنا، مہمان نوازی اور پانی کا احتیاط سے استعمال کرنا۔ افسوس ہے کہ دادا جان کی خدمت کرنے کا مجھے زیادہ موقع نہیں ملا کیوں کہ میں بنگلور میں رہتا تھا۔ دادا جان ہم سب بہت محبت کرتے تھے، ہم پر جان چھڑکتے تھے۔ اچھے طریقے سے بات کرتے تھے، کبھی ہم پر غصہ نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دادا جان کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس عطا فرمائے۔ آمین۔

فرقان سوداگر صاحب، مولانا کا نواسا

میں فرقان سوداگر، مولانا کا چھوٹا نواسا ہوں۔ میں اکثر نانا جان کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ گرنے سے مجھے چوٹ لگ گئی۔ میری کمر میں کافی درد تھا۔ بہت کچھ علاج کرنے پر بھی درد کم نہیں ہو رہا تھا۔ نانا جان کو معلوم ہوا تو مجھے بلایا اور پوچھا کہ درد کہاں کہاں ہے؟ پھر آپ نے دعا پڑھ کر میری پیٹھ پر دم کیا۔ الحمد للہ میرا درد ختم ہوگیا۔ اب کئی سال ہوگئے ہیں مجھے وہ درد پھر کبھی محسوس نہیں ہوا۔ نانا جان کی دعاؤں میں اللہ تعالیٰ نے بہت شفاء رکھی تھی۔ بہت سے لوگ سر درد اور بواسیر کے مرض کی تکلیف کے ساتھ آتے تھے اور نانا جان کی دعاؤں سے صحت یاب ہو کر جاتے تھے۔ میری دعا ہے کہ نانا جان کی اس بے لوث خدمت کے بدلے میں اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس عطا فرمائے۔ آمین۔

مولانا محمد سراج الحسن صاحبؒ نے جس نہج پر اپنے اہل وعیال اور افراد خاندان کی تربیت فرمائی، قرآن مجید کی یہ دعا آپ کی ان تمام کوششوں پر صادق آتی ہے.........

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيَاتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا۔

اے ہمارے ربّ، ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہم کو

پرہیزگاروں کا امام بنا (سورہ الفرقان:۷۴)۔

رب کریم یہ دعا ہم سب کے حق میں قبول ومنظور فرمائے۔

مولانا سے عقیدت ومحبت کا تقاضا

اہل خاندان کے یہ جذبات وتاثرات مولانا مرحوم کی شخصیت کے ایک ایسے پہلو سے پردہ اٹھاتے ہیں جو باہر کی دنیا کے لیے اجنبی رہا۔ شخصیت کا یہ درخشاں پہلو اتنا ہی دلنواز، ہمہ گیر اور جہد مسلسل کا پیکر ہے جتنا کہ شخصیت کا وہ پہلو جو باہر کے حلقوں میں جانا پہچانا جاتا ہے۔ مولانا کی شخصیت کے داخلی اور خارجی پہلو میں یکسانیت، اللہ رب العزت کی بارگاہ میں، اقامت دین کی جدوجہد کے قبول ہونے کی غماض ہے۔ اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو۔

یہاں افراد خاندان نے جن جذبات اور تاثرات کا اظہار کیا ہے اب ان سب کا عملی نمونہ بننا ہی، مولانا سے سچی عقیدت ومحبت کا تقاضا ہے، جیسا کہ بعض افراد خاندان نے اس کا ذکر کیا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اس سلسلہ میں خاص ہدایت فرمائی ہے کہ اگر والدین دنیا میں نہ ہوں تو ان کے حق میں کیسے نیک اعمال انجام دیئے جاسکتے ہیں؟

حضرت ابواسید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں بیٹھے تھے کہ ایک آدمی آیا اور عرض کیا کہ ماں باپ کے انتقال کے بعد بھی کیا کوئی عمل ایسا ہے جس کے ذریعے میں ان کے ساتھ حسن سلوک کرسکتا ہوں؟ تو اللہ کے رسول ﷺ نے کہا ہاں بالکل ہے اور پھر فرمایا:

اَلصَّلاۃُ عَلَیْھِمَا، وَالِاسْتِغْفَارُ لَھُمَا، وَاِنْفَاذُ عَھْدِھِمَا مِنْ بَعْدِھِمَا، وَصِلَۃُ الرَّحِمِ الَّتِیْ لَا تُوْصَلُ اِلّا بِھِمَا، وَاِکْرَامُ صَدِیْقِھِمَا۔

ان کے لیے رحمت کی دعا کرنا۔ ان کے لیے مغفرت کی دعا کرنا۔ ان کے بعد ان کی وصیت نافذ کرنا۔ ان رشتوں کو نبھانا جو صرف ماں باپ کے تعلق کی وجہ سے ہوں۔ ان کے دوستوں کا اکرام کرنا (یعنی والدین سے ملنے جلنے والوں کے ساتھ تعلقات بنائے رکھنا اور ان کی تکریم کرنا)۔ (ابوداود)۔

متفرق احساسات

ذیل میں چند اہم شخصیات اور اداروں کی جانب سے موصول ہونے والے تاثرات پیش کیے جارہے ہیں، مولانا مرحوم کے سانحہ ارتحال پر دنیا بھر میں لوگوں نے مضامین، سوشل میڈیا پوسٹس اور تعزیتی نشستوں میں اپنے احساسات کا اظہار کیا تھا، یقیناً جملہ احساسات وتاثرات کو جمع کرنا ممکن نہیں تھا، اور نہ یہ کتاب اس کی متحمل تھی، ذیل میں بطور نمونہ کچھ احساسات پیش کیے جارہے ہیں۔ **(مرتب)**

آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا اظہارِ تعزیت

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے سکریٹری حضرت مولانا محمد عمرین محفوظ رحمانی صاحب نے آج ایک تعزیتی بیان میں یہ کہا کہ گزشتہ کل حضرت مولانا سراج الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اللہ کو پیارے ہوگئے، وہ صاحب نظر عالم دین، کامیاب منتظم اور اچھے مقرر تھے۔ تیرہ سال تک جماعت اسلامی کے باوقار امیر کی حیثیت سے انہوں نے بڑی اہم خدمات انجام دی ہیں۔ اللہ کے فضل وکرم سے انہوں نے طویل عمر پائی، حدیث شریف میں آیا ہے کہ جس شخص کی عمر لمبی ہو اور عمل اچھا ہو وہ خوش نصیب انسان ہے۔ اس حدیث کے پیش نظر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مولانا سراج الحسن مرحوم بڑے خوش قسمت انسان تھے، انہوں نے اصلاح امت اور اقامت دین کی خاطر اپنی زندگی کے شب وروز وقف کردیے تھے، آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ سے بھی ان کا بڑا گہرا تعلق رہا ہے۔ پہلے رکن بورڈ اور پھر نائب صدر کی حیثیت سے انہوں نے بورڈ کی سرگرمیوں میں حصہ لیا اور جب جس طرح کی ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی انہوں نے بحسن و خوبی اسے نبھایا۔ ان کی رحلت سے نہ صرف جماعت اسلامی بلکہ خود آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ ایک فعال مستعد اور مخلص کارکن سے محروم ہوگیا، مولانا مرحوم حسن عمل کا توشہ لے کر رب

کریم کی بارگاہ میں جاچکے۔امید ہے کہ وہ وہاں روح وریحان اور جنت کی نعمتوں سے سرفراز کیے جائیں گے۔آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ ان کی رحلت پر اپنے گہرے غم کا اظہار کرتا ہے اور ان کے اہل خانہ اور متعلقین کی خدمت میں تعزیت مسنونہ پیش کرتا ہے۔ دعا ہے کہ رب کریم ان کی مغفرت فرمائے، ان کو درجات بلند نصیب فرمائے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل نصیب فرمائے۔

مولانا سید جلال الدین عمری، سابق امیر جماعت

مولانا سراج الحسن سابق امیر جماعت اسلامی ہند کل سہ پہر ہم سب سے جدا ہوگئے۔ اللہ تعالی ان کی مغفرت فرمائے اور ان کی خدمات کو قبول کرے۔وہ تین میقات تک جماعت اسلامی کے امیر رہے۔ان کی امارت کے زمانے میں جماعت اسلامی پر ایک مرتبہ پابندی لگی۔ان تمام حالات میں انہوں نے بڑی صبر و ہمت اور حوصلے کے ساتھ جماعت کی قیادت کی۔جماعت اسلامی کے امیر منتخب ہونے کے بعد سے اپنے پورے دور امارت میں انہوں نے مجھے نائب امیر مقرر کیا اور اس دوران مجھے ان سے قریب ہونے، فائدہ اٹھانے، اور ان کے ساتھ کام کرنے کا اللہ تعالی نے موقع دیا۔وہ بہت ہی شریف اور نیک انسان تھے اور ہر ایک کے دکھ درد میں ان کے کام آتے۔تحریک اسلامی کے لیے اپنی آسائش کی قربانی دی۔وہ بہت خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، لیکن تحریک کے لیے انھوں نے ہر طرح کی تکلیف برداشت کی۔اللہ تعالی قبول کرے اور ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔

جناب محمد جعفر صاحب، نائب امیر جماعت اسلامی ہند

اللہ تعالی محترم مولانا سراج الحسن صاحب سابق امیر جماعت اسلامی ہند کی مغفرت فرمائے، اُن کی حسنات کو قبول فرمائے، اُن کے اعلی اخلاق، سب کے ساتھ مشفقانہ سلوک، تحریک کے لیے اُن کی بے پناہ جدوجہد اور غیر معمولی قربانیوں کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ افسوس کہ اس غم کے موقع پر ہم اُن کی تدفین میں شرکت سے محروم و مجبور ہیں اور بچوں و دیگر

پسماندگان کے رنج والم کو بانٹنے کے لیے پہنچ نہیں سکتے۔اس بات نے ہمارے صدمے کو دوبالا کر دیا ہے۔اللہ اُن سے راضی ہو۔ جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا فرمائے اور تمام پسماندگان کو جن میں ہم سب شامل ہیں،صبر جمیل سے نوازے اور تحریک کو اُن کا نعم البدل عطا کرے،آمین۔

صلاح الدین شبیر خان،رکن شوری جماعت اسلامی ہند،حلقہ بہار

مولانا سراج الحسن علیہ الرحمۃ جماعت کی جنریشنل تبدیلی کا دوسرا استون تھے۔بے شک، ایک بار بھی جو ملا گرویدہ ہوگیا۔جس سے ملتے پورے وجود اور قلب کی تپش کے ساتھ ملتے اور ملنے والا ہمیشہ اس گرم جوشی کو یاد رکھتا۔اپنی ظاہری وجاہت اور خوئے دلنوازی سے ہر خاص و عام کو متأثر کرتے۔شائد ہی کوئی ہو جس نے مولانا سے ملاقات کے بعد ان کے انداز ملاقات کا تذکرہ اپنے ہم جلیسوں سے نہ کیا ہو۔ جماعت کی جنریشنل تبدیلی کے دوسرے پائیدان پر مولانا سراج الحسن علیہ الرحمۃ براجمان ہوئے اور تیسری پر موجودہ امیر جماعت۔عموماً کرناٹک کے رفقاء میں والہانہ انداز ملاقات کا مشاہدہ ایس آئی او کے زمانے سے کرتا رہا۔مولانا سے ملنے پر اندازہ ہوا کہ شائد اس بے ساختگی اور وارفتگی کا ایک اہم سرچشمہ مولانا کی ذات گرامی تھی۔ہم لوگوں کا تاثر یہ ہے کہ جس طرح بہار میں ڈاکٹر ضیاء الہدی علیہ الرحمۃ صرف امیر حلقہ نہیں بلکہ رفقاء کے پیر تھے،اسی طرح مولانا سراج الحسن مرحوم کرناٹک کے پیر تھے۔مولانا کے دور امارت میں برادران وطن سے تعلق کی دعوتی جہت کو وسعت ملی اور پورے ملک سے کارکنوں کی نئی ٹیم کو بڑے پیمانے پر مرکزی ذمہ داریاں تفویض کی گئیں۔

دھیرے دھیرے بجھے سب پرانے چراغ
اب نئے کچھ چراغوں کو روشن کرو

اللہ تعالی مولانا کے حسنات قبول فرمائے،کوتاہیوں سے درگزر کرے اور جنت الفردوس میں اعلی مقام پر براجمان کرے۔اے بار الہا! ہم تو بہت کوتاہ کار اور سست رو ہیں،بس تو اپنے فضل سے ہمیں بھی سرگرم کار و صالح رفقاء کے ساتھ جنت کی ہم نشینی عطا فرما۔

محمد خالد لکھنوی، سماجی کارکن

1982 میں مجھے یہ موقع حاصل ہوا کہ میں جنوبی ہند کی چاروں زبانوں میں اسلامی کتابوں کے ترجمہ اور اشاعت کا کام کراؤں۔اس کام کے لیے مرکزی دفتر مدراس میں قائم کیا گیا تھا۔کنڑ زبان میں مترجم کی تلاش کے لیے بنگلور جانا ہوا تو سیدھا دفتر حلقہ کرناٹک پہنچا جو اس وقت بنگلور سٹی کے ایک کامرشیل کمپلیکس میں تھا۔دفتر پہنچنے پر معلوم ہوا کہ محترم امیر حلقہ دورہ پر ہیں اور کئی روز کے بعد واپس ہوں گے تو مجھے پریشانی ہوئی کہ اب کیا کیا جائے، محترم سکریٹری عبدالمجید صاحب نے بغیر کچھ کہے میری پریشانی کو محسوس کیا اور کہا کہ آپ کچھ دیر آرام کریں، میں کچھ نظم کرتا ہوں۔وہ ٹیلی فون کا زمانہ تھا اور وہ بھی آسانی سے میسر نہیں تھا مگر کچھ دیر کے بعد مجھے بتایا گیا کہ مولانا صاحب سے بات ہوگئی ہے اور آپ کو رات کی بس سے فلاں شہر جانا ہے۔میں نے اس شہر پہنچ کر مطلوبہ مقام کا رکشہ کیا اور جب اس مقام پر پہنچا تو ایک بہت شاندار مکان کے گیٹ پر چند لوگ کھڑے تھے، مجھ سے سوال کیا کہ کیا آپ کا نام خالد ہے، میں نے کہا: جی ہاں، تو کہا کہ آیئے محترم امیر حلقہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔میں مکان کی راہداری میں داخل ہوا تو مولانا اپنے انداز میں دوڑتے ہوئے آئے اور میرے گلے لگ گئے اور انتہائی خاموشی سے کہا کہ آپ اپنی ضروریات سے فارغ ہو جائیں تو پھر ہم لوگ ناشتہ کر کے یہاں سے روانہ ہو جائیں گے اور پھر راستے میں بات ہوگی۔یہ تھی میری مولانا سے پہلی ملاقات، اس سے پہلے نہ ہم لوگ ایک دوسرے سے واقف تھے اور نہ ہی چہرہ شناس مگر مولانا نے وہاں موجود لوگوں پر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ ہم لوگ ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔پھر مولانا نے دو روز مجھے اپنے ساتھ سفر میں رکھا اور جہاں بھی ٹیلی فون کی سہولت ملی وہ میرے لیے لوگوں کو فون کرتے رہے۔ان کا دورہ جاری رہنا تھا اور میری ضرورت پوری ہو چکی تھی تو میں نے واپسی کے لیے کہا تو مولانا نے سوال کیا کہ شاید یہ آپ کا کرناٹک کا پہلا سفر ہے، میں نے کہا جی ہاں تو بولے کہ آپ بنگلور جانے سے پہلے میسور جائیں، وہاں کے اسٹیٹ آفیسر ایک رکن جماعت ہیں، میں ان کو فون کر کے بتا دوں گا اور آپ میسور کے تاریخی مقامات کو دیکھ کر واپس جائیں۔مولانا کی ہدایت کے مطابق میں میسور گیا اور پھر واپسی ہوئی۔مولانا نے

مترجمین کے ساتھ ہی کتابوں کی طباعت کا نظم منگلور میں جماعت کے پریس میں کرا دیا تھا۔ اس کام کی وجہ سے ہر کچھ دن کے بعد بنگلور جانا ہوتا تھا اور وہاں جماعت کے کام کو بھی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ مولانا کی ایک نمایاں بات یہ دیکھی کہ اگر کوئی ملّی مسئلہ ہے تو اس کے حل کے لیے ملت کے سبھی قائدین مولانا کو آگے رکھ رہے ہیں اور اگر ملکی یا سماجی مسئلہ ہے تو ہر مذہب کے لوگ آپ کے ساتھ ہیں۔

جلد ہی امیر جماعت مولانا ابواللیث صاحب نے مولانا کو مرکز بلا لیا تھا اور ملک کے کئی حلقوں میں ان کو جماعت کی کارکردگی کا جائزہ لینے کی ذمہ داری دی تھی جس میں تمل ناڈو بھی شامل تھا۔ اس وقت مولانا نے دفتر حلقہ تمل ناڈو میں متعلقین جماعت کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہماری جماعت میں اب بہت سے کام حکمت اور مصلحت کے نام پر چھوڑ دیے جاتے ہیں جو کہ کسی بھی لحاظ سے درست نہیں ہے اور پھر حکمت کی مثال پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس کو فوج کے طریقہ کار سے سمجھئے کہ حالت جنگ میں جب مخالف فوج کا حملہ تیز ہو جاتا ہے تو فوج پیچھے بھاگنے کے بجائے زمین پر لیٹ جاتی ہے اور دشمن کے حملے سے خود کو بچاتے ہوئے گھنٹوں کے بل اپنی پیش قدمی جاری رکھتی ہے تاوقتیکہ وہ حالات پر اپنی گرفت مضبوط کر لے۔

مولانا پھر امیر جماعت کے منصب پر فائز ہوئے، پورے ملک کی جماعت کے معاملات کی ذمہ داری کو ادا کرنے کے ساتھ ساتھ ہر ایک کے ساتھ انتہائی خلوص اور محبت کے ساتھ پیش آنا، ذاتی معاملات سے واقف رہنا اور مفید مشوروں سے نوازنا ان کا خاصہ تھا۔ ان کو کبھی پریشان ہوتے نہیں دیکھا، کبھی ان کی زندگی میں مایوسی کی کوئی بات نظر نہیں آئی۔ ہنستے مسکراتے ہوئے ملنا اور بات ہی بات میں جماعتی اور دینی ذمہ داری کا احساس کرا دینا آپ کی عادت میں شامل تھا۔

اللہ رب العزت ان کی مغفرت فرمائے، درجات کو بلند کرے۔ آپ کے کار خیر کا بہترین صلہ عطا فرمائے اور ایک بہترین دینی قائد کے کارہائے نمایاں کی برکت سے جماعت اسلامی ہند کو بھی سرفراز کرے، آمین۔

بیانات، خطابات

اور انٹرویوز

اس کتاب کا یہ دوسرا حصہ ہے، اس حصے میں مولانا مرحوم کے دو بیانات، چند خطاب اور چند انٹرویوز بطور نمونہ پیش کیے گئے ہیں۔ افسوس کہ مولانا کے بیانات، خطابات اور انٹرویوز کا ایک بڑا حصہ محفوظ نہیں رہ سکا۔ توفیق الٰہی شامل حال رہی تو دستیاب چیزوں کو ایک جگہ جمع اور مرتب کرنے کی کوشش کی جائے۔ **(مرتب)**

ملک کا موجودہ نظام اور تحریک اقامت دین

ہندوستان میں اقامت دین کے فریضہ کی ادائیگی کے سلسلہ میں میرا ذہن بالکل صاف ہے۔ اقامت دین کی منزل ہماری نگاہوں کا مرکز اور ہماری فکر و عمل کا مقصود اور محور ہے۔ ہماری ساری سعی و جہد اسی سمت میں پیش قدمی اور اسی منزل کو پالینے کے مقصد سے ہے اور ہونی بھی چاہیے۔

جب ہم اس خصوص میں اپنے لیے راہ کے تعین کے سلسلہ میں سوچ بچار کرنے بیٹھتے ہیں، اپنے گرد و پیش کے حالات، ملک کا موجودہ سیاسی، سماجی اور تنظیمی ڈھانچہ، ملک کے اندر کارفرما قوتیں اور عناصر، یہاں کے عام باشندوں کے حالات، افکار، مزاج اور ان کی تاریخ اور نفسیات، مسلمانوں کی پچھلی کئی سو سالہ تاریخ اور ان کی موجودہ کیفیت، مقام اور موقف اور پھر سب سے آخر میں خود تحریک اسلامی کی اس کی اپنی تشکیل سے اب تک کی تاریخ، اس کا طے شدہ سفر، انجام پائے ہوئے کام اور وہ موڑ اور مراحل جن سے وہ گزر کر آئی ہے اور آج کا اس کا موقف، نیز اس کے پاس کے موجودہ مسائل (افرادی قوت اور مادی ذرائع) اور اس کی اپنی طاقت و قوت وغیرہ جیسے امور پر بھی ہر پہلو سے غور کرنا پڑتا ہے، تاکہ اختیار کی جانے والی راہ نہ صرف یہ کہ حقیقت پسندانہ، قابل عمل اور قابل فہم ہو بلکہ اپنے مقصد کی سمت میں آگے بڑھانے والی بھی ہو۔ آگے بڑھنے سے پہلے یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ ہماری منزل بہت زیادہ دور نہیں ہے تو بھی اتنی دور ضرور ہے کہ آئندہ پچاس سال تک تو ہمیں اس کو پالینے کے خیال سے دست بردار ہو کر مسلسل جدو جہد کرتے رہنے کا عزم کر لینا چاہیے، نیز اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ ہماری آئندہ کی جدو جہد بھی اسی وقت موثر اور نتیجہ خیز بن سکتی ہے جبکہ وہ تصوراتی سے زیادہ عملی، حالات اور مسائل سے بے نیاز ہو کر گزرنے کے بجائے ان سے تعلق

پیدا کر کے بلکہ ان سے تعرض کرتے ہوئے اور ایک عملی طاقت بن کر فکر انگیز اور پر کشش پروگرام کے ساتھ رہنمایانہ انداز میں اقدامی شان کے ساتھ آگے بڑھے۔

اوپر کی دو باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں اس انداز میں سوچنے اور آگے بڑھنے کے لیے راہ متعین کرنی چاہیے کہ ہم تحریک اقامت دین کے داعی اور علمبردار ہیں اور ہمارے ملک کے اندر پائے جانے والے ساٹھ کروڑ انسانوں کو ہر جہت اور ہر سمت سے، ہر رخ اور ہر زاویے سے دھکیل کر اقامت دین کی منزل کی طرف لے جانا ہے تاکہ اللہ کا دین:

☆افراد انسانی کی انفرادی زندگی کا دین بھی بن جائے۔اور

☆معاشرے کی اساس بن کر اس کی تشکیل کرتے ہوئے معاشرے کا بھی دین بن جائے۔

اس کے لیے ضروری ہوگا کہ ہم کھلے ذہن، کھلی نگاہ اور کھلے دل کے ساتھ کتاب وسنت کی روشنی میں تعلیمی، معاشی، معاشرتی، تمدنی وتہذیبی اور سیاسی ہر رخ سے ہندوستانی زندگی میں نفوذ کرتے چلے جائیں اور ہر شعبۂ زندگی میں اور بحیثیت مجموعی پوری زندگی میں اصل مقصود تک پہنچانے والے قریبی اور نظر آنے والے نشانے سامنے رکھ کر جدو جہد کریں۔الفاظ اور حروف اور اصطلاحات کے لیے حقائق اور حقیقتوں اور معانی ومقصود پر نگاہ جمائے رکھیں۔

جہاں تک ملک کے اندر پائے جانے والے نظام کا تعلق ہے وہ غیر اسلامی ہے، خلاف حق ہے اور باطل ہے۔لیکن اس کا رویہ دوستانہ نہیں تو ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ آپ کے کام کے لیے روک یا سدّ سکندری بنا ہوا ہو۔اس لیے اس کے ساتھ ہمارا رویہ ''تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان'' کے اصول پر ہونا چاہیے۔اور عدل، حکمت اور مقصدیت کی روح اس میں رچی بسی ہونی چاہیے اور بس۔ان شاء اللہ آپ دیکھیں گے کہ ہم ایک زندہ طاقت اور زندگی بخش قوت کی حیثیت سے یہاں کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہوئے اور اس کو متاثر کرتے ہوئے اپنے مقصود کی طرف اسے کھینچ لے جانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔اس مختصر سی تحریر میں صرف اشارات ہی کیے جاسکتے ہیں۔خدا کرے بات واضح اور ہو جائے اور ہم یکسو ہو کر اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہو جائیں۔ (ماخوذ از کتاب ''جماعت اسلامی کے ستائیس سال'')

افغانستان پر امریکی جارحیت

اس وقت امریکہ افغانستان پر اپنی پوری طاقت سے حملہ آور ہے۔ اس کے کیا مقاصد ہیں؟ اس پر مختلف انداز سے لوگ اظہارِ خیال کررہے ہیں۔ بہرحال اختلاف انسان کی فطرت بھی ہے اور اس کا حق بھی۔ مگر چند بنیادی باتیں ہیں، جن کی طرف توجہ کرنی ہوگی۔

صد افسوس کہ نئی مسیحی صدی کا آغاز ایک خوفناک جنگ سے ہورہا ہے۔ گزشتہ صدی کے خاتمے پر سب قیاس آرائیاں کررہے تھے کہ آنے والی صدی کیسی ہوگی اور اس میں انسان کے مستقبل کے روشن ہونے کے کتنے امکانات ہیں۔ یادش بخیر موجودہ صدر امریکہ جارج بش کے والد محترم جب دس سال پہلے امریکہ کے تختِ حکمرانی پر متمکن تھے تو انھوں نے ایک نئے عالمی نظام کا نعرہ دیا تھا۔ نئی صدی کے لیے انھوں نے جو خواب دیکھا تھا شاید یہی خواب ان کے صاحب زادے کی کوششوں سے شرمندہ تعبیر ہورہا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ نئے عالمی نظام کا محور و مرکز امریکہ ہوگا۔ دنیا وہ کرے گی جو امریکہ چاہے گا، وہی دیکھے گی جو امریکہ دکھائے گا اور وہی سنے گی جو امریکہ سنائے گا۔ ظاہر ہے کہ پوری دنیا کو اپنی گرفت میں لینے اور اپنے مخصوص سانچے میں ڈھالنے کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ ہر جگہ اس کی فوجیں اور اس کے آدمی موجود ہوں۔ ان کا تصور یہ تھا کہ وہ اپنے ملک میں رہتے ہوئے تمام ملکوں کے چودھری بن جائیں گے۔ اس وقت اشتراکیت کی قوت اور روس کے استبداد کے بکھر جانے کے بعد اب کوئی اور سپر پاور نہ تھا، جو امریکہ کی راہ میں حائل ہوتا۔

کسی زمانے میں یہ مشہور مقولہ ایجاد ہوا تھا کہ ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔'' تاریخ کے مختلف ادوار میں اس پر لوگ عمل کرتے رہے ہیں اور اسے سچ ثابت کرتے رہے ہیں۔ اب اس کی گواہی دینے کی ذمہ داری امریکہ نے سنبھال لی ہے کہ جس کے پاس طاقت ہوگی صرف اسی

مولانا محمد سراج الحسن

کی بات چلے گی۔ حیرت کا مقام ہے کہ اسی طاقت کے کرشمے سے ؎

جو تھا نا خوب بتدریج وہی خوب ہوا

آج کی مہذب دنیا میں جہاں مجلس اقوام متحدہ بھی ہے، انصاف کی عالمی عدالتیں بھی ہیں، مساوات اور حقوق انسانی پر زبردست بحثیں ہو رہی ہیں اور بال کی کھال نکالی جا رہی ہے، اسی دنیا میں اندھا دھند بے قصور انسانوں پر بمباری ہو رہی ہے اور سب اس طرح تماشائی بنے ہوئے ہیں، جیسے کرکٹ کا کوئی میچ ہو رہا ہو۔

آپ نے 11/ستمبر کو یہ خبر سنی کہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر نیویارک کی عمارت پر حملہ ہوا اور پھر واشنگٹن کے اس فوجی مرکز کی عمارت پر بھی حملہ ہوا جس کے بارے میں دنیا کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ نعوذ باللہ پنٹاگن ہی درحقیقت سمیع و بصیر، علیم و خبیر اور حاضر و ناظر وجود ہے، جس کی گرفت سے دنیا کا کوئی حصہ اور کوئی شخص باہر نہیں۔ عجیب بات ہے کہ اس قدر بھیانک اور منصوبہ بند حملے کی بھنک تک پنٹاگن کو نہ لگی۔ اس راز داری، اس اعلیٰ درجہ کی تکنیکی مہارت اور فنی اہلیت کا ثبوت پیش کیا گیا کہ دنیا حیرت میں پڑ گئی۔ یہ کن لوگوں کا کام ہے اور حقیقتاً کون لوگ اس میں ملوث تھے اس کی زیادہ کھود کرید امریکہ شاید اپنی مصلحتوں اور مجبوریوں کی وجہ سے نہ کر سکا۔ اتنی منظّم راز داری، اس قدر وسائل و ذرائع کے ساتھ کون توڑ پھوڑ کر سکتا ہے اس کا پتہ شاید امریکہ چلانا بھی نہیں چاہتا۔ علامہ اقبال نے تقریباً پون صدی قبل مغرب کی سب سے بڑی کمزوری کی طرف اشارہ کیا تھا ؎

فرنگ کی رگ جاں پنجۂ یہود میں ہے

دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ ہر بڑا فتنہ اور ہر بڑی سازش کا محور یہودی رہے ہیں۔ دنیا کی ہر بڑی شکست و ریخت میں اس قوم کو ملوث پایا گیا ہے۔ مگر یہ اپنا جرم دوسروں کے سر منڈھنے کے آرٹ میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ آنے والے وقت میں امید ہے کہ حقائق بے نقاب ہوں گے اور وہ چھپ کر نہ رہ سکیں گے اور پھر اس عالمی تاریخ کو زیروزبر کرنے والے حادثہ کے اصل ملزم کھل کر سامنے آجائیں گے۔ یہ سچ ہے کہ اس وقت پروپگنڈے کا غبار ہر طرف چھایا ہوا ہے، لیکن حقیقت کا آفتاب عالم تاب یقیناً طلوع ہوگا۔ اس وقت عالم یہ ہے کہ سازش

کرنے والے سازش کرتے ہیں اور سازش کے لیے جن کو استعمال کرتے ہیں ان کو بھی پتا نہیں چلتا کہ ہم استعمال ہو رہے ہیں۔ کبھی دیوانگی کبھی شخصی عزائم اور کبھی کسی گہری چوٹ کا انتقام اس طرح کے استعمال ہونے والوں کا محرک بن جاتا ہے۔ ظاہر ہے جن کے چہرے سامنے ہوتے ہیں وہی ذمہ دار قرار دیے جاتے ہیں اور سارا الزام انہی کے سر جاتا ہے۔ کچھ اسی طرح کی کیفیت اس واقعہ کے ساتھ پیدا ہوئی ہے کہ اصل مجرم پردہ کے پیچھے رہے اور دنیا دوسروں کو ملامت کرنے کے لیے مجبور کردی گئی ہے۔

مجھے یاد آتا ہے کہ آج سے تقریباً ربع صدی پہلے جب ہم پندرہویں صدی ہجری کا استقبال کرر ہے تھے تو اس یقین سے سرشار تھے کہ آنے والی صدی اسلام کی صدی ہوگی اور اسلام کا ابر رحمت صدیوں سے دبی کچلی مظلوم انسانیت پر ان شاء اللہ برسے گا۔ آج بھی اسی یقین کا چراغ ہمارے دلوں میں روشن ہے کہ اسلام بہت جلد ایک ابر رحمت بن کر ساری دنیا پر چھا جائے گا۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس وقت قیادت کس کے ہاتھ میں ہوگی؟ مشرق کے یا مغرب کے؟ تاریخ میں ایسا بارہا ہوا ہے کہ خود اسلام کے دشمن ہی اسلام کے علمبردار بن کر دنیا میں ابھرے ہیں۔ شاید اکیسویں صدی کے اس ہوش ربا دور میں بھی مشیت انہی قوموں سے اسلام کی پرچم کشائی کا کام لے گی، جو آج اس کے خون کے پیاسے ہیں اور شاید مغرب میں امریکہ اور مشرق میں جاپان ہی کو یہ شرف حاصل ہوگا کہ وہ دنیا کے بازاروں پر قبضہ کرنے کے بجائے مظلوم انسانوں کے دلوں کو اسلام کے پیامِ رحمت کے ذریعے جیتنے کے لیے منظر عام پر آئیں۔

شاید امریکی قوم کے اندر کچھ ایسی خوبیاں ہیں جو ساری خرابیوں کے باوجود وہاں کے عوام کے بارے میں اچھی توقعات رکھنے پر ہمیں آمادہ کرتی ہیں۔ اس قوم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ آزادیِ فکر و عمل کی قدر شناس ہے اور کھلے ذہن سے ہر معقول بات قبول کرنے پر آمادہ ہوتی ہے۔ اپنی بات کو پیش کرنے، دوسروں کی سننے اور انسان کے شخصی احترام کی قائل ہے۔ یہ سچ ہے کہ ان کا میڈیا، ان کے سیاستداں اور اوپر کے چالاک لوگ اپنے وسائل و ذرائع سے کام لے کر ایک خاص انداز سے سوچنے اور ایک خاص طرزِ عمل کو اختیار کرنے پر عوام کو مجبور کردیتے ہیں۔ لیکن عوام کی یہ صلاحیت سیاستدانوں کی روش سے متاثر نہیں ہوتی ہے۔ دوسری

خوبی یہ ہے کہ اپنی بے پناہ مادیت پرستی کے باوجود انسانی ہمدردی اور انسان کی خیر خواہی اور مدد کا جذبہ ان کے اندر دوسروں سے کہیں زیادہ پایا جاتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ہزار ناسازگار حالات کے باوجود ذہن وکردار کی یہ غیر معمولی خوبی اس قوم کے اندر کس طرح پیدا ہوئی۔ اس صلاحیت سے یہ امید قائم ہوتی ہے کہ یہ قوم اپنے سیاستدانوں سے الگ ہٹ کر صداقت حق اور خیر کو قبول کرتی جائے گی اور ایک صالح انقلاب کی قیادت کے لیے خود قدم اٹھائے گی۔ افغانستان پر آگ، بارود اور گولیوں کی بارش کرنے والے ہاتھ امید ہے شل ہوں گے۔ دنیا میں ظلم وزیادتی کی آندھیاں رکیں گی اور ان کے عزائم ناکام ہوں گے، جو اسلام کے چشمۂ صافی کو زہر آلود ثابت کرنے کی کوششیں کررہے ہیں۔

(تشدد: اسباب ومحرکات، شائع کردہ: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی)

تحریک اسلامی کے تقاضے

متفقین جماعت سے خطاب ، مورخہ 9نومبر 1974ء

حمد وصلوٰۃ کے بعد!

اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر واحسان ہے کہ اس نے ہمیں اور آپ کو جماعت اسلامی ہند کے کل ہند اجتماع میں شرکت کا موقع عنایت فرمایا۔ ہم اس بات پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر بجالاتے ہیں کہ اس دور میں ہمیں اور آپ کو اپنے دین کا شعور اور اس کی اقامت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنانے کی توفیق عطا فرمائی جبکہ آج یا تو انسان بے مقصد زندگی گزار رہے ہیں، یا غلط مقاصد کے لیے گزار رہے ہیں۔ زندگیاں بہرحال گزر رہی ہیں، غلط مقاصد کے لیے بھی اور بے مقصد بھی۔ اللہ کی نعمتوں میں سے یہ سب سے بڑی نعمت ہے جو کسی بندے پر اگر ہو اور اس شکل میں ہو کہ اسے زندگی کا صحیح شعور حاصل ہو جائے اور اپنی زندگی کے مقام اور اس کے مقصد کو پہچان لے اور اپنی زندگی کو صحیح مقصد کے لیے گزارنے کا عزم اور فیصلہ کرے۔ میرے نزدیک اس سے بڑی کوئی نعمت نہیں ہے۔ اللہ کے بے انتہا انعامات میں سے یہ سب سے بڑی نعمت ہے۔

یہ اجتماع جو تحریک اسلامی ہند کے متفقین کا اجتماع ہے، اس میں اس اجتماع کی مناسبت سے عنوان ہی یہ رکھا گیا ہے کہ تحریک اسلامی کے ان تقاضوں کو متفقین پر واضح کیا جائے جو تحریک اسلامی اپنے متفقین سے کرتی ہے۔ اس سے پہلے کہ آپ ان تقاضوں کے سلسلے میں سوچ بچار کریں اور تقاضوں کے سلسلے میں کچھ باتیں آپ کے سامنے لائی جائیں۔ میں نہایت اختصار کے ساتھ یہ بات عرض کرنا چاہتا ہوں اور عرض کرنا چاہوں گا کہ ہم سب سے پہلے اس بات کو سمجھ لیں کہ تحریک اسلامی کیا ہے؟

تحریک اسلامی کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسلام سے متعلق ہمارا ذہن صاف ہو، آپ اچھی طرح سمجھ لیں اور جان لیں کہ اسلام ہے کیا؟ اسلام اللہ تعالیٰ کا دین ہے۔ یہ ہم اور آپ اچھی طرح جانتے ہیں، اور یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ پوری انسانیت کے لیے آیا ہوا دین ہے، اور یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ ایک مکمل دین ہے اور یہ بھی کہ وہ دنیا و آخرت کی فلاح کا ضامن ہے اور اس کی بشارت بھی دیتا ہے۔ اس کے سوا کوئی راہ فلاح و کامرانی کی انسانیت کے لیے ہے ہی نہیں۔

ہمیں اس بات پر یقین ہے اور ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اسلام عام معنوں میں ایسا دھرم نہیں ہے جو خدا اور بندے سے متعلق کچھ بحث کرتا ہو یا خدا اور بندے کے تعلق سے کچھ گفتگو کرتا ہو یا کچھ وعظ اور نصیحت کرتا ہو اور یہ کہ یہ ایسی تحریک خیر و فلاح ہے جو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوئی اور سرورِ کائنات حضرت محمد ﷺ پر ختم ہوئی، اور یہ کہ یہ ایسی تحریک ہے جو اس زمین پر پہلے انسان کے ساتھ شروع ہوئی اور جب تک انسان اس کائنات میں زندہ اور باقی ہے اس وقت تک یہ تحریک قائم اور باقی رہے گی، یہ ایسی خیر و فلاح کی تحریک ہے جو اس دنیا کے اندر بھلائی کو، دین کو قائم کر کے شیطنیت کو، ابلیسیت کو، ظلمت کو، باطل کو مٹا کر حق کو قائم کرنے کے لیے چلائی گئی ہے، جو چلتی رہی ہے اور ان شاء اللہ چلتی رہے گی تا کہ دنیا کے اندر سے ہر طرح کے عدم توازن، ہر طرح کے استحصال اور ہر طرح کے جبر و ظلم اور ہر طرح کی بدی اور ہر طرح کے منکرات کا خاتمہ ہو۔

اسلامی تحریک ایک انقلابی اور ایک زبردست اور طاقتور تحریک کا نام ہے جو حضرت آدمؑ سے شروع ہوتی ہے اور حضرت محمد ﷺ پر ختم ہوتی ہے۔

یہ بات اچھی طرح ہمارے ذہنوں میں رہنی چاہیے کہ اسلام کیا ہے اور تحریک اسلامی کیا ہے؟ اسلام اگر خدا کے آگے جھک جانے اور اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر دینے، اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دینے، اس کی بندگی اختیار کرنے، اس کی اتباع کو تسلیم کرنے اور اپنے آپ کو تفویض کرنے کا نام ہے تو تحریک اسلامی بھی اسی کا نام ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس تحریک کو چلایا جائے اور خدا کے بندوں کو خدا کی بندگی کی دعوت دی جائے اور ایسا ماحول اور

ایسی فضا پیدا کر دی جائے کہ خدا کے بندے خدا کے سوا کسی اور کے بندے نہ رہیں۔ بندگی صرف خدا کی ہو، بندے صرف خدا کے بندے ہوں۔ اس دنیا کے اندر، اس آسمان کے نیچے اور اس زمین کے اوپر خدا کے سوا کوئی پوجا نہ جائے۔ کسی کی اطاعت نہ ہو اور وہ عادلانہ نظام حق قائم ہو سکے جو اسی لیے بھیجا گیا ہے کہ وہ قائم ہو اور قائم کیا جائے اور دنیا سے بدی اور منکرات کو مٹایا جائے۔ یہ ہے تحریک اسلامی جس سے ہم اور آپ وابستہ ہیں۔ اس تحریک کی تاریخ پر اگر ہم غور کریں تو یہ بات ہمارے سامنے آئے گی کہ اسلام جو چند ابدی اور ازلی اصولوں کا نام ہے جس کو خدا نے انسانوں کی ہدایت کے لیے بھیجا تھا، خدا کے اس دین نے انسانی زندگی کے اندر انسانی تاریخ میں ہمیشہ سے رہنمائی کا، اور زندگی کے گیسو سنوارنے کا کام کیا ہے۔ وہ زندگی کا ساتھ دینے اور ساتھ ساتھ چلنے کے لیے نہیں آیا بلکہ اس لیے آیا کہ زندگی پر اپنا آب و رنگ چڑھائے اور زندگی کو اپنے نقشہ کے مطابق ڈھالے، زندگی کو اپنے اصولوں پر استوار کرے، زندگی کو اپنی منزل کی طرف چلائے، زندگی کو صحیح راہ پر ڈالے اور اسے بھٹکنے نہ دے اور حق وصداقت کی صراطِ مستقیم پر چلائے۔ اسلام اور تحریک اسلامی ان ہی ابدی اور ازلی اصولوں کو لے کر چلنے والی ایک تحریک کا نام ہے۔ اسلام کے متعلق اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ وہ ایک مخصوص لباس کا نام ہے، کچھ مخصوص کاموں کا نام ہے، کچھ مخصوص اشغال واعمال کا نام ہے، کچھ مخصوص غذاؤں کا نام ہے، تو غلط سمجھتا ہے۔ اسلام کسی لباس، کسی وضع، کسی علاقے، کسی زبان کا نام نہیں ہے۔ وہ صرف چند ازلی اور ابدی اصولوں کا نام ہے۔ جن پر زمانے کی گردش اور اس کے تغیر کا کوئی اثر نہیں پڑتا اور اس کے حقائق اپنی جگہ سے نہیں ہٹتے بلکہ ہمیشہ سے اٹل ہیں اور اٹل رہیں گے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں:

حقائق ابدی پر اساس ہے اس کی
یہ زندگی ہے، نہیں ہے طلسم افلاطون

یہ طلسم افلاطون نہیں ہے۔ یہ زندگی اور اس کے حقائق ہیں اسلام کی بنیاد ان ابدی حقوق پر ہے جو قیامت تک قائم رہیں گے اور ان ہی اصولوں پر زندگی اور اس کا نظام چلتا رہے گا۔

دوستو! تاریخ کے مطالعے سے یہ بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ ایک دور وہ آیا اسلامی

تحریک کا جو حضرت آدمؑ سے شروع ہوا۔ آپ کے بعد انبیاء کرام علیہم السلام نے اس کے لیے انسانوں کو پکارا اس کی طرف دعوت دی، جب بھی انسانی قافلے راہِ حق سے بھٹکے انہیں راہِ ہدایت پر کھینچ لانے کی انھوں نے پھر کوشش کی، کبھی ان کی کوششیں اسی دنیا میں کامیاب ہوگئیں اور کبھی ایسا ہوا کہ ان کی یہ کوششیں جو دنیا کے اندر کی گئیں بظاہر اس کا کوئی نتیجہ نکلتا نظر نہیں آیا لیکن وہ اپنا کام پورا کر کے دنیا سے رخصت ہوگئے۔ وہ ہرگز ناکام نہیں ہیں۔ ان کی یہ کوششیں اور ان کی یہ جدوجہد رائیگاں نہیں گئی۔ ظاہر بیں نگاہوں نے یہ سمجھا کہ یہ تحریک فنا ہوگئی۔ نہیں، بلکہ انھوں نے جو بیج اپنی زندگی کے اندر ڈالے تھے، جو اعمال اور جو طریقے انھوں نے دنیا کے اندر چلائے تھے وہ ختم نہیں ہوئے، ان کے اثرات کبھی ان کی زندگی میں برآمد ہوئے ہیں تو کبھی برسوں بعد ان کے نتائج سامنے آئے ہیں۔ آج انسانیت کے پاس خیر وصلاح کا جتنا بھی سرمایہ ہے اور انسانی ضمیر بھلائی کو پسند کرنے کے جس جذبے سے مالا مال ہے۔ دنیا میں ایسا کوئی انسان نہیں جو کسی برائی کو برائی سمجھ کر اسے مانتا اور پسند کرتا ہو، کسی بھی بھلائی کو بھلائی سمجھ کر اس کا انکار کرتا ہو۔ انسانی ضمیر کو عقیدہ اور عمل کا جو ذخیرہ ملا ہے، اس کو جو روشنی ملی ہے اور اس کی جو تربیت ہوئی ہے وہ ان ہی انبیاء کرام کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ علم اور عمل کی جو روشنی بھی، خیر وصلاح کی جو روشنی بھی دنیا کے اندر یا اس کے کسی گوشے میں پائی جاتی ہے وہ ان ہی انبیاء کرام کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اور یہ بھی ہوا کہ کسی محدود گوشے کے اندر ان کو یہ موقع بھی مل گیا کہ زندگی کو اپنے اصولوں کے مطابق ڈھالیں، اپنی دعوت کے مطابق ڈھالیں، اپنے نصب العین کے رخ پر زندگی کو چلائیں اور جب وہ دور آیا جس کو سیدنا محمد ﷺ کا دور کہتے ہیں۔ اس دور میں تحریک اپنے نقطۂ عروج تک پہنچ گئی اس نے اپنے ارتقاء اور تکمیل کے آخری مراحل طے کئے۔ سرورِ کائنات حضرت محمد ﷺ کی رہنمائی میں جب یہ تحریک چلی تو 23 سال کی مختصر پیغمبرانہ زندگی کے اندر ایک بڑے علاقے میں وہ ذہنی، فکری، روحانی، اخلاقی اور عملی انقلاب برپا ہوا کہ دنیا دیکھ کر حیران رہ گئی۔ نیا ذہن، نئے افکار، نئے خیالات، نئی سیرت، نیا کردار، نیا انسان دنیا کے اندر پیدا کر دیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ایک ایسے گروہ کو انھوں نے اٹھایا اور ایک ایسی امت اٹھا کھڑی کر دی جو آپ کے بعد مسلسل اسی دعوت کو اسی تحریک کو اس کے اسی رخ کو پیش

کرتی رہے گی اور قیامت تک انسانیت کی رہنمائی کرتی رہے گی۔ آپ نے ایک امت اٹھا دی اور یہ ذمہ داری اس کو سونپ دی اور یہ کام اس کے سپرد کر دیا۔ یہ تحریک کے لیے نمونے کا دور تھا، جو سرورِ کائنات حضرت محمد ﷺ کی رہنمائی سے قائم ہوا۔ حضرات خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اسی تحریک کو آگے بڑھایا۔ اسی مشن کو آگے بڑھایا، اسی دعوت کو لے کر وہ پھیل گئے، سمندروں نے راستہ روکنا چاہا لیکن وہ ان کا راستہ روک نہ سکے۔ بحر روم کی موجوں نے اٹھ اٹھ کر ان سے کہا کہ تم آگے نہ بڑھو، لیکن بحر روم کے طوفانی اور مواج سمندر نے بھی، بحر اکاہل نے بھی اور بحر عرب کی موجوں نے بھی ان کا راستہ روکنے میں کامیابی حاصل نہ کی، وہ مسلسل سیلاب بن کر آگے بڑھتے چلے گئے، ایک ابر رحمت بن کر آگے بڑھتے چلے گئے اور جہاں گئے وہاں برسے، موسلا دھار بارش کی طرح برسے۔ ایسی برسات برسی کہ انسانیت کی کھیتی لہلہا اٹھی اور وہاں اخلاق پر، زندگی پر بہار آگئی۔ جبر وظلم کے صدیوں ہزاروں سال کے نقوش مٹ گئے اور حق وصداقت کے نئے نقوش قائم ہوگئے۔ لیکن اس کے بعد ایک دوسرا دور آتا ہے، تحریک اسلامی اپنے عین مثالی نمونے سے نکل کر ایک دوسرے مرحلے کے اندر داخل ہوتی ہے، وہ مرحلہ ایک لمبا مرحلہ ہے جبکہ امت اس مشن کے سلسلے میں گرم جوش نہیں رہی۔ پھر ایک وقت وہ آیا کہ امت نے اپنے مقام کو بھلا دیا، اپنے مشن کو بھلا دیا، اپنے مقصد کو بھلا دیا، اپنی فکر اور راہ بھلا دی، اپنی منزل بھلا دی، وہ ایک مقام پر رک کر کھڑے ہوگئے۔ انہیں یہ نہیں معلوم رہا کہ وہ کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں اور کہاں انہیں جانا ہے، کیا انہیں کرنا ہے اور آج وہ کہاں کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ دور بھی ان کے اوپر آیا کہ وہ نہیں جانتے تھے کہ اپنی راہ اور منزل کو گم کر کے بے خبری اور گمنامی کے ایک ایسے مقام پر کھڑے ہوئے ہیں جس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے روح محمد کو خطاب کر کے ان الفاظ میں اس کی ترجمانی کی تھی:

شیرازہ ہوا ملت مرحوم کا ابتر
اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

مسلمان کو یہ پوچھنا پڑا اور پوچھنے پر مجبور ہونا پڑا کہ ''اے روحِ محمد! اس راز کو اب فاش کر کہ آیاتِ الٰہی کا نگہبان اب کدھر جائے اور یہ قافلہ جس کو تو نے تشکیل دیا تھا، اسے بتا دے

کہ اس کی منزل کون سی ہے، اسے کہاں جانا ہے۔'' آہ! میں انسانی تاریخ کے اندر اس سے بڑی کسی ٹریجڈی سے واقف نہیں ہوں کہ جو اس شکل میں موجود ہے۔ ایک تاریخی حقیقت کے طور پر کہ جو امت ایک نصب العین کے تحت اٹھائی گئی، اس نے اپنے نصب العین کو بھلا دیا اور آج وہ اندھیروں کے اندر اس طرح بھٹک رہی ہے کہ روشنی کی کوئی کرن اور امید کا کوئی شعلہ اس کی زندگی کے اندر کہیں سے نظر نہیں آتا۔ دنیا کی گمراہ قوموں کی طرح وہ بھی اندھیروں میں بھٹک رہی ہے، ٹامک ٹوئیاں مار رہی ہے۔ یہ دور تاریکی کا دور ہے۔ یہ دور گراوٹ کا دور ہے۔ جہالت کا دور ہے، جس کی انتہا اس پر بات پر ہوئی کہ 1924ء کے اندر پہلی جنگ عظیم کے بعد خلافت کا جب سقوط ہوا اور برائے نام خلافت بھی باقی نہیں رہی اور مصطفیٰ کمال نے جب خلافت کو ترکی سے ملک بدر کر دیا تو وہ دنیا بدر ہوگئی۔ یہ ہمارے زوال کا آخری نقطہ تھا جس کو ہم نے چھولیا۔

جب ہم اپنی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ہم گرتے گرتے اور گرتے چلے گئے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بات بھی نظر آتی ہے کہ اسلام کی انقلابی روح کسی دور کے اندر بھی مضمحل نہیں ہوئی، مرعوب نہیں ہوئی بلکہ وہ مسلسل طوفان اٹھاتی رہی، تحریکیں اٹھاتی رہی۔ اس نے نئی نئی لہریں چلائیں، سمندر کے اندر طوفان اس نے اٹھائے اور کشتیوں اور جہازوں کو منزل اور ساحل کا پتہ بتانے کی کوشش کی، یہ کوششیں دورِ اول سے شروع ہوتی ہیں اور ہم اپنے دور تک دیکھتے ہیں کہ یہ کوششیں برابر اور مسلسل جاری ہیں۔ ائمہ اربعہ کا دور، حضرت عمر بن عبدالعزیز کا دور، حضرت امام غزالی کا دور، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کا دور، حضرت امام ابن تیمیہ کا دور، حضرت خواجہ معین الدین چشتی کا دور، حضرت خواجہ گیسو درازؒ کا دور — یہ سب کے سب لوگ اپنی ذات کے اندر اسلام کے اسی عظیم اخلاقی اور انقلابی مشن کے لیے کام کرنے والے اور اس کی علامت بنے ہوئے تھے۔

اس طرح یہ روح برابر اپنا کام کرتی رہی۔ اس کو بہت زیادہ زندگی کے سرچشموں پر قبضہ کر کے زندگی کو اپنے منشاء کے مطابق ڈھالنے کا اختیار چاہے نہ ملا ہو لیکن زیر زمین دھارے ہمیشہ بہتے رہے تا آنکہ ہمارا دور بھی آ گیا جو اجتماعیت کا دور ہے۔ تحریکوں کا دور ہے، آج اسلام

کی وہی انقلابی روح پوری شان کے ساتھ، بڑی قوت کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ آج پوری دنیا کے اندر اسلامی دعوت کا چرچا ہے۔ اسلامی تحریک کا احیاء ہے، اسلامی نصب العین کا شعور ہے۔ آج پھر سے اسلام اپنی اصل شان کے ساتھ اپنی اصل روح کے ساتھ سامنے آنے لگا ہے۔ اس کی روح بے نقاب ہورہی ہے، اس کی شان نمایاں ہورہی ہے۔ اس کے چہرے کے اوپر ڈالے ہوئے پردے چاک ہورہے ہیں۔ تاریخ نے اس کے چہرے کو دھندلا کرنے کی جو کوشش کی تھی اور گردوغبار اڑایا تھا وہ گردوغبار اب چھٹ رہے ہیں اور حقیقت اس دھند کے اندر سے اب نمایاں ہورہی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ آفتاب عالم تاب جب نصف النہار پر پہنچ کر چمک رہا ہوتا ہے، اگر دھند وغبار چھا جاتا ہے تو آفتاب نصف النہار پر پہنچ کر کیوں نہ چمک رہا ہو لیکن اس وقت اس کی روشنی پھیکی پڑتی نظر آتی ہے، ماند نظر آتی ہے۔ لیکن جب گردوغبار چھٹ جاتا ہے تو روشنی اپنی اصلی بہار دکھانے لگتی ہے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی تحریک، اسلام کی روح ایک نئے عزم کے ساتھ، ایک نئی طاقت کے ساتھ ہمارے اس دور کے اندر زندگی کی رہنمائی کے لیے پھر اس سے قریب ہوگئی ہے اور آگے بڑھ رہی ہے۔

ہندوستان کی جماعت اسلامی ہند ہو یا ہندوستان سے باہر کام کرنے والی اور تحریکیں ہوں چاہے ان کے نام مختلف ہوں وہ اسلام کی اسی روح کے حامل ہیں، وہ اسلام کے اسی نصب العین کے حامل ہیں۔ اسلام کی انقلابی روح کا مختلف شکلوں کے اندر ظہور ہورہا ہے۔ ہمارا دور تو تحریک اسلامی کا دور ہے۔ ہم ایک ایسے دور کے اندر ہیں جہاں ہم نہایت اعتماد کے ساتھ زمانے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ کہنے چلے ہیں اور کہتے جارہے ہیں اور ہم کہہ رہے ہیں کہ اے دنیا تیرے پاس اب کچھ بھی نہیں ہے، ہدایت الٰہی کی طرف لوٹ۔ دنیا کی ساری رہنمائیاں اب باطل ہوگئی ہیں اور باطل ہیں اور انھوں نے جتنا نقصان پہنچانا تھا پہنچادیا، پہنچا چکے اور تو بھگت چکی۔ آ خدا کی رہنمائی کی طرف لوٹ! سرورِ کائنات حضرت محمد ﷺ کی رہنمائی کی طرف نکل آ۔ دنیا کی تنگی سے آخرت کی طرف لوٹ آ۔ آج ہم یہ بات ڈنکے کی چوٹ سے کہہ رہے ہیں، ہانکے پکارے کہہ رہے ہیں، شرماتے ہوئے نہیں کہہ رہے ہیں، لجاتے ہوئے نہیں کہہ رہے ہیں، اعتماد سے کہہ رہے ہیں، عقل وحواس کے ساتھ کہہ رہے ہیں۔ صرف کہہ ہی

نہیں رہے ہیں بلکہ یقین سے ہمارا قلب معمور ہے، اعتماد سے ہمارا سینہ روشن ہے، یقین کے فوارے ہمارے سینوں سے ابل رہے ہیں اور آج ہم ساری دنیا کو یہ پیغام دے رہے ہیں کہ اے دنیا! اگر تو سعادت وفلاح چاہتی ہے تو اللہ کی ہدایت کی طرف آجا۔ اللہ کی طرف جھک جا۔ اللہ کے رسول کی اطاعت کو تسلیم کرلے، آخرت کو اپنا مقصود بنالے، تب ہی انسان کو موجودہ جھنجھٹوں سے نجات مل سکتی ہے۔ آج کی دنیا، آج کی انسانیت اور آج کا انسان اس کے سوا کیا ہے کہ اس شاندار انسانی تہذیب اور تمدن کو جس نے جنم دیا ہے اور جس کا بڑا چرچا ہے اور جس کی ترقی پر سائنس اور ٹکنالوجی کی جس ترقی پر اسے ناز ہے اور وہ فخر کرتا ہے کہ وہ چاند پر پہنچ گیا۔ میں آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں۔ آپ غور کریں۔ آج کے انسان کی انسانی زندگی اس کے سوا کیا ہے۔ وہاں کا انسان پانچ دن کوشش کرتا رہتا ہے اسے فرصت ہی نہیں، مسلسل وہ چلتی رہتی ہے، اس کو بالکل فرصت نہیں، وہ سوچتی نہیں سوچ سے محروم، احساسات سے محروم، فکر سے محروم، جذبے سے محروم، وہ صرف حرکت کرنا جانتی ہے اور حرکت کرتی رہتی ہے۔ اور دو دن، ہفتے کے آخری دو دن عیش کے دن ہوتے ہیں اور انسان اس وقت شیطان بن جاتا ہے اس کے سامنے کچھ نہیں ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج انسان کے سامنے عیش کے سوا زندگی کی حقیر اور حیوانی ضروریات کو پورا کرنے کے سوا کوئی اعلیٰ نصب العین اور مقصد سامنے نہیں ہے۔ وہ اس لیے پیدا ہوا ہے کہ بس اپنی خواہشات نفس کو پورا کرے۔ یورپ کا وہ مثالی انسان اور ترقی یافتہ انسان پانچ دن مسکین رہتا اور دو دن شیطان رہتا ہے۔ یہ وہ انسانی سوسائٹی ہے جو معیاری شکل میں دنیا کے اندر آج پائی جاتی ہے۔

میں آپ سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس موقع پر تحریک اسلامی کو پھر سے نئی راہیں بنانی ہیں اور پھر سے انسانیت کو دعوت دینی ہے اور انسانوں کو صحیح راہ کی طرف بلانا ہے۔ ہم اس بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ہم اور آپ ایک ایسے دور کے اندر پیدا ہوئے ہیں جبکہ اسلامی تحریکیں دنیا کے مختلف حصوں میں چل پڑی ہیں۔ اسلام اپنا مؤثر اور مفید رول انجام دینے کے لیے پھر میدان کے اندر آرہا ہے۔ افسوس کہ ایک وہ وقت بھی آیا تھا کہ زندگی سے اس کو کاٹ دیا گیا تھا لیکن اسلام آج پھر ہمارے سامنے آرہا ہے۔ زندگی کی رہنمائی کے لیے،

اس موقع پر میں آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں اور متفقین سے خاص طور سے اگر آپ تحریک اسلامی ہند کے متفق ہیں تو آپ کو اپنی حیثیت کا شعور ہونا چاہیے کہ آپ کس تحریک کے متفق ہیں اور آپ نے کیا سمجھ کر اتفاق کیا ہے اور کیا سمجھ کر آپ نے جماعت اسلامی ہند کے متفق بننے کی کوشش کی ہے اور بنے ہیں۔

آپ کے ذہن میں اس کا ایک واضح شعور اچھی طرح سے ہونا چاہیے۔ آپ کی حیثیت اس بات کی روشنی میں اس کے سوا کچھ قرار نہیں پائی کہ آپ نے جس فارم کو پُر کیا ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ آپ کا مقام، حلقہ، نام، ولدیت، عمر، مکمل پتہ اور اس کے بعد آپ یہ کہتے ہیں کہ میں نے جماعت اسلامی ہند کے بنیادی نکات کو 'دعوت اسلامی کیا ہے' کتاب پڑھ کر اور پڑھنا نہ جانتے ہوں تو سن کر سمجھ لیا ہے اور مجھے اس سے اتفاق ہے۔ ان شاء اللہ میں اسلام کے احکام پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا یا کروں گی۔ جماعت کے دینی و اصلاحی اور خدمت خلق کے کاموں میں حتی الوسع تعاون کروں گا یا کروں گی— یہ تین باتیں ہیں جن کا اقرار ہمارے متفقین حضرات کرتے ہیں۔

پہلی بات یہ کہ جماعت اسلامی ہند کے بنیادی نکات سے اتفاق۔

دوسری بات یہ کہ اسلامی احکام پر عمل کرنے کی کوشش کا عہد۔

تیسری بات یہ کہ جماعت اسلامی ہند کے دینی و اصلاحی اور خدمتِ خلق کے کاموں میں حتی الوسع تعاون کرنے کا اقرار اور اس کا عہد۔

آیئے ان میں سے ہر بات پر ہم ذرا غور کرلیں اور اس کے تقاضوں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہ جو عہد ہم نے کیا ہے اور جن باتوں سے اتفاق ہم نے کیا ہے۔ اس اتفاق اور اس عہد کے تقاضے کیا ہیں؟ پہلی بات جس کا آپ نے اقرار کیا ہے کہ میں جماعت اسلامی ہند کی دعوت کے بنیادی نکات سے اتفاق کرتا ہوں۔ بنیادی نکات ''دعوت اسلامی کیا ہے؟'' کے اندر پانچ عنوانات کے تحت ہمیں ملتے ہیں:

پہلی بات یہ کہ عقیدہٗ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ یہ جو کلمہ ہے اس کی مختصر تعریف اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ ہی کو ہم اپنا الٰہ، معبود اور حاکم مان لیں۔ حضرت محمد ﷺ کو ہر حیثیت سے رسول

تسلیم کر کے اپنے آپ کو ان کی مکمل رہنمائی میں دے دیں۔ یہ وہ بنیادی عقیدہ ہے، یہ وہ پہلا نکتہ ہے جس سے آپ نے اتفاق کیا ہے اور دوسری بات جس سے آپ نے اتفاق کیا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام جس کو اللہ نے ہر دور میں بھیجا ہے۔ جس کو حضرت محمد ﷺ کے ذریعے سے آخری دور میں آخری مرتبہ بھیجا ہے ہم اس اسلام کو جو آپ کے ذریعے سے آیا ہے، اپنا دین مانتے ہیں آپ کے ذریعہ جو دین آیا ہے وہی محفوظ دین ہے، مقبول دین ہے اور یہی مستند دین ہے۔ عنداللہ مقبول دین ہے اس حیثیت سے اسلام کو ہم اپنا دین مانتے ہیں کہ یہ ہمارا دین ہے، یہ ہماری زندگی کی پوری رہنمائی کے لیے آیا ہے اور یہ عقائد سے لے کر عبادات تک، اخلاق سے لے کر معاملات تک، گھریلو زندگی سے لے کر بیرونی زندگی تک تمام گوشوں کو اللہ کی ہدایت کے تابع کرتا ہے اور تابع بنانے کے لیے مکمل ہدایات اور واضح احکامات لے کر آیا ہے۔ یہ ہے وہ اسلام جس کو ہم مانتے ہیں۔ تیسری بات یہ کہ ہم مسلمان ہیں۔ ہم وہ لوگ ہیں جو اسلام کو اپنا دین مانتے ہیں جو اللہ کو اپنا حاکم اور معبود اور محمد رسول اللہ ﷺ کو اپنا رسول، اللہ کے دین اسلام کو اپنا دین، آخرت کو اپنا مقصود اور اللہ کی رضا کو اپنی زندگی کی غایت قرار دیتے ہیں۔ یہ ہے ہماری حقیقت، ہم مسلمان ہیں، ہم اللہ ہی کے مطیع و فرماں بردار ہیں۔ اسی کی عبادت کرتے ہیں، اسی کی اطاعت کرتے ہیں۔ چوتھی بات یہ کہ ہم نے اس نکتہ کو بھی مانا اور اس سے اتفاق کیا کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم اس دنیا میں دو حیثیتوں سے اپنی ذمہ داری محسوس کریں۔ ایک تو اللہ کے ایسے بندے کی حیثیت سے جو ایمان رکھتا ہے، شعور رکھتا ہے کہ ہمیں اللہ کی بندگی کرنی ہے اور بندگی کی دعوت دینی ہے اور اس حیثیت سے کہ ہم محمد ﷺ کی امت ہیں۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم آپ کی لائی ہوئی ہدایات کو مانیں اور اس کو عمل میں لائیں اور اسی کی طرف ہم دنیا کو دعوت دیں۔ اپنی زندگی کا عملی نمونہ پیش کر کے دنیا کو دعوت دیں۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے ہماری یہ ذمہ داری ہے۔ پھر پانچویں بات یہ کہ ہم نے یہ بات بھی تسلیم کی ہے اور اس سے اتفاق کیا ہے کہ آج سے ہماری زندگی نہ غلط مقاصد کے لیے گزرے گی، نہ بے مقصد گزرے گی بلکہ آج سے ہماری زندگی بامقصد ہوگی اور وہ مقصد کئی ایک نہیں ہوں گے بلکہ ایک ہی ہوگا جس کے لیے ہماری زندگی گزرے گی اور وہ مقصد ہوگا اللہ

تعالیٰ کے دین کی اقامت۔ اللہ کے دین کی اقامت کے معنی اس کے سوا کیا ہیں کہ اللہ کے دین کو بغیر کسی تفریق کے، بغیر کسی تقسیم کے، بغیر کسی کتر بیونت کے، بغیر کسی کانٹ چھانٹ کے پورے کا پورا ہم مان لیں۔ اپنے اوپر سب سے پہلے نافذ کرلیں، اپنے ذہن پر، اپنی فکر پر، اپنے اعتقاد پر، اپنے قلب کی گہرائیوں کے اندر اس کو اتار لیں، اپنی روح کے اندر اس کو جذب کرلیں۔ اپنی زندگی میں اس کو نافذ اور جاری وساری کرلیں اور پھر اسی کا جلوہ ہماری زندگی کے اندر ہر گوشے میں نمایاں ہو اور پھر اس کے ساتھ ساتھ ہم اس بات کی کوشش کریں کہ جس دین کو ہم مانتے ہیں خلق خدا کو اس کی طرف دعوت دیں اور اس کی کوشش کریں کہ دنیا کے اندر ایک ایسی سوسائٹی کو تشکیل دیں جو اللہ کی ہدایت کو مان کر اسی کے مطابق اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے والی ہو۔ گویا اقامت دین کے معنی یہ ہیں کہ ٹھیک وہ اسی طرح سے مانا جائے، اس پر اس طرح عمل کیا جائے کہ ''دستور جماعت'' کے الفاظ میں فرد کا ارتقاء، معاشرے کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل سب کچھ اسی دین کے مطابق ہوجائے جس کا مکمل نمونہ سرورِ کائنات حضرت محمد ﷺ نے اور ان کے بعد حضرات خلفائے راشدین نے دنیا کے اندر قائم فرمایا۔ یہ ایک مثالی نمونہ تھا۔ یہ ہے اقامتِ دین کا نصب العین جس سے ہم نے اور آپ نے اتفاق کیا ہے۔

ہم نے جب اس بات کا اقرار کیا کہ ہم نے جماعت اسلامی ہند کے بنیادی نکات کو سمجھ لیا ہے اور ہم اس سے اتفاق کرتے ہیں تو یہ پانچ بنیادی نکات ہیں۔ یعنی بنیادی عقیدہ اسلام مسلمان کی حیثیت، اس کی ذمہ داری اور اقامت دین جس سے ہم نے اور آپ نے اتفاق کیا ہے۔ بنیادی نکات سے اتفاق کے بعد اس کے جو تقاضے ہمارے سامنے آئے ہیں وہ یہ ہیں کہ سب سے پہلے ہمارے متفقین کو اپنے فکر واعتقاد کی اصلاح کرنی چاہیے اور پھر اپنے یقین کو مضبوط ترین بنائیں۔ یقین کیجیے کہ بے یقینی سے بڑھ کر کوئی مرض نہیں۔ اگر کوئی آدمی بڑے سے بڑے مرض کا شکار ہو تو اس کا وہ مرض دور ہوسکتا ہے، بے عملی بھی دور ہوسکتی ہے لیکن جو بے یقینی کا شکار ہو، اس کے یقین میں اگر شک کے کانٹے چبھے ہوئے ہیں تو اس کا علاج دشوار ہے۔ بے یقینی سب سے بڑی بیماری ہے۔ شک سب سے بڑی بیماری ہے جو قوائے فکر وعمل کو ٹھٹھرا کر رکھ دیتی ہے۔ انسان کی قوتِ عمل کو ماؤف کرکے رکھ دیتی ہے اور اس کو مضمحل کرکے پھینک دیتی

ہے۔ اس کو ناکارہ بنا کر رکھ دیتی ہے۔ پہلی بات جس کا متفقین سے ہم تقاضا کرتے ہیں۔ تحریک اسلامی تقاضا کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ بنیادی نکات کا علم فہم اور شعور حاصل ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ اپنے یقین کو محکم کریں، اپنے فکر و اعتقاد کی اصلاح کریں۔ تیسری بات یہ ہے کہ آپ نے اقرار کیا ہے کہ ان شاء اللہ اسلام کے احکام پر عمل کریں گے۔ تحریک اسلامی تقاضا کرتی ہے آپ سے اور بجا طور پر کرتی ہے کہ یہ اقرار صرف زبان کی حد تک نہیں رہنا چاہیے، اس کو حلق کے اوپر نہیں رہنا چاہیے۔ اسے بہر حال حلق کے نیچے اترنا چاہیے۔ حلق کے نیچے اتر کر دل پر اسے قبضہ جمانے کا موقع ملنا چاہیے۔ اس اقرار کو عمل کی شکل میں ڈھل جانا چاہیے۔ قال کو جعل بننا چاہیے۔ قول کو عمل بننا چاہیے۔ نظریے کو نمونہ بننا چاہیے، دعوت کو عملی شکل اختیار کرنا چاہیے۔ اس لیے ہم اس بات کا تقاضا کرتے ہیں اور تحریک اسلامی آپ سے اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ عملی زندگی کو سب سے پہلے اللہ کے دین کے مطابق بنالیں پھر دنیا کو اسلام کی دعوت دیں۔ خود ہماری زندگیاں اسلام سے خالی ہوں تو یقین مان لیجیے کہ یہ تماشا زیادہ دنوں تک چلنے والا نہیں اور دنیا میں اس سے بڑا کوئی مذاق نہیں ہوسکتا کہ آپ اسلام کی باتیں کریں، اسلام کی دعوت دیں اور آپ کی زندگیاں خود اسلام سے خالی ہوں، اس سے بڑا کوئی مذاق نہیں، اس سے بڑا کوئی تماشا نہیں، پھر اس مذاق اور تماشے کا نتیجہ اس شکل میں سامنے آئے گا کہ آپ اس دنیا کے اندر تماشا بن جائیں گے اور آپ کا وہ حشر ہوگا کہ دنیا آپ کا تماشا دیکھے گی۔ جو قوم اللہ کے دین کے ساتھ تماشا اور مذاق کرتی ہے، وہ خود مذاق کا موضوع بن جاتی ہے، جو قوم اللہ کے دین کے ساتھ تماشا کرتی ہے خود زمانہ اس کا تماشا کرتا ہے، اور وہ زمانہ کے لیے تماشا بن جاتی ہے، جس دین کی ہم دعوت دے رہے ہیں اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہماری عملی زندگی اس کا نمونہ ہو، ہماری زندگی اس کی منھ بولتی تصویر ہو۔ چوتھا تقاضا یہ ہے کہ اقامتِ دین کو ہم اپنا نصب العین بنا کر اس کے لیے مستقل، مسلسل اور منظّم جدوجہد کے لیے آمادہ ہوجائیں۔

یہ کیا بات ہوئی کہ ہم ایک نصب العین کو اپنائیں اور اختیار کریں، لیکن اس کے حصول کے لیے ہمارے دل میں کوئی بے چینی نہ ہو، ہمارے اندر کوئی تڑپ نہ ہو، ہمارے اندر کوئی ولولہ نہ ہو۔ ہم راکھ کا ڈھیر بن جائیں، ہم برف کی ایک سل بن جائیں، صرف اس بات کا

اقرار کرتے رہیں کہ ہمارے سامنے ایک نصب العین ہے، ہمارے سامنے ایک منزل ہے اور ہم اس منزل کی طرف بڑھنا چاہتے ہیں۔ اس بات کا اقرار کرتے رہیں لیکن اس بات کے اقرار کا حق نہ مانیں کہ جس کو ہم نے اپنا نصب العین بنایا ہے۔ اس کے لیے زندگی کو لگائیں اس کے لیے مسلسل جدوجہد کرتے رہیں۔ اوقات کی قربانی، جان کی قربانی، مال کی قربانی، جسم وجان کی محنت اور مشقت، یہ سب کچھ ہم برداشت کریں۔ نصب العین کا یہی تقاضا ہے۔ اقامت دین کو اگر ہم نصب العین بناتے ہیں تو اس نصب العین کا یہ تقاضا ہے کہ ہم پورے اخلاص کے ساتھ اس کو اپنائیں، پوری نگاہ اس کے اوپر جمادیں۔ یقین کی پوری طاقت کے ساتھ عمل کی پوری قوت کے ساتھ، پورے ولولے اور جوش کے ساتھ، پورے عزم اور حوصلے کے ساتھ اللہ کے دین کی اقامت کے نصب العین کے لیے مسلسل مستقل اور منظّم جدوجہد کے لیے ہم تیار ہو جائیں۔ کوئی حیلہ، کوئی مصلحت، کوئی عذر، کوئی بہانہ، خدا کے یہاں کام نہیں آئے گا۔ حیلہ ساز عقل، بہانہ ساز عقل ہزاروں حیلے تراشتی اور سجھاتی ہے۔ کبھی مصلحت کے راستے دکھاتی ہے، کبھی مختلف بہانے بتاتی ہے۔ اقبال علیہ الرحمہ نے خوب ہی کہا ہے:

عقل عیار ہے سو بھیس بنالیتی ہے

صرف قیل وقال اور فلسفیانہ موشگافیاں اور توحید کے علمی اور کلامی نکات کوئی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ توحید کا عملی تقاضا یہ ہے کہ خدا کو مانیں تو اس طرح مانیں کہ اس کے سوا کسی کی بندگی اور اطاعت نہ کریں، اسی کے پورے طور پر ہو رہیں۔ اس کی رضا کو زندگی کا مقصد بنالیں۔ اس کے لیے جئیں اور اس کے لیے مریں، شب و روز ہماری زندگی، ہمارے دن، ہماری راتیں، ہمارا جینا اور مرنا خدا کے لیے ہو جائے۔

قل ان صلوتی و نسکی ومحیای و مماتی للہ رب العالمین. لا شریک له و بذلک امرت وانا اول المسلمین.

''اے رسول! کہہ دیجیے کہ بے شک میری نمازیں، میری قربانیاں، میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ کے لیے ہے، جو پروردگار عالم ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور سب سے پہلے میں اس کا فرماں بردار ہوں۔''

حضرات! اقامتِ دین کے نصب العین کو زبانی طور سے اپنا نصب العین کہہ دینا اور اس کا زبانی اقرار کر لینا آسان ہے۔ لیکن واقعی اس کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا کر اس کے مطابق زندگی گزارنا مشکل کام ہے۔ اس نصب العین کا یہ تقاضا ہے کہ ہم پوری سنجیدگی اور پورے شعور کے ساتھ اس کو اپنا کر اس کے لیے کام کرنے کے لیے میدان عمل میں آجائیں۔ اقامت دین کے نصب العین کو جب آپ اختیار کر لیں تو کچھ اور باتوں کا بھی آپ کو خیال کرنا ہوگا۔ آپ ایک قافلہ بن رہے ہیں۔ اب یہ نصب العین کوئی انفرادی نصب العین نہیں رہا۔ یہ اجتماعی نصب العین بن گیا ہے۔ ایک تحریک اس کے لیے چل رہی ہے، آپ کے اندر وہ اوصاف ہونا چاہئیں جو ایک تحریک کو چلانے اور اجتماعیت کو قائم و باقی رکھنے اور اس اجتماعیت کو مؤثر بنانے کے لیے ضروری ہیں۔ آپ کے اندر باہمی خلوص و محبت ہونا چاہیے۔ اس نصب العین سے تعلق رکھنے والے سارے افراد کے اندر خلوص اور محبت کی ایک رَو دوڑ جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان کے اندر اخوت اور مساوات ہو۔ تیسری بات یہ کہ رواداری اور تحمل ہو۔ آپ انفرادی زندگی کے اندر جیسے چاہے رہتے ہوں، لیکن اجتماعی زندگی کو جب اپنائیں گے مزاج، طبائع، خیالات، زاویہ نگاہ اور رائیں مختلف ہوتی ہیں۔ اگر تحمل نہ ہو، رواداری نہ ہو، بردباری نہ ہو، ایک دوسرے کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی صلاحیت نہ ہو تو کاندھے سے کاندھا ملا کر چلنے کی خواہش کے باوجود آپ چل نہ سکیں گے۔ مسلمانوں کی انجمنوں اور اداروں کا کیا حال ہے؟ بڑے بڑے مقاصد کے لیے قائم ہوتی ہیں لیکن وہ چند دن بھی نہیں چل پاتیں، چلتی بھی ہیں تو سب کی سب بحران کا شکار ہو جاتی ہیں۔ جب ایک مسئلہ پر گفتگو شروع ہوتی ہے تھوڑی ہی دیر میں منھ سے کف آنے لگتا ہے۔ آنکھیں شعلہ بار ہو جاتی ہیں، سرخ ہو جاتی ہیں۔ پھر ایک کے بعد ایک کا گریبان دوسرے کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

پھر کسی کا رخ مشرق کی طرف اور کسی کا رخ مغرب کی طرف ہو جاتا ہے۔ یہ اس لیے کہ اجتماعی اوصاف سے ملت خالی ہوگئی ہے۔ ہم اسی ملت کے فرزند ہیں۔ ہمیں وہ اوصاف اپنے اندر پیدا کرنے ہوں گے جو کسی اجتماعی تحریک کو چلانے کے لیے ضروری ہیں کہ ہم اپنے اندر رواداری، تحمل اور بردباری پیدا کریں۔ اپنے اندر استقلال اور استقامت پیدا کریں، اپنے اندر

صبر اور حکمت پیدا کریں۔ ایک زمانہ سے ہم اپنی تحریک چلا رہے ہیں۔ آج کے فتنے کیا ہیں؟ آج کے حالات کیا ہیں؟ آج کے مسائل کیا ہیں؟ آج کارِ دین کیا ہے؟ کس طرح ہم اپنی بات کو رکھیں؟ ہمارا اپروچ کیا ہو؟ کیسے ہو؟ اور کس کس طریقے سے ہم اپنے کام کو آگے بڑھائیں، اس کے لیے صبر کی ضرورت ہے، حکمت کی ضرورت ہے، عظیم قربانی کی ضرورت ہے، جو لوگ اپنے نصب العین کے لیے قربانی نہیں دے سکتے، جنھیں اپنے نصب العین کے لیے قربانی دینا مشکل ہو، وہ لوگ اقامتِ دین کا کام انجام نہیں دے سکتے۔ ایثار وقربانی کے اوصاف اپنے اندر پیدا کرنا نہایت ضروری ہے۔ جس تحریک کو جاں نثار اور قربانیاں دینے والے لوگ ملتے ہیں وہ تحریک دیکھتے دیکھتے آسمان عروج پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکنے لگتی ہے، دیکھتے دیکھتے وہ چھلانگیں لگاتے ہوئے اپنے نصب العین کی طرح آگے بڑھنے لگتی ہے۔ جس تحریک کے افراد کے اندر ایثار وقربانی کے اوصاف نہیں ہوتے وہ بلند عزائم، اونچی اونچی آوازوں، دعوؤں اور نعروں کے باوجود دنیا کے اندر ایک نقش بھی قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہوتی۔ اگر کوئی نقش کھینچ بھی سکی تو وہ نقش، نقش برآب ہوگا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتی۔ اس لیے ایثار وقربانی کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ پھر اس مقصد کی دھن اور لگن ہر وقت ذہنوں پر چھائی رہے۔ پھر اسی کے ساتھ نظم، ضبط، ڈسپلن کی بھی ضرورت ہے۔ ایک بات میں آپ سے کہوں۔ پانچ آدمی ہیں فوج کے، پانچوں مسلح۔ ایک دستہ کی شکل میں اور ایک امیر کے تحت، وہ پانچ ہزار کی بھیڑ پر بھاری ہیں۔ اگر کبھی ان کا نشانہ چوک بھی جائے تو ان کی مسلسل حرکت ان کا کام، ان کی یلغار، اپنے مقصد اور نشانے ہی کی طرف ہوگی۔ پانچ ہزار کی بھیڑ، منتشر بھیڑ ان پانچ آدمیوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ اقامتِ دین کا نصب العین تقاضا کرتا ہے کہ اس کے ماننے والے اور اس کے لیے کام کرنے والے اپنے اندر بے انتہا مضبوط قسم کا ڈسپلن پیدا کریں، اپنے اندر نظم وضبط پیدا کریں۔ ایسی صورت حال نہ ہو کہ اعلان پر اعلان ہو رہے ہوں، ہدایتوں پر ہدایتیں دی جارہی ہوں اور سامنے کھڑے ہو کر کہا جارہا ہو لیکن بہرے کانوں سے سنا جائے اور سنی اَن سنی کر دی جائے، آپ کا نصب العین بہت اونچا سہی، آپ اس زمین پر خدا کے داعی سہی، لیکن آپ سے یہ کام ہوگا نہیں اور آپ کے ہاتھوں یہ کام آگے بڑھے گا نہیں۔

ہمیں صاف طور پر اس بات کا اعتراف کرلینا چاہیے کہ نظم اور تعلق پیدا کیے بغیر یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم اپنے کام کو آگے بڑھا سکیں اس لیے میں آپ سے عرض کروں گا کہ آپ متفقین کے مقام پر کھڑے ہو کر ٹھہر نہ جائیں، کھڑے ہو کر نہ رہ جائیں بلکہ اس کے تقاضوں کو سمجھیں اور آگے بڑھیں۔ جماعت اسلامی ہند کی چار سالہ پالیسی اور پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے، اس پر عمل درآمد کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنی اپنی جگہ متحرک ہو۔ یہ مولانا محمد یوسف صاحب امیر جماعت اسلامی ہند ہی کی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ یہاں بیٹھ کر اس چار سالہ میقاتی پروگرام کو عمل میں لائیں بلکہ دیہات میں رہنے والے کسان کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے جو تحریک اسلامی کا کارکن ہے جتنی کہ مولانا محمد یوسف صاحب کی اہمیت ہے۔ اگر وہ کسان مولانا محمد یوسف صاحب نہیں بن سکتا تو اسی طرح مولانا محمد یوسف صاحب بھی کسان کا وہ کام نہیں کر سکتے جو اپنی جگہ رہ کر وہ کرتا ہے۔ اس لحاظ سے ان دونوں کے کام میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں ایک ہی کام میں جڑے ہوئے ہیں۔ دونوں اپنی اپنی جگہ اس کام کو انجام دے رہے ہیں، اس لیے متفق سمجھ کر اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھیں اور یہ نہ سمجھیں کہ ہماری ذمہ داری کیا ہے، ہم تو صرف متفق ہیں۔ نہیں، ہم میں سے ہر شخص کی یہ ذمہ داری ہے کہ آگے بڑھیں اور اس پروگرام اور پالیسی کو عمل میں لانے کی کوشش کریں۔ اگر آپ آگے بڑھیں گے تو اللہ کی نصرت شامل حال ہوگی اور آپ کے ذریعہ سے اس ملک کے اندر عظیم کام انجام پائے گا، آپ کے ذریعے خلق خدا کو ہدایت ملے گی اور انھیں صحیح راستہ معلوم ہوگا۔ اگر آپ یہ نہیں کریں گے تو تاریخ کے اندر ایک نئے ناکام اور بدنما نقش کا اضافہ کر کے آپ اس دنیا سے رخصت ہوں گے، اور آنے والی نسلیں آپ کے دور کو، پھر آپ کے کاموں کو اور آپ کے اونچے اونچے عزائم کو دیکھیں گی اور اس کے ساتھ آپ کے رویے کو دیکھیں گی تو ہنستی مسکراتی، قہقہہ لگاتی ہوئی آگے نکل جائیں گی اور پھر آخرت میں جو کچھ ہوگا اسے اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

میں اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہمیں اور آپ کو اس کے دین کا صحیح شعور، اس پر عمل کی توفیق اور اقامت دین کو اپنی زندگی کا نصب العین بنانے کا جذبہ اور اس کے تقاضوں کا شعور اور اس کو پورا کرنے کا عزم اور حوصلہ عطا فرمائے، آمین۔ (زندگی نو، 1975ء)

وابستگانِ تحریک سے خطاب

منطقائی اجتماع عام حلقہ آندھرا پردیش

منعقدہ وجے واڑہ، 18 جنوری 2000ء

سب تعریف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے جو تمام تعریفوں کا سزاوار، مستحق اور حق دار ہے۔ درود وسلام ہو حضرات انبیائے کرام پر خصوصاً سرورِ کائنات احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ پر کہ جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغام کو آخری طور پر اور اپنی ہدایت کو مکمل طور پر سارے انسانوں کے لیے روانہ فرمایا اور جن کی حیاتِ مبارکہ کو نمونے کے طور پر قیامت تک پیدا ہونے والے سارے انسانوں کے لیے سامنے رکھا اور اس کو محفوظ کرنے اور محفوظ رکھنے کی توفیق امتِ مسلمہ کو عطا فرمائی۔ محترم نائب امیر جماعت مولانا سید جلال الدین عمری صاحب، قیم جماعت جناب محمد جعفر صاحب، مرکز کے سکریٹری صاحبان، امیر حلقہ جماعت اسلامی ہند آندھرا پردیش واڑیسہ اور حلقہ آندھرا پردیش واڑیسہ کے ارکانِ شوریٰ، نظمائے علاقہ، نظمائے ضلع، امرائے مقامی، ارکان جماعت، بہنو، بھائیو، بیٹو، بیٹیو اور نوجوانو اور عزیزو اور ایس آئی او کے میرے نوجوان کارکنو!

حمد وصلاۃ کے بعد میں حلقہ آندھرا پردیش کے اس عظیم اجتماع کے انعقاد پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے رفقائے حلقہ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انھوں نے بڑے مشکل حالات میں اس اجتماع کے نظم کا فیصلہ کیا بلکہ عملی طور پر پورا پورا حصہ لیا اور آج اللہ کی نصرت اور اللہ کی مدد سے آپ اس اجتماع کے انعقاد میں کامیاب ہوئے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ اپنی نصرت کو ہمارے شامل حال فرمائے، ہر طرح کی آزمائشوں اور فتنوں سے ہمیں اور آپ کو محفوظ رکھے اور اس اجتماع کے ذریعہ جو پیغام جماعت اسلامی ہند دینا چاہتی ہے وہ اس کے بندوں تک پہنچے اور جو

خدا کے بندے اس کے اس پیغام کو مختلف حصوں میں اللہ کے بندوں تک پہنچانے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں قبول فرمائے، ان کی مدد فرمائے، اپنی نصرت کو شاملِ حال کرے۔

حضرات! یہ اجتماع جس میں ہم اور آپ شریک ہیں، رسمی قسم کی کوئی کانفرنس، محدود مقصد کے لیے بلایا گیا کوئی سمیلن نہیں ہے بلکہ یہ اجتماع جس میں آپ اور ہم شریک ہیں ایک عظیم پیغام لے کر چلنے والی تحریک کا اجتماع ہے۔

پہلا مقصد، اس اجتماع کے ذریعہ ہم چاہتے ہیں کہ اس پیغام کو زیادہ سے زیادہ قوت اور جتنے وسائل و ذرائع ہمیں میسر ہوں ان سے کام لیتے ہوئے لوگوں کے سامنے پھر سے رکھیں، انھیں یاد دلائیں۔ اس کا جو مرکزی تھیم (Theme) ہے اس پر غور کیجیے۔ آج کی دنیا کے سامنے بس یہی دنیا ہے، اس دنیا کے بعد آنے والی ہمیشہ کی زندگی جو باقی رہنے والی ابدی زندگی ہے اس کو بھولی ہوئی ہے اور اس نے آج پوری نوع انسانی کو دنیا پرست، مادہ پرست اور زر پرست بنا دیا ہے اور پھر اس مادہ پرستی، دنیا پرستی اور زر پرستی نے انسان کو انسانیت کے مقام سے نیچے گرا دیا ہے۔ سائنس و ٹیکنالوجی کی تمام ترقیوں کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا اندھیرے میں سفر کر رہی ہے۔

چراغ کے رکھنے والو بڑا اندھیرا ہے۔ انسان اپنی تاریخ کے کسی دور میں اتنا پریشان نہیں رہا جتنا آج ہے۔ آج سے بھی زیادہ وہ کبھی اتنے مسائل سے دوچار نہیں ہوا۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسائل کا ایک انبار ہے جس کے بوجھ تلے انسانیت دبی و کچلی جا رہی ہے، درد و کرب سے چیخ رہی ہے، چلا رہی ہے، تڑپ رہی ہے لیکن کوئی مداوا، کوئی علاج سمجھ میں نہیں آتا۔ ایسے میں اس بات کی زیادہ اور شدید ضرورت ہے کہ آج کی پوری انسانیت کو اللہ کی طرف بلایا جائے۔ "ففروا الی اللہ" . انہیں آخرت کی ابدی زندگی کی یاد دلائی جائے۔ جماعت اسلامی ہند کا یہ پیغام ایک بنیادی پیغام ہے۔ یہی انسانی زندگی کی فلاح کا ضامن اور خسران سے بچنے کی واحد راہ اور کامیابی کی واحد راہ ہے، جس پر چل کر ہمیشہ انسانوں کو فلاح حاصل ہوئی۔

دوسرا مقصد یہ ہے کہ جو لوگ اس پیغام کو لے کر اپنے اپنے علاقوں میں اپنے اپنے شہروں، گاؤں، گراموں اور بڑے بڑے اپنے نگروں میں کام کر رہے ہیں، ان سب کو جمع ہونے کا موقع فراہم کیا جائے۔ ایک دوسرے کے کاموں سے واقفیت حاصل ہو اور مجموعی طور پر ہم کیا کچھ کر سکے ہیں، کیا کچھ کرتے رہے ہیں، کیا کچھ کر رہے ہیں، کیا کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ سب سامنے آئے، تجربات سامنے آئیں، کام کرنے کے ڈھنگ اور طریقے سامنے آئیں اور تجربات سے فائدہ اٹھائیں، حوصلہ بخشیں اور اس طرح ایک دوسرے کے قریب آ کر اللہ کی خاطر کام کرنے والے طاقت حاصل کریں۔ اس کام کے لیے زیادہ مستعدی کے ساتھ عزم وارادہ کر کے بلند حوصلگی کے ساتھ اپنے اپنے علاقوں کو لوٹیں اور اس کام کو انجام دیں۔

پھر تیسرا مقصد یہ بھی ہے کہ اس طرح سے ہماری تربیت بھی ہو، دو دن تین دن کا یہ اجتماع جہاں مل جل کر جمع ہوئے ہیں، بیٹھیں گے، ساتھ رہیں گے، سوئیں گے، کھائیں گے، پئیں گے اور ایک چھوٹی سی بستی جو تین دن کے لیے بسی ہے یہ اس پیغام کا نمونہ پیش کرے گی۔ اپنی زندگیوں سے، اپنے رہن سہن سے، اپنے شب و روز سے، اپنے صبح و شام سے کہ ہم کیا چاہتے ہیں؟ کیا بن کر رہنا چاہتے ہیں؟ کیا بنانا چاہتے ہیں؟ انسان کو کیا دیکھنا چاہتے ہیں؟ کیسا معاشرہ ہم ترتیب دینا چاہتے ہیں؟ اس کا ایک عملی مظاہرہ ہو۔ اس طرح عملی طور پر اس کی تربیت ہوتی ہے اور ہم یہ تربیت حاصل کرتے ہیں۔ میں آپ کو خاص طور سے اس کی طرف توجہ دلاتے ہوئے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جب یہ مقاصد اس اجتماع کے ہیں تو ہم میں سے ہر ایک کو جو اس اجتماع میں شریک ہوا ہے اس بات کو نگاہ کے سامنے رکھے۔ مقصد اگر نگاہ کے سامنے نہ ہو تو وہ چیز بے مقصد ہو جائے گی، وہ کام بے مقصد ہو جائے گا اور جو کام بے مقصد ہوتا ہے وہ کسی کام کا نہیں ہوتا، وہ بے کار ہو جاتا ہے۔ مقصد کو سامنے رکھیں اور اپنے اس اجتماع کو، اپنے اس پیغام کا جن اصول و خطوط پر آپ چل رہے ہیں، دنیا کو بلا رہے ہیں نمونہ بنائیں۔ بے شک مکمل اور مثالی نمونہ تو آنحضور ﷺ کی ذات گرامی و صحابہ کرامؓ کا معاشرہ تھا۔ لیکن ہم اور آپ اس شاندار لیکن اس وقت ٹوٹے پھوٹے محل کو از سرِ نو تعمیر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے ہیں تو کم از کم آثار سے تو یہ معلوم ہو کہ ہم اسی معاشرہ کو تعمیر کرنے جا رہے ہیں، اس کی جھلکیاں

ہم نے اپنی زندگی میں دکھائی ہیں۔

یہ مٹھی بھر تعداد چاہے چند سو کی یا چند ہزار کی ہو یہ اگر اپنی زندگیوں میں اس کا مظاہرہ نہ کر سکے تو پھر عالمی سطح پر اس مثالی معاشرہ کے قیام کے عزم کا اظہار ایک حسین خواب بن کر رہ جائے گا۔ ایک آرزو، ایک تمنا، ایک حسین خواب، اس سے بڑھ کر اس کی کوئی حیثیت نہ ہوگی۔ جو کچھ آپ بننا چاہتے ہیں اور بنانا چاہتے ہیں اس اجتماع میں جمع ہو کر آپ کو اس کا عملی مظاہرہ کرنا چاہیے۔ آپ کے سارے کام وقت کی پابندی کے ساتھ ہوں، جو وقت کی قدر نہیں کرتا، وقت اسے بے قدر بنا دیتا ہے، بے قیمت بنا دیتا ہے، صرف بے قیمت ہی نہیں بنا دیتا بلکہ سخت سزا دیتا ہے اور وہ سزا یہ ہوتی ہے کہ وقت اسے روندتا ہوا کچلتا ہوا آگے نکل جاتا ہے اور یہ کچل کر رہ جاتے ہیں، پچھڑ کر رہ جاتے ہیں، کچھ کر نہیں پاتے۔ ہمیں اس بات کی پوری پوری کوشش کرنی چاہیے کہ سارے کام اپنے ٹھیک وقت پر شروع کریں اور ٹھیک وقت پر ختم کریں۔

دوسری بات باقاعدگی اور نظم وضبط کی ہے۔ ایک عظیم مقصد آپ کے سامنے ہے، ایک عظیم الشان نصب العین کو لے کر آپ چل رہے ہیں، اس کے حصول کے لیے آپ کو ایک منظّم جدوجہد کرنی ہے اور کسی منظّم جدوجہد کا تصور نہیں کیا جا سکتا بغیر منظّم تحریک کے اور کوئی منظّم تحریک ایک منظّم تنظیم کے بغیر چل نہیں سکتی، جماعت اسلامی ایک تحریک ہے، اس تحریک کو چلانے کے لیے بنائی گئی تنظیم ہے، یہ تنظیم تحریک کے لیے ہے، تحریک تنظیم کے لیے نہیں ہے۔

ہم منظّم ہونے کے لیے منظّم نہیں ہیں، ہم ایک تحریک چلانے کے لیے منظّم ہوئے ہیں اور وہ تحریک کیا ہے؟ خدا کے پیغام کو بندوں تک پہنچانا، خدا کی مرضیات سے بندگانِ خدا کو آگاہ و واقف کروانا، زمین پر انسانی شرافت کا چرچا، خیر کی اشاعت، بدی کو مٹانا، خیر کو غالب کرنا، عظیم مقصد کے لیے جس قدر منظّم جدوجہد کی ضرورت ہے اس کا آپ اندازہ فرما سکتے ہیں۔ اور منظّم جدوجہد اس وقت ہو سکتی ہے جبکہ لوگوں کے اندر نظم وضبط ہو، وہ ڈسپلن کے عادی ہوں، جس درجہ کا نظم وضبط اور ڈسپلن ان کے اندر ہوگا اتنا ہی وہ کسی عظیم مقصد کے لیے جدوجہد کرنے والی ایک تنظیم بن سکیں گے اور وہ تنظیم جتنی منظّم ہوگی اتنے ہی منظّم انداز میں وہ تحریک کو چلا سکے گی۔ افراد جمع ہیں، ہمیں یہ کام کرنا ہے، کیسے کریں؟ کس طرح کریں؟ ترتیب کیا ہو؟

ترجیحات کیا ہوں؟ ہماری قوت، ہمارے وسائل و ذرائع کیا ہوں؟ ہم کس بات پر کس کام کے لیے کتنی قوت لگائیں؟ منظّم منصوبہ بندی، منظّم جدوجہد اور کوشش ہی سے کسی مقصد کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ کی حیات مبارکہ، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی پوری زندگی اس بات کا ایک مثالی اور مکمل نمونہ ہے۔ کتنی منظّم جماعت تھی اور کتنی منظّم جدوجہد تھی وہ، اس آسمان کے نیچے اس زمین کے اوپر اللہ کے آخری رسول اور صحابہ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ انجام دی۔ باقاعدگی اور نظم وضبط، پھر آپ جو زندگی میں صفائی ستھرائی اور پاکی لانا چاہتے ہیں تو آپ کی اپنی زندگیاں، آپ کی مثالی زندگیاں، انفرادی سرگرمیاں، آپ کی اجتماعی سرگرمیاں، آپ کا گھر، آپ کا بازار، آپ کا رہن سہن، آپ کے سارے کام، صاف ستھرے پاک ہوں، مجھے افسوس کے ساتھ یہ بات کہنی پڑتی ہے، میں طنز نہیں کررہا ہوں، حقیقت بیان کررہا ہوں، نبی کریم ﷺ نے طہارت کو نصف ایمان قرار دیا ہے۔ ہم نے سمجھا کہ طہارت صرف استنجا کرنے کا نام ہے، ڈھیلے کی طہارت، استنجا کریں تو پانی لے لینا، پانی سے صاف کرلینا یہ طہارت ہے، ارے کیا اتنی سی بات کا نام نصف ایمان ہے؟ غور فرمایئے حضور نبی کریم ﷺ کے ارشاد پر، غور کیجیے ایک ہمہ گیر بات، جامع بات طہارت ذہن کی، طہارت قلب کی، طہارت نفس کی، طہارت کردار کی، طہارت ظاہر کی، طہارت باطن کی، پوری زندگی کے اندر طہارت۔ بندۂ مومن بندۂ طاہر ہو، بندہ ہوتا ہے، طاہر ہوتا ہے۔ بندۂ طاہر، بندۂ شاکر، بندۂ صابر، بندۂ طاہر، جہاں آپ رہیں صاف ستھرے، یہ نہیں کہ جمع ہوجائیں لوگ کچرا، کوڑا کرکٹ، گندگی، فضلہ ان کے آزو باز و ہو، نہیں صفائی کا ہمارا ذوق ہو، صفائی کا ہمارا مزاج ہو، صفائی ہمارا ذہن ہو، اندرونی زندگی سے لے کر، یعنی جسم کی زندگی کے باطنی حصے سے لے کر ظاہری حصے تک صفائی، پاکیزگی ،ستھرائی، کپڑے سادہ ہوں، لیکن صاف ستھرے ہوں، جھونپڑی میں رہتے ہوں لیکن صاف ستھرے رہتے ہوں، ہر کام میں صفائی ستھرائی، سلیقہ مندی، سلیقہ شعاری، یہ بہت ضروری ہے۔ آپ کو ان تمام پہلوؤں سے اپنی زندگی کو بنانا ہے اور اجتماعات کے موقع پر جو کچھ بن سکے ہیں، بنا سکے ہیں اس کا مظاہرہ عملاً ہونا چاہیے۔ اور یہ ایک طرح کی کسوٹی ہے جس پر ہم اپنے آپ کو دیکھ سکتے ہیں کہ کہاں تک ہمیں اس میں کامیابی

حاصل ہوئی ہے۔

دوستو اور عزیزو! ہم جمع ہوئے ہیں اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے، دستور جماعت اسلامی ہند میں آپ نے پڑھا ہوگا، پڑھتے ہی رہتے ہیں کہ جماعت اسلامی ہند کا نصب العین دفعہ ۴ میں لکھا ہوا ہے، عبارت موجود ہے غور سے پڑھیے گا: ''جماعت اسلامی ہند کا نصب العین اقامت دین ہے، اس کا حقیقی محرک (Motive) اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی اور آخرت کی فلاح کو حاصل کرنا ہے۔'' دین کی اقامت اگر رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لیے نہ ہو، آخرت کی ابدی زندگی کی کامیابی کے لیے نہ ہو، تو ہوسکتا ہے کہ آپ کے ہاتھوں سے دین کی خدمت ہوجائے اور دین قائم ہوجائے لیکن نتیجتاً جنت نہیں جہنم ملے! اگر وہ کام اللہ کی رضا کے لیے ہم نے نہ کیا ہو۔ اسی لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی نیت میں پاک ہوں اور حفاظت اسی کی کریں، اللہ کی یاد سے ہمیں معمور رہنا چاہیے۔ اپنی زبان کو، اپنے دماغ کو، اپنے دل کو اللہ کی یاد سے معمور رکھیں، مومن کا تعلق ہر آن اپنے رب سے، ہر لحوں کا تعلق، ہمہ تن تعلق، ہر دم تعلق، ہمہ گیر تعلق، اللہ تعالیٰ سے پوری زندگی کا تعلق ہونا چاہیے۔

فاذكروني أذكركم واشكروا لي ولا تكفرون. (البقرة:152)

''پس تم مجھے یاد رکھو میں تمھیں یاد رکھوں گا۔ میرا شکر کرو نا فرمانی نہ کرو۔''

پوری زندگی ذکر بن جائے، ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن، کردار میں گفتار میں اللہ کی برہان، اللہ کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے دنیا میں کوئی دلیل نہ ہو تو ایک مومن کا وجود اللہ کے وجود کی سب سے بڑی شہادت ہے، سب سے بڑی گواہی، سب سے بڑا ثبوت، ہر لحہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن، گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان۔ کسی کو معلوم نہیں کہ مومن قاری نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں ہے قرآن۔ اللہ اللہ! اللہ کی یاد سے اپنے آپ کو معمور رکھیں۔ میں بطورِ خاص اپنے احباب ورفقاء سے اپنے نفس سمیت، اپنے آپ سمیت آپ سب کو میں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اس سے غافل نہ رہیں اور آج انسانیت کی ساری مصیبت اسی بھولنے کا نتیجہ ہے۔ اس کا علاج اس کی یاد کے سوا کچھ نہیں، اس کے ذکر کے سوا کچھ نہیں، اس کی راہ ہدایت پر چلنے کے سوا کوئی راہ نہیں۔

دوستو! ابھی آپ نے ناظم اجتماع سے سنا کہ کن حالات میں یہ فیصلہ ہوا تھا اور کن حالات سے عملاً اس اجتماع تک آپ کو گزرنا پڑا، آپ کیا پورے ملک کو گزرنا پڑا۔ پوری دنیا کے اندر ایک تہلکہ مچ گیا، 11 ر ستمبر کون بھول سکتا ہے، چاہے وہ کوئی ملک ہو؟ چاہے ان کا کوئی رنگ ہو؟ چاہے کوئی زبان ہو؟ کہیں کے ہوں؟ لیکن بہرحال 11 ر ستمبر World Trade Center پر حملہ پھر فوجی مرکز پنٹاگن پر حملہ، نتیجہ میں، نتیجہ کے طور پر ہزاروں آدمی اپنی جان کھو بیٹھے۔ کتنے ہی معصوم انہیں یہ پتہ نہیں تھا کہ گھروں سے چل رہے ہیں تو موت ان کے انتظار میں ہے۔ وہ اپنے آفس کو نہیں بلکہ موت کے منھ میں جارہے ہیں۔ انہیں کیا پتہ تھا کرنے والا کوئی ہو کسی بھی مذہب و دھرم کا نام لیتا ہو۔

دہشت پسندی، دہشت گردی کا کوئی تعلق کسی مذہب سے نہیں ہوتا اور اسلام تو اس کو جائز ہی نہیں رکھتا۔ اسلام پر یہ الزام چاہے اس کے مخالف اسے دیتے ہوں، چاہے اس کی خدمت کا نام لے کر کرنے والے وہ کام کرتے ہوں، دہشت دہشت ہے اور وحشت ہے، یقیناً دہشت سے وحشت ہی پیدا ہوگی۔ میں نے انڈومان نیکوبار میں لوگوں کو بتایا، یہ بات واضح کی پچھلے سفر میں جس سے ہو کر میں یہاں آیا ہوں۔ میں نے کہا کہ چور چور ہوتا ہے کوئی اسلامی چور یا ہندو چور، ہندومت کا چور، سکھ چور، سکھ مت کا چور، عیسائیت کا چور (Christianty) کا چور نہیں ہوتا، اسلام کا چور نہیں ہوتا، چور چور ہی ہوتا ہے، شرابی شرابی ہوتا ہے، مسلمان کے پینے سے شراب اسلامی شراب نہیں ہوجاتی۔ سکھ کے پینے سے وہ شراب سکھ مت کی شراب نہیں ہوجاتی ہے۔ برائی برائی ہے چاہے کوئی کرے۔ پھر 13 ر دسمبر کو ہندوستان کی پارلیمنٹ پر کیا گیا حملہ، ہندوستان کے اقتدار، ہندوستانی عوام کے نمائندوں کا ایک ایوان، ایک مجلس، اس پر حملہ گویا ایک چیلنج تھا۔ مجھے کچھ آپ کہنے دیجیے کہ حادثہ تو حادثہ ہے لیکن اس کو جس انداز میں پیش کیا جارہا ہے اگرچہ کہ بعد میں سنبھل گئے لیکن حکومت نے جو ردِ عمل پہلے ظاہر کیا، جس کو محسوس کرکے بات پلٹانے لگے، دین کے نام پر اسلام کے نام پر الزام لگانے لگے تھے اگرچہ کہ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا فوراً انھوں نے اپنی بات بدلی اور کہا کہ نہیں یہ کسی مذہب اور کسی مذہب کا نام لینے والے کسی گروہ سے ہماری لڑائی نہیں، لیکن چاہے غلطی کا احساس ہوا ہو اس کا اعلان بھی

کیا ہو لیکن اس کے اثرات تو بہر حال پڑے ہیں اس سے انکار کیسے کیا جا سکتا ہے، پوری دنیا کا ماحول خراب ہوا، گویا پوری دنیا کے ماحول پر اس کا اثر پڑا اور خود ہمارے ملک پر اس کا اثر پڑا۔ بالخصوص اسلام کی طرف مسلمانوں کی طرف پورے ملک کے اندر جو پہلے ہی سے ایک طرح کی فضا اور ماحول پایا جاتا تھا فضا پائی جاتی تھی، بنی ہوئی تھی اوشواس کا واتاورن، بے اعتمادی کا ماحول گویا ایسا معلوم ہوا کہ جناب اسے پر لگ گئے، اس کی پرواز میں اضافہ ہوا اور ابھی فضا اس سے متاثر ہے اور یہ فضا جہاد جہاد پکار رہی ہے اور جہاں جہاں تک اس طرح اس پر اثر ہوا کئی مسائل پیدا کر دیے۔

بہر حال ان حالات کے اندر آپ یہ اجتماع کر رہے ہیں۔ بے شک ماحول ناساز گار ہو گیا تھا، فضا متعصب ہو گئی تھی پھر ساتھ ہی ساتھ جیسا کہ آپ نے سنا 5/جنوری کو زبردست بارش ہوئی، پورا پنڈال ڈھے گیا، زمین بوس ہو گیا، دھاراشاہی ہو گیا، راشٹر بھاشا میں دھاراشاہی کہتے ہیں، جو زمین بوس ہو گیا۔ لیکن آپ کے حلقہ کی قیادت نے آپ کی شوریٰ نے یہ فیصلہ کیا کہ نہیں ہم تو یہ اجتماع کریں گے ان شاء اللہ! اور صرف ایک فیصلہ نہیں کیا اس کو عملی جامہ پہنایا اور آج یہ عظیم الشان اجتماع یہاں ہونے جا رہا ہے اور عملی طور پر آپ لوگوں نے جس چیز کا عملی مظاہرہ کیا قابلِ غور ہے، حالات چاہے جس طرح کے بھی ہوں، ساز گار ہوں کہ ناساز گار۔ موافق ہوں کہ ناموافق سہولتیں ہوں، بحمد للہ تب بھی اور دشواریاں ہوں تب بھی ہمارا عزم نہیں ٹوٹے گا، ہمارے حوصلے پست نہیں ہوں گے، ہمارے ارادے نہ ہی کم زور پڑیں گے۔ ہر طرح کے حالات کا ہم سامنا کریں گے اور حالات کیسے کچھ بھی ہوں ہم بہر حال کام کرتے رہیں گے۔

میں مبارک باد دیتا ہوں آپ نے اس عزم کا مظاہرہ کیا اور یہ مظاہرہ آج اس اجتماع کی شکل میں موجود ہے۔ مجھے یہ تفصیلات معلوم ہوئیں کہ جب آپ کا یہ پنڈال گر گیا تو ناظم اجتماع نے رفقاء کو مطلع کیا، اور صبح ہونے تک سیکڑوں احباب مختلف مقامات سے چل کر یہاں آئے۔ لیبر کی ضرورت بھی پڑی لیکن ہمارے رفقاء نے بھی اپنا حصہ ادا کیا، اس کو پھر سے بحال کرنے اور بنانے میں پوری قوت صرف کر ڈالی اور ایک اچھا مظاہرہ کیا، یہاں حالات کا اندازہ ہے

موافق کہ ناموافق بلکہ بالخصوص ناموافق حالات کا ہموار ہو کہ ناہموار، بالخصوص اگر ناہموار ہوں راستہ بہرحال طے ہوگا۔ منزل کی سمت ہمارا سفر جاری رہے گا۔ ناہموار ہو تو ہموار کریں گے، دشواری ہو تو قابو پائیں گے، رکاوٹیں ہوں تو دور کریں گے، اپنی کمزوریوں کو بھی دور کریں گے اور رکاوٹوں کو بھی دور کریں گے۔ ایسا نہیں کہ رکاوٹوں کو دور کرنے میں کمزوریوں کو بھول جائیں، نہیں ہم بڑے کمزور لوگ ہیں، بڑی کوتاہیاں، بڑی کمزوریاں بڑی غفلتیں خود ہمارے اندر پائی جاتی ہیں، ان کی اصلاح کا طریقہ بھی یہی ہے کہ ہم مسلسل جدوجہد کرتے رہیں، اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کو سمجھیں، ان کو دور کرنے کی فکر بھی کرتے رہیں اور اس پر عمل کی کوشش بھی ورنہ انسان کی یہ بڑی کمزوری ہے کہ وہ دوسروں کی کمزوریوں کو دیکھتا ہے، اسے اپنی کمزوریاں دکھائی نہیں دیتیں، چناں چہ کسی شاعر نے ایک بڑی اچھی بات کہی ہے اور کہا ہے ؎

باہما باذوق آگہی ہائے رے پستیِ بشر
سارے جہاں کا جائزہ اپنے جہاں سے بے خبر

یہ ہم میں نہیں ہونا چاہیے۔ یہ اجتماع جب ہم یہاں جمع ہوتے ہیں، یہی تو موقع ہوتا ہے کہ جہاں اپنی خوبیاں نظر آتی ہیں، ہمیں اپنی خامیوں پر بھی نظر ڈالنی چاہیے۔ یہ خامیاں بھی ابھر کر آتی ہیں، سامنے کوتاہیاں بھی ابھر کر سامنے آتی ہیں، کہیں ہم جی تو نہیں چرا رہے ہیں، ڈالی گئی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں ہم سستی تو نہیں برت رہے، اپنی کمزوریوں اور اپنی کوتاہیوں کو بھی سمجھنے اور جاننے کا موقع ملتا ہے، وہ بھی سطح پر ابھر کر آتی ہیں جو اندر موجود ہوتی ہیں۔ سطح پر بھی وہی چیز نظر آتی ہے جو اندر موجود ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ اندر موجود نہ ہو اور سطح پر آجائے، دریا میں جب طغیانی آتی ہے Flood آتا ہے تو دریا کے اندر جو تہہ نشین چیزیں موجود ہوتی ہیں، کچرا جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ سب سطح پر آجاتا ہے، جب اس طرح لوگ جمع ہوتے ہیں اجتماعی طور پر جمع ہونے کا موقع ملتا ہے تو خوبیوں کا بھی مظاہرہ ہوتا ہے اور خامیاں بھی سارے پردوں کو چاک کر کے ابھر کر سطح پر آجاتی ہیں۔

عزیزو اور دوستو! میں اس موقع پر اپنی بات کو اختتام تک پہنچاتے ہوئے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ پچھلی صدی گزری، نئی صدی کا آغاز ہوا، عیسوی لحاظ سے اور ہجری لحاظ سے یہ بائیسواں

سال ہے پندرہویں صدی ہجری کا۔ اس کے بعد یہ سال بھی ختم ہوگا۔ یہ گویا بائیس سال ہو چکے پندرہویں صدی ہجری کا آغاز ہوئے اور عیسوی صدی کو ابھی دو ہی سال ہوئے، بہرحال پچھلی صدی پر اس لحاظ سے ایک نظر ہمیں ڈالنی چاہیے کہ پچھلی صدی جہاں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کی صدی اور اس میں سنگ میل ثابت ہوئی وہیں پچھلی صدی انسانی نقطۂ نظر سے انتہائی خونی صدی تھی۔ دو بڑی جنگیں ہوئیں، چھوٹی موٹی تو بہت ہوئیں، لاکھوں انسان بلکہ کروڑوں انسان اس سے متاثر ہوئے، خصوصاً پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں کروڑوں افراد مارے گئے، اتنی بڑی جنگ تاریخ میں کبھی لڑی نہیں گئی۔ پھر اسی گزری ہوئی صدی کے اندر مادہ پرستی اور مادیت اور مادی فلسفہ اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ اور دنیا کی ایک بڑی تحریک جو انسانی مشکلات کو دور کرنے کے لیے کھڑی ہوئی تھی وہ ابھری، آگے بڑھی، ساری دنیا اس کے آگے تھر تھر کانپ رہی تھی، پھر وہ صدی کے ختم ہونے سے پہلے پہلے رخصت ہوگئی۔ میری مراد اشتراکی تحریک سے ہے، نام باقی رہ گیا نہ جان باقی رہی، نہ مقصد باقی رہا نہ کوئی چیز باقی رہی! بس نام رہ گیا۔ ایک لاش ہے جس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی ہے۔ ایک لاش ہے اس کو لوگ سنبھالے ہوئے ہیں اور جلوس ہے جنازہ کا لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید کوئی شاندار کارنامہ اس سے انجام پائے گا نہیں، یہ جلوس جنازہ ہے۔

دوستو! یہ گزری ہوئی صدی میں سب کچھ ہوا پھر پچھلی صدی اس لحاظ سے بھی بھلائی نہیں جاسکے گی کہ مغربی استعمار، سامراج اس کے عروج کی ایسی صدی تھی کہ نقطۂ عروج پر پہنچ گئی تھی، اس کی ترقی، اس کا عروج، اس کی سربلندی اور نصف آخر سے یکے بعد دیگرے حالات ایسے پیش آئے، خدا کا بڑا فضل ہوا اور مادہ پرستی کا زور وشور آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا اور پھر اسلامی تحریکات ساری دنیا کے اندر اٹھ کھڑی ہوئیں، اسلام ایک پیغام رحمت اور ایک نظامِ رحمت کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آیا۔ بڑا ہی سنگین اور نازک دور ہے جس سے ہم اور آپ گزر رہے ہیں۔ مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ ان شاء اللہ پندرہویں صدی غلبۂ اسلام کی صدی ہوگی۔ چنانچہ پندرہویں صدی ہجری کے آغاز سے قبل ہی میں نے اپنے محدود علم و نگاہ سے دیکھا تھا کہ پندرہویں صدی ہجری ان شاء اللہ تعالیٰ خدا کی ایک رحمت کی صدی ہوگی۔ خدا کا دین

سارے انسانوں کا دین بن جائے گا۔ ساری پندرہویں صدی ہجری، اکیسویں صدی عیسوی ان شاء اللہ تعالیٰ اللہ کے دین کی صدی ہوگی، انسانیت کی صدی ہوگی، شرافت کی صدی ہوگی، حق وانصاف کی صدی ہوگی، انسانوں کی صدی ہوگی، تو اب نئی صدی کا آغاز کرتے ہوئے ہمیں عزم کے ساتھ آگے بڑھنا ہے کہ ہم اس صدی کو ان شاء اللہ رحمت کی صدی بنائیں گے۔ روشنی پھلائیں گے، تاریکیاں دور ہوں گی، ظلمتیں کافور ہوں گی، اجالا پھیلے گا، پھیلتا رہے گا، کوئی وجہ نہیں مایوسی کی۔ ضرورت ہے ایمان کی، یقین کی، اللہ پر توکل کی، عزم اور حوصلے کی اور جہد مسلسل کی۔

دوستو اور عزیزو! البتہ یہ بات بھی میں نے عرض کی تھی جو آنکھوں کو دکھائی دے رہی تھی، میں نے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے عرض کیا تھا کہ پندرہویں صدی ہجری کے آغاز سے پہلے ہی یہ غالباً 1979ء کی بات ہے جب میں نے عرض کیا تھا مجھے یہ بات یاد آرہی ہے کہ آئندہ صدی اللہ کے دین کی صدی ہوگی، ہدایت کی صدی ہوگی، مسلمان بس خوشی سے نعرے لگانے کے موڈ میں تھے مسلمان جب خوش ہوتا ہے تو نعرہ لگاتا ہے کرتا کراتا کچھ نہیں۔ نعرہ اس کا شوق، نعرہ اس کی غذا، نعرہ اس کی روح، نعرہ اس کا جسم، نعرہ اس کا لباس، نعرہ اس کا اوڑھنا، نعرہ اس کا بچھونا، نعرہ تکبیر! سارے لوگ بولیں اللہ اکبر پلٹ کر دیکھیں، تو ایک کا بھی پتہ نہیں۔ یہ بہرحال میں نے عرض کیا، خوش نہ ہوئیے، آنے والی صدی یقیناً ان شاء اللہ تعالیٰ اسلام کی صدی ہوگی لیکن اس خواب کو شرمندۂ تعبیر ہونے کے لیے مشکلات و مصیبتوں کے سمندر اور دریاؤں سے گزرنا ہوگا اور آغاز میں آپ دیکھ ہی رہے ہیں اور اس وقت بھی اپنی معلومات کے مطابق میں نے عرض کیا تھا، ہوسکتا ہے کہ اس وقت بھی اس کا علم اس کا جھنڈا مغرب میں امریکہ کے مشرق میں جاپان کے ہاتھ میں ہوگا اور آپ اس وقت بھی اسی طرح امید کریں گے جس طرح آج کررہے ہیں، خوش نہ ہوئیے! مشکلات سے گزرنا ہوگا، مشکلات کے دریا اور سمندروں سے گزرنا ہوگا۔

دوستو! نازک وقت ہے، سنگین حالات ہیں لیکن کام ہمیں یہی کرنا ہے۔ آپ کے اس اجتماع نے یہی ثبوت دیا ہے کہ آپ یہ عزم رکھتے ہیں، یاد رکھیے گا اس کام کو کامل یقین کے

ساتھ اللہ پر توکل کرتے ہوئے نہایت سنجیدگی کے ساتھ دنیا کے ان تمام ہونے والے واقعات سے جس سے غیر شعوری طور پر ہم متاثر رہتے ہیں، اپنے حوصلوں پر اس کا اثر نہ پڑنے دیا جائے اور اللہ کے دین کو سامنے لانے کی پوری کوشش کی جائے۔ اسلام دین دعوت ہے، اسلام دین حیات ہے، اسلام دین انسانیت وشرافت ہے، اسلام دین عدل وقسط ہے، اسلام دین حق و صداقت ہے، اسی حیثیت سے اللہ کے دین کو سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ ضرورت ہے کہ آج کی دنیا کو پوری بنی نوع انسان کو دین کیا ہے آپ بتائیں، آواز بلند کریں، پکاریں، مگر یہ پکار دعوت ہی ہو للکار نہیں۔ میں پکار کی بات کرر ہا ہوں للکار کی نہیں کہہ رہا، ہاں للکارنے کا بھی ایک وقت آتا ہے لیکن للکار سے پہلے طویل مسلسل پکار بلند کرنے کی ضرورت ہے۔ پکارتے رہنے کی ضرورت۔

دوستو اور عزیزو! ہم دعوت لے کر چل رہے ہیں، دعویٰ نہیں کرتے، عزیزو! ہم داعی ہیں مدعی نہیں، ہمیں اپنی اس حیثیت کا پورا شعور ہونا چاہیے اور کبھی انتقامی انداز میں اپنے فکر وطرز کو متاثر نہیں ہونے دینا چاہیے۔ حضورﷺ نے جو نو باتیں فرمائیں اس میں ایک بات یہ بھی ہے کہ میں کسی سے بھی راضی ہوں یا ناراض لیکن عدل کروں۔ عدل کی بات کہوں، حق بات کہوں، کسی سے راضی ہوں یا ناراض، بات ہو تو حق کے مطابق ہو، کیسی بات، کیسی حدیث، کیسا ارشاد نبی کریمﷺ کا، اس کو یاد رکھئے۔

میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کے اجتماع کو کامیابی کی منزل تک پہنچائے۔ گزشتہ برسوں میں ہمارے کتنے ہی ارکان جماعت، کارکنان جماعت، متفقین جماعت، پورے ہندوستان میں اللہ کو پیارے ہو گئے اور آپ کے آندھرا پردیش میں مجھے یاد آتا ہے کہ جناب صالح بکران صاحب، جناب عبدالغفور صاحب ورنگل، جناب فضل اللہ قریشی صاحب آرمور اور جناب عبدالرحمٰن صاحب کتہ گوڑم یہ ارکان جماعت تھے جو گزر گئے اور کتنے ہی لوگ بیمار ہیں جو آپ کے اس اجتماع میں شریک نہیں ہو سکے۔ مولانا محمد عبدالعزیز صاحب، نائب امیر جماعت اسلامی ہند جو حلقہ آندھرا پردیش کے امیر حلقہ رہے، جب حلقۂ آندھرا بنا برسہا برس تک اس علاقہ میں اللہ کے بندوں تک اللہ کا پیغام پہنچانے کے لیے اس بندۂ خدا

نے، بندۂ خلوص ومحبت نے اپنی کوشش جاری رکھی، کل ہی ان کا آپریشن ہوا قلب کا کہ وہ ہوش میں آ گئے اور صحت کی طرف لوٹ رہے ہیں، الحمدللہ۔ جو لوگ گزر چکے ہیں ہم ان کے لیے مغفرت کی دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی نصرت کو ہمارے شاملِ حال کرے، ہماری اس آواز کو جو کمزور سی آواز ہے طاقتور وتوانا آواز میں بدل دے۔ یہ صدا، یہ صدائے ربانی اس ملک کے ایک ایک آدمی تک پہنچے۔ بچے بوڑھے جوان تک، کنیا کماری سے لے کر کشمیر تک، پورے ہندوستان کو میرا پیغام پہنچے، خدا کے پیغام سے بے خبر بندوں تک خدا کا پیغام پہنچے۔

اے بندو! جو خدا کے پیغام پر ایمان رکھتے ہو، اٹھو اور اس پیغام کو پہنچاؤ، اللہ تعالیٰ آپ کی اور ہماری مدد فرمائے اور قبول فرمائے۔

(خطبات امرائے جماعت اسلامی ہند، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی)

زادِ راہ

بمناسبت منطقائی اجتماع عام حلقہ آندھرا پردیش

منعقدہ وجے واڑہ، 18 جنوری 2000ء

محترم ذمہ داران مرکز، ذمہ داران حلقہ، ارکان جماعت، مرد وخواتین، کارکنان تحریک اور رفقاء عزیز، نوجوانو اور پیارے بچو!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا یہ تین روزہ اجتماع مختلف پروگراموں کو روبہ عمل لاتے ہوئے اب اختتام کو پہنچ رہا ہے۔ آندھرا پردیش کا یہ اجتماع کئی برسوں کے بعد منعقد ہوا ہے اس لحاظ سے یقیناً منفرد ہے کہ اس میں شرکاء کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ریاست آندھرا پردیش واڑیسہ کے مختلف مقامات سے ہزاروں کی تعداد میں آپ لوگ جمع ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ کر انتہائی خوشی ہوتی ہے اور خوشی کے اس موقع پر سب سے پہلے ہم اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتے ہیں اور وہی ہمارے شکر کا اور شکریہ کا حق دار اور مستحق ہے۔ اس کا شکر ہم پر فرض اور واجب ہے۔ ہمیں اس کا شکر بجالانا چاہیے، اس کے ساتھ وہ تمام لوگ جنھوں نے اس اجتماع کے انعقاد کے سلسلے میں ہمارے ذمہ داروں اور کارکنوں کا تعاون کیا۔ ہمارے ہندو بھائیوں نے، شہر کے لوگوں نے جس کا ذکر ابھی ناظم اجتماع نے تفصیل سے فرمایا ہم ان کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جو لوگوں کا شکریہ نہیں ادا کرتا وہ خدا کا بھی شکر ادا نہیں کرتا۔ مومن دنیا کا شریف ترین انسان ہوتا ہے اور ہونا چاہیے۔

اس اجتماع کو اختتامی طور پر مخاطب کرتے ہوئے اور آپ کو رخصت کرتے ہوئے کچھ باتیں میں کہنی چاہتا ہوں۔ کچھ باتیں وہ ہیں جو آئندہ کام کرنے کے سلسلے میں ضروری ہیں

اور کچھ باتیں وہ ہیں جن کے اصلاح کی ہمیں فکر ہونی چاہیے۔

حضرات! ہمارے سامنے دعوت ہے بندگیِ رب کی اور بندگیِ رب کی یہ دعوت ہم ملک کے تمام عوام تک پہنچانا چاہتے ہیں اور پہنچانے کی ہماری ذمہ داری ہے اور ہم پر اس کی ذمہ داری ہے جو اس پر ایمان رکھتا ہے اگر چہ یہ دعوت تو سارے انسانوں کے لیے ہے لیکن ہم نے اس کو اپنے ملک کے 104 کروڑ انسانوں تک محدود کر رکھا ہے۔ اس کو اچھی طرح اپنے ذہن میں رکھیں۔ دوسری بات یہ دعوت کسی ایک طبقہ کے لیے نہیں ہے، کسی فرقہ اور گروہ کے لیے نہیں ہے سارے انسانوں کے لیے ہے۔ دعوت کا کام کرتے ہوئے اپنے ذہن میں اس حقیقت کو پوری طرح محفوظ رکھیں۔ بھولیں نہیں کہ دعوت کسی فرقہ کی دعوت نہیں۔

اس دعوت کے سامنے مقصد کے طور پر یہ نہیں کہ کسی گروہ کسی خاص زبان بولنے والے یا کسی خاص فرقہ کے لوگوں کی حکومت کا قیام بس اس کے سامنے ہے ہرگز نہ سمجھیں۔ یہ خدا کا پیغام ہے جو خدا کے بندوں تک پہنچانا ہے، اس کو اچھی طرح اپنے ذہن میں رکھیں۔ دوسری بات یہ کہ آپ کا نصب العین اللہ کے دین کی اقامت ہے۔ ترتیب اس کی یہ ہے کہ خدا کا پیغام خدا کے بندوں تک پہنچایا جائے اور جوں جوں خدا کے بندے اس پیغام کو مان کر سمجھ کر اپناتے چلے جائیں، مانتے چلے جائیں اور اسی کی ہدایت کی روشنی میں اپنی زندگی کی تعمیر کا ارادہ کر لیں تو پھر افراد، خاندان اور سماج تک بات پھیلتی ہے اور ایسا سماج پوری طرح قائم ہو جائے تو اس سے ریاست ابھرتی ہے۔ یہ ہے اقامتِ دین، اس کی ترتیب ذہن میں رکھنی چاہیے۔ بچپن کا کام جوانی میں نہیں کرنا ہے اور جوانی کا کام بڑھاپے میں نہیں کرنا ہے۔ ایک بچہ پیدا ہو تو اس کی ضروریات جو ہو سکتی ہیں موت تک وہ سب اہم ہیں لیکن اس وقت وہ بچہ ہے تو بچہ کی جو ضرورتیں ہیں وہ پوری کیجیے۔ اس کی شادی کے بارے میں ابھی سوچنے کی زحمت گوارہ نہ فرمائیں۔ بچہ بچہ ہے اس کے لیے دودھ کا انتظام کیجیے۔ وہ مکھی بھی ہلا نہیں سکتا اسے ماں کی ضرورت ہے ایسی خدمت کرنے والی کی جو اپنے بچہ کو محبت میں سب کچھ کرتی ہے رات کی نیند دن کا چین آپ بھی اس کا خیال رکھیں۔ دعوت آغاز میں اور دعوت انتہا میں یہ جو سارے مراحل ہیں یکے بعد دیگرے آتے چلے جاتے ہیں اور آپ کو اس تک جانا ہے۔

آخری بات یہ کہ آخرت کی فلاح، اقامتِ دین کا اصل مقصود ہے۔ اسی لیے جماعت اسلامی کے دستور میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ جماعت اسلامی ہند کا نصب العین اقامت دین ہے۔ اس کا حقیقی محرک اللہ تعالیٰ کی رضا اور آخرت کی فلاح و کامیابی ہے، تو ہم اس دعوت کی طرف آگے بڑھیں۔ دین کی صفائی کے ساتھ، ارادے کی پاکیزگی کے ساتھ، نیت کی صفائی وستھرائی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے سوا اور آخرت کی ہمیشہ کی زندگی کی کامیابی کے سوا کوئی محرک نہ ہو، کوئی مقصد نہ آغاز میں نہ انجام میں، نہ ابتدا میں نہ انتہا میں۔

اول خدا کی رضا سے ہم چلیں اور خدا کی رضا تک ہم پہنچیں۔ اول بھی خدا کی رضا اور آخرت میں بھی خدا کی رضا، اس کو ذہن میں صاف رکھیے۔ ورنہ خدا کی خوشنودی سے محروم ہو کر کی جانے والی جدو جہد اس کی نصرت و تائید سے محروم رہ جائے گی اور حاصل کچھ نہیں ہوگا۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم
نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

اس بات کو اچھی طرح یاد رکھیں۔ **انما الاعمال بالنیات**. ''اعمال کی بنیاد نیت پر ہے۔'' اس کو ٹھیک رکھیے، درست رکھیے، شہرت، ناموری، لیڈری، نیتا گری اور ایک مقام (Status) کو حاصل کرنا ان میں سے کوئی چیز نہیں۔ محض اللہ کی رضا کے لیے کوشش کیجیے کہ شیطان اخلاص کے اس اہم ترین گراں قدر گراں مایہ خزانہ پر حملہ کر کے اس کو لوٹ نہ لے اور اس سے محروم کر کے کہیں ہماری آخرت کو برباد نہ کر دے۔ یہ بات اچھی طرح سے یاد رکھیں، فرض بھی کر لیجیے کہ آپ اقامتِ دین میں کامیاب ہو گئے، لیکن اللہ کی رضا کے سوا کوئی دوسری چیز کام کر رہی ہو تو چاہے اس کا فائدہ دنیا کو ہوا اور ہوگا لیکن ہمیں تو بس جہنم ہی ملے گی۔ کیا ہمیں وہ حدیث یاد نہیں آئی، جس میں ایک عالم قرآن کو، خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے سخی کو اور راہِ خدا میں جان قربان کر دینے والے مجاہد کو محض اس لیے جہنم میں جھونکنے کا فیصلہ کیا گیا کیونکہ اس کا مقصد عالم قرآن کہلانا تھا، سخاوت اس لیے کی کہ لوگوں میں سخاوت کے چرچے مقصود تھے، جان اس لیے قربان کی تھی کہ لوگ دنیا میں اس کی بہادری کے چرچے کریں۔ حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق ان میں تین آدمیوں کا معاملہ پیش ہوگا یہ لوگ اپنی بات رکھیں گے تو

اللہ کہے گا جھوٹ کہتا ہے تو نے، اس لیے جنگ کی کہ لوگ تجھے بہادر کہیں، اس لیے سخاوت کی کہ لوگ تجھے سخی کہیں، اور اس لیے تو نے علم سیکھا سکھایا کہ قرآن کا عالم کہا جائے اور وہ کہا جاچکا، یہاں تیرے لیے کچھ نہیں اور حضورﷺ نے ارشاد فرمایا: ان تینوں کو منھ کے بل گھسیٹ کر جہنم کی طرف لے جایا جائے گا اور جہنم کی آگ ان تینوں سے جلائی جائے گی۔ اللہ اکبر!

بھائیو! نیت کی حفاظت کرو، آپ کے ہاتھوں دین قائم بھی ہو جائے لیکن نیت ہماری بخیر نہ رہے تو اللہ کی رضا تو کیا حاصل ہوگی جہنم سے اپنے آپ کو بچا نہیں پائیں گے۔ خدا کی کبریائی بیان کرو اپنی بڑائی نہیں۔ کبر و تکبر سے بچیئے کسی طرح کی بھی کسی حرکت سے، کسی چال سے، کسی رفتار سے، کسی گفتار سے یہ ظاہر نہ ہو کہ اپنے کو بہت بڑی چیز سمجھے ہوئے ہیں۔ یاد رکھیں حضورﷺ نے فرمایا، جس کے دل میں رائی برابر غرور ہوگا وہ جنت میں داخل نہیں کیا جائے گا۔ کبر سے پرہیز کریں، اپنے کو شکر کی راہ پر ڈالیں، اللہ کے آگے عاجزی وانکساری۔ اس کی بندگی، اس کی عبادت، انسانوں کی خدمت اپنے کو کوئی بڑی چیز نہ سمجھیں، کوئی بڑا کام آپ سے انجام پا رہا ہو تو خدا کا شکر ادا کیجیے کہ اس نے یہ کام آپ سے لیا، یہ مقام شکر ہے مقام کبر نہیں، اظہارِ تشکر کیجیے اظہارِ تکبر نہیں۔ بشمول اپنے نفس آپ سب سے مخاطب ہو کر اس خطرہ سے آگاہ کرتا ہوں کہ کبر سے اپنے کو بچائیں۔

حضرات! اقامتِ دین کا کام عظیم الشان کام ہے۔ اس زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے اس سے بڑا کوئی کام نہیں ہے اور واقعی اس سے مشکل کوئی کام نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس کام کی عظمت کا اندازہ کیجیے کہ اس کے لیے انبیاء کرام کو مبعوث فرمایا اور کیا چاہیے اس کی بڑائی اور عظمت جاننے کے لیے اور پیغمبر آخر الزماں سرورِ کائنات حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰﷺ اللہ کے دین کے آخری پیغمبر و داعی تھے۔ اس عظیم کام کو انجام دینے کے لیے آپ اٹھے ہیں اس لیے سمجھ لیجیے کہ اگر اس غلط فہمی یا خوش فہمی کا شکار ہیں تو اپنے آپ کو اس سے پاک کر لیجیے۔ ادھر آپ نے دعوت شروع کی اور کل منظر ہی بدل جائے گا، زمین و آسمان بدل جائے گا، معاشرہ بدل جائے گا۔ ماحول بدل جائے گا۔ نہیں! 23 سال جب پیغمبر آخر الزماںﷺ کو لگے تو آپ کے لیے کتنے برس بھی لگ جائیں کم ہے، اس لیے یہ بات سامنے رکھیے اور ہر شخص انفرادی طور

پر اس بات کو سامنے رکھے کہ مجھے زندگی کے آخری لمحے تک یہ کام کرنا ہے اور کرتے چلے جانا ہے، چاہے آنکھوں کے سامنے میں اس کام کا نتیجہ دیکھ سکوں یا نہیں۔ سالہا سال تک یہ کام ہوتا رہے گا جدوجہد کرنا ہماری اور آپ کی ذمہ داری ہے نتیجہ کی ذمے داری ہماری نہیں۔ یاد رکھئے یہ مسلسل کام ہے جو لوگ یہ سمجھ کر یا اس خوش فہمی کا شکار ہو کر آتے ہیں کہ ادھر ہم نے کام شروع کیا ادھر 10-8 سال کے اندر نتیجہ آئے گا۔ اور نتیجہ سامنے دکھائی نہ دے تو مایوسی کا شکار ہو جائیں گے۔ راہ چھوڑ دیں گے، منزل دور ہو جائے گی اور پیر سست پڑنے لگیں گے۔ چنانچہ کہنے والے نے صحیح کہا ہے اور ایسے ہی موقع کے لیے کہا ہے: ایک لمبی مدت تک چلتے چلتے تکان طاری ہو جاتی ہے۔ 60 سال سے جماعت اسلامی یہ کام کر رہی ہے اور 1948ء آزادی کے بعد سے حساب کیا جائے تو 53 سال گزر چکے ہیں۔ چون واں (54) سال چل رہا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ آگے چلنے والے آپ کے رہنما یا رہنماؤں کا آپ کی کیفیت دیکھ کر یہ کہنا کہ ؎

اندھیری رات، تھکی ہمتیں، گراں منزل
سلامتی کی دعا مانگ کارواں کے لیے

ہمتیں پست ہو جائیں، ارادے ٹوٹ کر بکھر جائیں، رات زیادہ تاریک اور سیاہ ہو جائے، گہری ہو جائے تو دعا مانگنا ہے، سلامتی کی دعا مانگ کارواں کے لیے۔ یہ وقت دعا ہے دوستو! کہنے والے نے یہ بات کہی، اچھا شعر کہا ہے ؎

ہجر کی رات ہے طویل، وصل کی صبح دور ہے
جذبہ بھی ہے نا تمام خام ابھی شعور ہے

ہم اپنا جائزہ لیتے ہیں تو بات سامنے آتی ہے۔ سب سے تو حسن ظن رکھتا ہوں لیکن جب سے آیا ہوں دیکھ رہا ہوں کہ اپیلیں یہاں سے ہوتی ہیں، یہ نہیں کہ اثر نہیں ہوتا اثر ہوتا ہے لیکن تاکید کے باوجود چلت پھرت بازار کا انداز ہاں ہاں بے شک ضرورتیں ہوتی ہیں، فطرت کی پکار۔ ضرورت یہ الگ بات ہے لیکن عموماً لوگ اس کو میلہ سمجھ کر آئیں۔ میلہ کی طرح شریک ہوں اور میلہ کی طرح سیر کرتے رہیں تو یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ اس کیفیت کو بدلیں، یہ کوئی اچھی علامت نہیں کہ چند گھنٹے ہم یکسو ہو کر بیٹھ نہیں سکتے، کھڑے کیا رہیں گے۔ نظم وضبط اور

ڈسپلن کے بغیر یہ راہ طے نہیں ہو سکے گی، کارواں منزل کی سمت زیادہ دور تک نہیں چل پائے گا اگر جذبات پر، اپنے آپ پر ہمارا قابو نہ ہو، ہمارے اندر اتنا ڈسپلن نہ آئے۔

دوستو اور عزیزو! اقامت دین کا کام ہمیں کرنا ہے۔ ہندوستان کے کروڑوں عوام تک دعوت پہنچانا ہے اور دعوت پہنچائے بغیر خلافت کا قیام خواب ہوگا۔ حسین، پر کشش، دلچسپ، دل آویز، حسین خواب، لیکن وہ خواب ہی رہے گا شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا۔

دعوت کا مرحلہ طویل سے طویل ہوتا ہے آپ کو پوری کوشش اس بات کی کرنی چاہیے کہ خدا کا پیغام خدا کے بندوں تک بے لاگ طریقے سے، صاف طریقے سے پہنچے۔ ہر طرح کی نفرتوں اور تعصّبات سے بلند ہو کر خدا کے بندوں سے پیار کرتے ہوئے خدا کی محبت سے سرشار ہو کر خدا کی اطاعت و بندگی کرتے ہوئے خدا کے بندوں تک آپ کو جانا ہے محبت کے ساتھ جانا ہے شفقت کے ساتھ جانا ہے۔ حضور ﷺ سے ہم نے دعوت ہی نہیں، داعیانہ کردار بھی لینا ہوگا، داعیانہ جذبات بھی لینے ہوں گے۔ داعیانہ احساسات بھی لینے ہوں گے۔ ایک سچا داعی بننا ہوگا، ہم کوئی مفکر اور فلسفی نہیں کہ نظریہ پیش کر دیں اور لوگ مطمئن ہو گئے تو ہم سمجھ جائیں کہ رائے عامہ ہموار ہو گئی، نہیں؟ یہ بندگیٔ رب کی دعوت ہے، دل کی گہرائیوں سے اس کو بلند ہونا چاہیے اور لوگوں تک اس کو پہنچا کر دلوں تک دستک دینا ہے۔

دوستو! بات آتی ہے آزمائش کی، آپ نے لٹریچر میں پڑھا ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس سلسلے میں بھی دو تین باتیں صاف کر دوں۔ پہلی بات یہ ہے کہ خوابوں کی دنیا سے اتر کر زمین پر آیئے، زمین پر کھڑے ہو کر زمین پر نظر ڈالیے، زمینی حقائق کو تسلیم کیجیے، حقیقت پسندانہ ذہن اور نقطۂ نظر ہو۔ جو لوگ ہواؤں میں پرواز کرتے رہتے ہیں وہ ہوا ہی میں اڑتے رہیں گے اور ہوا انہیں اڑا دے گی۔ فضاؤں میں نہیں بات کہی جاتی ہے خدا کی راہ ابتلا و آزمائش کی راہ ہے۔ میں یہ بات اپنے احباب کو یاد دلانا چاہتا ہوں اور اس راہ پر چلنے والے تمام راہیوں کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ابتلاء آزمائش کا ایک پہلو ہے۔ مصیبت و مشکلات یہ بھی اس راہ میں پیش آتے ہیں لیکن آزمائش صرف مشکلات ہی کی نہیں ہوتیں آسائشیں، سہولتیں، نعمتیں، نعمتوں کی برسات یہ بھی آزمائش ہے۔ کیا حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی زندگی کو ہم بھول گئے ہیں۔ مسلسل تین

خلفاء کے دور میں کوڑوں کی برسات کی گئی ان پر کہ قرآن مخلوق ہے یا نہیں؟ تم کیا مانتے ہو؟ قرآن کو اللہ کا کلام مانتے تھے اہلِ سنت۔ معتزلہ کا عقیدہ تھا نہیں قرآن مخلوق ہے جیسی اور بھی مخلوق ہے۔ یہ بھی مخلوق ہے اہلِ سنت کہتے تھے نہیں، یہ اللہ کا کلام ہے۔ تین خلفاء کے دور میں مسلسل پیٹھ پر کوڑے برستے رہے اور اس آزمائش کے دور سے جب نکل آئے تو کہا کرتے تھے اللہ ابن الہیثم پر رحم فرما اس کی مغفرت فرما۔ صاحبزادے نے پوچھا تھا حضرت یہ کون ہے جس کی ہمیشہ مغفرت کی آپ دعا کرتے رہتے ہیں تو حضرت نے کہا یہ بغداد کا مشہور ڈاکو ابن الہیثم تھا۔ جب مجھے خلیفہ کا سپاہی پکڑ کر لے جا رہا تھا تو ایک شخص آ گیا جس کو میں جانتا نہ تھا کہا اے امام احمد! میں بغداد کا مشہور ڈاکو ابن الہیثم ہوں اور ابھی بغداد کی جیل سے چھوٹ کر آیا ہوں۔ میں نے اپنی پیٹھ پر دس ہزار سے زائد کوڑے کھائے ہیں اور اتنے سال کی قید برداشت کی ہے مجھے معلوم ہے کہ خلیفہ کے سپاہی آپ کو کیوں لے جا رہے ہیں لیکن مجھے افسوس ہوگا کہ اپنے نفس کے لیے میں نے جتنی تکلیف برداشت کی ہے، کوڑوں کی برسات اپنی پشت پر برداشت کی ہے اگر آپ حق کے لیے اتنی تکلیف برداشت نہ کر سکیں۔ اللہ اکبر! یہ بھی آزمائش ہے اور یہ بھی آزمائش ایک خلیفہ اپنے باپ کے بعد تخت خلافت پر بیٹھا تو امام احمد بن حنبل کو بلایا اور ان کے ارادوں کو کمزور کرنے اور ان کے رخ کو موڑنے کے لیے اس نے کہا آؤ میرے تخت پر بیٹھو میرے بیٹے کی طرح پھر انعام واکرام کی بارش کردی، سارے دربار میں ان پر اس قدر زر و مال نچھاور کیا گیا کہ ڈھیر لگ گیا۔ اس وقت امام احمد بن حنبل کہتے تھے اے اللہ یہ آزمائش ان کوڑوں کی آزمائش اور جیل کی آزمائش سے زیادہ سخت ہے۔ کتنے لوگ پتھریلی زمین پر، سنگلاخ زمینوں پر دوڑتے نکل جاتے ہیں لیکن زر و مال کی کیچڑ میں پھسل جاتے ہیں۔

آزمائش ایک ہی طرح کی نہیں ہوتیں اس لیے ذکر ایک ہی طرح کی آزمائش کا نہ کیجیے۔ آزمائش کو دعوت نہ دیجیے لیکن آزمائشوں میں وہ ڈالنا چاہے تو وہی صبر بھی دے گا، استقامت بھی دے گا، اسی کے آگے جھکیے، اسی سے دعا مانگیے اور اسی سے استعانت چاہیے۔ وہی ڈالے گا آزمائشوں میں تو وہی نکالے گا بھی۔ ہم آزمائشوں کو دعوت نہ دیں۔ کچھ لوگ اپنے عزم و ہمت کے اظہار کے لیے آ بیل مجھے مار کہتے ہیں۔ یہ کوئی دانشمندی ہے نہ کوئی جرأت، یہ حماقت ہے۔

میں یہ کہوں گا کہ آپ حالات کی سختی اور شدت کو دیکھ کر مایوس نہ ہوں، مرعوب نہ ہوں، مشتعل نہ ہوں۔ جو حریف طاقتیں چاہتی ہیں کہ آپ مشتعل ہو جائیں غصہ میں، پھر جب آپ غصہ میں آجاتے ہیں تو آپ ان کا کام بھی اپنے ہاتھوں سے کرنے لگتے ہیں۔ جذبات میں وہ کرنے لگتے ہیں جو اپنے مقصد کے لحاظ سے صحیح اور درست نہیں ہوتا۔ ہمیں نقصان پہنچانے والا ہوتا ہے اور مقاصد پورے ہوتے ہیں ان کے جو ہمیں مشتعل کر دیتے ہیں۔ مشتعل نہ ہوں، معطل نہ ہوں، ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھے نہ رہیں۔ مایوسی مرعوبیت پیدا کرتی ہے۔ مرعوب آدمی معطل ہو کر رہ جاتا ہے۔ یا پھر جوش میں آتا ہے تو مشتعل ہو جاتا ہے۔ ایک مقصد کو ٹھیک طور سے سمجھ کر اس کو اپنی زندگی کا مقصد بنائیے، اس کے لیے متحرک ہوئیے، اس کے لیے مستعد رہیے، اس کے لیے جم کر کام کیجیے۔ یہ چھ سات میموں (م) کو یاد رکھیے:

مایوس نہ ہوں۔

مرعوب نہ ہوں۔

مشتعل نہ ہوں۔

معطل نہ ہوں۔

بے مقصد زندگی نہ گزاریں۔

متحرک رہیں۔

اور مستعد ہو کر کام کرتے رہیں۔

پھر میں آپ سے عرض کروں گا کہ اپنی کمزوریوں کی اصلاح کی طرف بھی آپ کو توجہ دینی ہے۔ ایک طرف تو دعوت پہنچانے کے کام میں پوری قوت سے لگ جائیے، ملت اسلامیہ کو اس کا مقام یاد دلائیے، اسے داعیانہ مقام کا شعور دلائیے اور بندگانِ خدا کے درمیان اپنے کو اور ان کو جہنم کی آگ سے بچانے کے لیے خدا پرستی کی دعوت دیجیے، ہر سطح پر پھر اپنی اصلاح کی فکر کیجیے اس طرف سے غافل نہ رہیے۔ آدمی کو دوسرے کی آنکھوں میں گرا ہوا پڑا ہوا تنکا تو دکھائی دیتا ہے اور اپنی آنکھ میں بڑی ناٹ ایک شہتیر پڑ جائے تو بھی دکھائی نہیں دیتی۔ اپنی کمزوریوں پر نظر کیجیے، جو اپنی کمزوریوں سے غفلت برتتے ہیں وہ مجموعہ بن جاتے ہیں ساری کمزوریوں

کا۔ ہمیں اپنا جائزہ بڑی بے رحمی کے ساتھ لیتے رہنا چاہیے اور کمیوں، خامیوں، کم زوریوں اور غلطیوں کی اصلاح کی فکر کرنی چاہیے۔ اللہ کی کتاب اور رسول ﷺ کی سنت کے مطالعہ پر توجہ دیجیے صرف اخبارات و رسائل ہی سب کچھ نہیں ہیں۔ اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت سے جو یقین کی روشنی، ایمان کی گرمی اور عمل کا جذبہ پیدا ہوگا وہ کہیں سے نہیں مل سکتا۔ پھر جماعت اسلامی کے لٹریچر کا گہرا مطالعہ کریں، آپ کے اندر نصب العین کا صحیح شعور، دعوت کا، اپنے داعی ہونے کا پیدا ہوگا۔ گہرا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے صرف جذباتی لگاؤ کافی نہیں ہے اور اس کے مطابق اپنا کردار ہو۔ خدا کی طرف بلانے والے سب سے زیادہ خدا کی بندگی کرنے والے ہوں اور خدا کے آگے جھکنے والے ہوں:

التآئبون العابدون الحامدون السآئحون الرّاکعون السّاجدون الاٰمرون بالمعروف والناھون عن المنکر. (التوبة:112)

''اللہ کی طرف بار بار پلٹنے والے، اس کی بندگی کرنے والے، اس کی تعریف کے گن گانے والے، اس کی خاطر زمین میں گردش کرنے والے، اس کے آگے رکوع و سجود کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے، بدی سے روکنے والے۔''

کیا تصویر کھینچی ہے قرآن نے اہلِ ایمان کی۔ خدا کی بندگی کی طرف دعوت دینے والے خود خدا کی طرف نہ دوڑیں تو ایک مذاق ہوگا۔ اپنی زندگی کو تضاد اور تناقص سے پاک کیجیے، قول و فعل میں یکسانیت پیدا کیجیے۔ نمازوں کا اہتمام کیجیے۔ جماعتوں کا اہتمام کیجیے۔ فرائض کے علاوہ نوافل کا اہتمام کیجیے۔ اللہ سے اپنے تعلق کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کیجیے اور آخرت کی سچی فکر اپنے اندر پیدا کیجیے۔ انسان کا حال یہ ہے ''قدم سوئے مرقد نظر سوئے دنیا'' جا رہا ہوں قبر کی طرف، قدم بڑھ رہے ہیں۔ قدم ایک طرف نظر ایک طرف، قدم سوئے مرقد، نظر سوئے دنیا، کدھر دیکھتا ہے کدھر جا رہا ہے۔

مومن کی زندگی بقول حفیظ میرٹھی کے ایسی ہونی چاہیے ؎

حیات جس کی امانت تھی اس کو لوٹا دی
میں آج چین سے سوتا ہوں پاؤں پھیلا کر

علامہ اقبال نے یہی بات کہی فارسی میں۔

نشان مردِ مومن باتو گویم

میں تو صرف کہوں بتاؤ مردِ مومن کا نشان کیا ہے؟ چوں آید تبسم برلب اوست، جب موت آتی ہے تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی ہوتی ہے۔ اللہ اللہ تسلیم و رضا۔ بس میں آپ سے یہی بات کہتا ہوں آپ لوٹئے۔ باتیں کم کام زیادہ کیجیے۔ فکر کیجیے اپنے اصلاح کی، لوگوں کی اصلاح کے کام میں ایسے نہ ڈوب جایئے کہ اپنی اصلاح سے غافل ہو جائیں۔ سمجھیں کہ بس دنیا ہی اصلاح کے قابل ہے ہم تو مصلح ہیں۔ یہ بڑی بات میٹھی ہوتی ہے اس غلط فہمی کا شکار نہ ہویئے۔ سب سے زیادہ فکر اپنی اصلاح کی کیجیے گا اور ہمیں اپنی زندگی کا حساب خود دینا ہے اور اس کا جواب ہمیں خدا کے حضور دینا ہوگا۔ اس کی فکر کیجیے۔

حضرات! آخر میں ان ہی باتوں کا مشورہ دیتے ہوئے آپ سے کہوں گا کہ رات کا اندھیرا، چھائی ہوئی ظلمت، وقت کے حالات، راہ کی دشواریاں یہ سب کچھ اپنی جگہ، اللہ سے اپنا تعلق بڑھایئے۔ عزم و ہمت کے ساتھ، حکمت کے ساتھ اور ہمت کے ساتھ آگے بڑھئے۔ نہ ہمتیں ٹوٹیں اور کمزور ہوں، نہ حکمت کے نام پر بزدلی دکھائیں، نہ حکمت کے نام پر حماقت کریں۔ عزم و ہمت چیز دیگر است حماقت چیز دیگر است، حکمت الگ چیز ہے بزدگی الگ چیز ہے ان دونوں کا لحاظ اور فرق ملحوظ۔

ہمت سے کام لیں، حکمت کے ساتھ چلیں، حکمت سے کام لیں لیکن ہمت کے ساتھ چلیں۔ ہمت بھی چاہیے اور حکمت بھی، عزم و حوصلہ بھی چاہیے اور شجاعت و بہادری بھی۔

میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم پر رحم فرمائے، مجھے اس موقع پر ان بچوں کی دعا یاد آتی ہے۔ کرناٹک میں ایک کالج ہے وہاں کے جلسہ میں میں نے ان بچوں سے دعا سنی۔ آنکھیں بھیک گئیں۔ وہ طویل نظم تھی دو تین شعر ہی سن لیجیے۔ کہا:

تیری قدرت میں کیا کچھ نہیں ہے
بس ہمیں جذبہ زندگی دے
سر اٹھائے ہیں ہر سو اندھیرے

سب چراغوں کو اب روشنی دے
عزم محکم عطا کر خدایا
حوصلوں کو نئی زندگی دے

آخر میں، میں اللہ سے دعا کرتا ہوں اپنے لیے، آپ کے لیے اوران سارے لوگوں کے لیے، ہماری کوتاہیوں کو دور فرمائے۔ ہماری کمزوریوں کو دور فرمائے۔ دور کرنے کی توفیق دے۔ ہمارے گناہوں کو معاف کردے، ہمیں بخش دے مولیٰ۔ اپنے نصرت کو ہمارے شامل حال فرما۔ مولا ہمیں ظالموں کے ظلم سے، شریروں کے شر سے، مفسدوں کے فساد سے، مفتنوں کے فتنے سے محفوظ رکھ۔ ہم کمزوروں کو ظلم کی سختیوں کی آزمائشوں میں نہ ڈال مولا۔ ہم کو بندگی کی توفیق عطا فرما۔ ہمارے مردمومن کی مغفرت فرما۔ ہمارے بیماروں کو صحت کاملہ و عاجلہ عطا فرما۔ ہماری نئی نسل کو سچا مخلص اور اپنا وفادار مومن بنادے۔

(خطبات امرائے جماعت اسلامی ہند، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی)

جماعت اسلامی کی ترجیحات

"انسان پر اس کی زندگی کا اصل مقصد واضح نہیں ہے یہی اصل مسئلہ ہے باقی سارے مسائل اسی مسئلہ کی پیداوار ہیں"

(جماعت کی چار سالہ میقات برائے اپریل 1999 تا مارچ 2003 کے لیے امیر جماعت منتخب کیے جانے پر مدیر معاون ماہنامہ رفیق منزل طارق حسین فلاحی کی آپ سے ایک ملاقات۔ مرتب)

☆مجلس نمائندگان نے اس ملک میں پچاسوں برس سے اسلام اور احیائے اسلام کے لیے کوشاں جماعت، جماعت اسلامی ہند کی قیادت کے لیے تیسری بار آپ کا انتخاب کیا ہے۔اس عظیم اور اہم ذمہ داری کے عائد ہونے پر آپ کے احساسات وتأثرات کیا ہیں؟

امیر جماعت: دیکھئے ہم اپنے احساسات کیا بتائیں۔ہم چاہتے تھے اور ہماری خواہش تھی کہ اس کام کے لیے اور موجودہ ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے جوان العمر، جوان العزم اور بہت زیادہ اونچی اور بڑی صلاحیتوں کے حامل شخص کا انتخاب ہوتا۔ایسے افراد ہمارے درمیان کمیاب ضرور ہیں مگر نایاب تو نہیں۔میرے خیال میں زیادہ بہتر ہوتا کہ ہمارے رفقاء ایسا کرتے۔ہم نے بھی یہ بات لوگوں کو بتائی، توجہ دلائی لیکن بہر حال ان کا یہ فیصلہ تھا، بس ہم نے بھی اللہ کے بھروسے اسے اٹھالیا ہے۔اللہ ہی اس عظیم ذمہ داری کو ادا کرنے کی طاقت، ہمت اور توفیق سب کچھ دینے والا ہے۔

☆ابتدا ہی سے آپ تحریک اسلامی سے وابستہ ہیں۔ارکان وکارکنان نیز وابستگان کا آپ نے بہت قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ان تجربات ومشاہدات کی بنیاد پر تحریک کی رفتار کار

کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

امیر جماعت: ہاں! اس مقصد کے لیے جس طرح کے جس معیار کے کام کرنے والوں کی ضرورت ہے ہم اپنے آپ کو اس لحاظ سے یا اس کے مطابق نہیں پاتے ہیں بلکہ اس سے نیچا ہی پاتے ہیں۔ فکر بھی ہے اور کوشش بھی ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس کام کا اہل بنائیں۔ ظاہر ہے اسی لحاظ سے ہمارے کام کی رفتار بھی ہے۔ بہت زیادہ تیز نہیں مگر بالکل سست بھی نہیں ہے۔ اوسط درجے کی رفتار سے ہم چل رہے ہیں۔ موجودہ حالات کے تناظر میں اس عظیم ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے مستعدی اور سرگرمی سے کام کرنے کی ضرورت ہے، اس کے لحاظ سے رفتار کو بڑھانے کی سعی کرنی ہوگی۔

☆ ملک کے سیاسی حالات بہت تیزی سے بدل رہے ہیں۔ موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ارباب اقتدار ملک کو کدھر لے جائیں گے۔ ان حالات میں جماعت اسلامی ہند کی اولین ترجیح کیا ہوگی؟

امیر جماعت: پورے ملک کے اندر غیر یقینی صورت حال ہے اور سچی بات یہ ہے کہ ملک کے عوام کو واضح طور پر بہت منصوبہ بند انداز میں فیصلہ کرنا ہوگا اور فیصلہ کرنے کی ضرورت ہے کہ انہیں جانا کدھر ہے اور کیا بن کر رہنا ہے چونکہ آزادی کے فوری بعد ملک کے رہنماؤں نے اپنی دانست میں جو کچھ بھی مفید سمجھا تھا اس کو انہوں نے ایک دستور کی شکل میں کر دیا، اس کے مقاصد متعین کیے، لائن بتائی۔ لیکن یہ ان کا فیصلہ تھا عوام کا کوئی شعوری فیصلہ نہیں تھا اور اب پچاس سال کے گزرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ملک کے لوگ فیصلہ کریں کہ انہیں کدھر جانا ہے اور کیا بن کر رہنا ہے۔ گویا اس وقت ہمارا ملک ایک فیصلہ کن دور سے گزر رہا ہے۔ جہاں ہر کوئی کوشاں ہے کہ ملک کو اپنی پسند کے رنگ میں رنگے اور اپنی پسند کی منزل کی طرف لے جائے اور بلاشبہ ایسا کرنے کا حق سب کو حاصل ہے لیکن اس حق کا ستعمال پرامن اور اخلاقی وآئینی ذرائع سے رائے عامہ کو ہموار کرتے ہوئے کیا جانا چاہیے نہ کہ طاقت یا زور زبردستی کے بل پر۔ جہاں تک جماعت اسلامی ہند کا تعلق ہے تو وہ اس ملک کے لیے ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے لیے یہ سمجھتی ہے کہ ان کے لیے صحیح رخ وہی ہو سکتا ہے اور وہی درست

بھی ہے جوان کے خالق و مالک کی مرضی اور ہدایت کے مطابق ہو۔لہٰذا ہماری کوشش یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک ان خدائی اور انبیائی تعلیمات کو پہنچایا جائے تاکہ لوگوں کو اس کی روشنی میں صحیح فیصلہ کرنے میں مدد ملے۔ دوسری بات اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جب تک امر حق اس ملک کی عوام پر واضح نہیں ہو جاتا اس وقت تک کم سے کم درجے میں ملک کے اندر ایسے حالات اور اس میں کارفرما نظام کو ایسا ہونا چاہیے جس میں آزادی سے سوچنے ،غور کرنے اور فیصلہ کرنے کا موقع حاصل رہے۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ ایسی فضا قائم رہے یہ متأثر نہ ہونے پائے۔

☆لوگ جماعت سے عملی سیاسی کاوشوں کی بھی توقع رکھتے ہیں؟ آپ کیا تبصرہ فرمائیں گے؟

امیر جماعت: بلا شبہ سیاست اور سیاسی عمل زندگی پر اثر انداز ہونے والا ایک عمل ہے اور آج کل تو سیاست ہی زندگی کا مرکز و محور بنی ہوئی ہے۔ بالخصوص ہندوستان اور مشرقی ممالک میں گویا سیاست ہی کے تحت پوری زندگی گھمائی جارہی ہے۔ حالانکہ سیاست ہی سب کچھ نہیں ہے۔ وہ زندگی کا ایک شعبہ ہے بلکہ اہم شعبہ ہے لیکن پوری زندگی سیاست تو نہیں ہے پھر یہ جو سیاسی عمل جس انداز سے یہاں پر انجام پا رہا ہے صحت مند نہیں ہے۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ اس کو صحت مند رخ دیا جائے اور یہ صحت مند رخ اسی وقت جا سکتا ہے جب کہ صحت مند افکار کا غلبہ ہو، صحت مند افکار لوگوں میں مقبول ہوں ،لوگ انہیں مانیں اور تسلیم کریں تو اس کے اثرات بھی خود بخود مرتب ہوں گے۔

☆میقات نو کی ترجیحات کیا ہوں گے؟ نیز ملک کے موجودہ صورت حال کے پیش نظر کارکنان سے آپ کی توقعات؟

امیر جماعت: ابھی تو نئی میقات کا آغاز ہوا ہے اور قریب میں ہونے والی مرکزی شوریٰ کے اجلاس میں تمام ضروری اور اہم امور پر غور کیا جائے گا ان شاء اللہ۔ جہاں تک کارکنوں سے توقعات کی بات ہے ابھی گذشتہ میقات میں جو کام ہو سکا ہے اس نے ہمارے کارکنوں کی فکر پر بھی اثر ڈالا ہے اور حوصلوں پر بھی، سابق کے مقابلے میں ان کے شعور میں نکھار آیا ہے

اور جذبہ عمل کو تقویت حاصل ہوئی ہے اور اس میں ابھار آیا ہے۔ان شاء اللہ آئندہ میقات میں توقع ہے کہ ان کی رفتار کار میں تیزی آئے گی۔

☆مولانا! حالیہ اجتماعات میں خواتین کی کثیر تعداد میں شرکت نے غور وفکر کے کئی نئے امید افزا زاویے دیے ہیں۔نئی میقات میں خواتین سے متعلق کیا کسی خصوصی پیش رفت یا خصوصی پروگرام کی توقع ہے؟

امیر جماعت: ہاں صاحب! ابھی جو ہمارے اجتماعات ہوئے حلقہ کیرالا سے لے کر باقی اور چار بڑے بڑے منطقہ وار اجتماعات مشرقی ہند، مغربی ہند، شمالی ہند، جنوبی ہند تو ان میں بہت بڑی تعداد میں خواتین شریک ہوئیں۔کیرالا میں تقریباً ساٹھ سے ستر ہزار اور دوسرے جو اجتماعات ہوئے کہیں 10/ہزار، کہیں 20/ہزار، کہیں 30/ اور کہیں 35/ہزار یہ بات تو آپ نے بہت صحیح کہی۔خواتین کا اتنی بڑی تعداد میں شرکت کرنا، یہ جوش وخروش اور یہ شوق اس نے گویا ہماری امنگوں اور ہمارے حوصلوں کو بہت بلند کیا ہے جب کہ اپنی بہنوں پر جتنی توجہ صرف کرنی چاہیے وہ ہم نہیں کر سکے تھے۔آئندہ اس کا مناسب لحاظ رکھا جائے گا۔ ہر طرح سے ان کی مدد اور رہنمائی کی جائے گی، ان شاء اللہ۔

☆اکیسویں صدی کی آمد آمد ہے۔کیا آپ نئے مسائل، نئے حالات اور نئے چیلنجز سے نبرد آزما ہونے کے لیے تحریک کی اسٹریٹجی میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں؟

امیر جماعت: دیکھئے اس طرح تو نہ جانے کتنی صدیاں گزر گئیں اور ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں سالوں میں بدل گئیں۔سن وسال تو گزرتے ہی رہتے ہیں اور انہیں گزرنا ہی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ زندگی ایک جوئے رواں اور بہتا چشمہ ہے کہیں اس میں ٹھہراؤ نہیں، حیات حرکت پذیر بھی ہے، تغیر پذیر بھی اور ترقی پذیر بھی۔ ٹھہراؤ اور سکوت کے معنی موت کے ہیں۔جس تحریک کو زندگی کی رہنمائی کرنی ہے اسے زندگی کو پیچھے نہیں لے جانا ہے، نہ اس کے ساتھ چلنا ہے بلکہ زندگی کی رہنمائی کرنی ہے۔لوگ کہتے ہیں زندگی اور حیات کے ساتھ چلو لیکن تحریک اسلامی تو حیات کی رہنمائی کرنا چاہتی ہے۔بہر حال ہمیں اپنی تحریک کو چلاتے ہوئے اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا ہوگا کہ حیات اور کائنات میں ثبات صرف ایک قانون تغیر کو

ہے۔بقول اقبالؔ:

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

جو چیز یہاں مستقل رہنے والی ہے وہ صرف قانون تغیر ہے جس کو ثبات حاصل ہے۔باقی سب چیزیں بدلتی اور تبدیل ہوتی رہتی ہیں پس ہم تغیر سے انکار کیسے کر سکتے ہیں۔رہا انسان کو صحیح رخ پر لے جانا،ان کی رہنمائی کرنا،فلاح سے ہمکنار کرنا تو یہ تو اسلام کا اصل مقصد ہے، چنانچہ تحریک اسلامی کو اسی انداز میں رہنمائی کے لیے سوچنا بھی چاہیے اور کرنا بھی چاہیے۔اس مقصد کے لیے ہم ہر چار سال کے بعد اپنے گردوپیش کا،اپنے کام کا اور رفتار کار کا جائزہ لیتے رہتے ہیں اور آئندہ کے لیے کیا کچھ کرنا ہوگا اور کیا کچھ کیا جا سکتا ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے پروگرام بناتے اور کام کرتے رہتے ہیں۔ان شاء اللہ آئندہ کے لیے پروگرام بناتے ہوئے بھی ان تمام ضروری امور کو پیش نظر رکھا جائے گا۔

☆پورے ملک کے اندر فاشسٹ قوتوں کا غلبہ ہوتا جا رہا ہے اور روز افزوں اسلامی شناخت اور رہے سہے ملی تشخص کو مٹانے کی نت نئی سازشیں رچی جا رہی ہیں۔دوسری جانب مسلم عوام عجیب وغریب ذہنی وفکری انتشار کا شکار ہے۔اس کے سامنے کوئی واضح لائحہ عمل نہیں ہے کہ کریں تو کیا کریں؟ایسے میں قائد تحریک کی حیثیت سے آپ کا اپنی پوری ملت کے لیے کیا پیغام ہے؟

امیر جماعت: اس سلسلے میں ہماری کوششیں دو طرح کی ہیں۔ایک تو یہ کہ ہم اس ملک کے تمام لوگوں تک اس پیغام کو پہنچانا چاہتے ہیں جو اپنے پاس رکھتے ہیں جو کہ خدا کا پیغام ہے اور خدا کے سارے بندوں کے لیے ہے۔دوسری کوشش اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ اس پیغام کو جو لوگ مانتے ہیں مگر اس کا پوری طرح شعور نہیں رکھتے ہیں،ان میں شعور بیدار کریں۔جنہیں اپنی شناخت اور اصل حیثیت کا پتہ ہی نہ ہو یا اس کا شعور نہ ہو تو اس کی حفاظت کیسے کریں گے؟اس کی حفاظت تو اسی وقت ہوگی جب کہ اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کا احساس ہو۔ظاہر ہے بے قیمت کسی چیز کی حفاظت کوئی کیوں کرے گا۔اس طرح ایک طرف تو

پورے ملک کی عوام تک پیغام حق کو پہنچانا ہے دوسرے اس پیغام کو جو لوگ مانتے ہیں لیکن اس کا شعور نہیں رکھتے ان کے شعور کو جگانا ہے۔ایسے وقت میں اس ملک کی فاشسٹ قوتیں چاہتی ہیں کہ قوت کے زور سے اپنی پسند کے رنگ میں پورے ملک کو رنگ دیں اور اپنی مرضی مسلط کر دیں، اس کے خلاف رائے عامہ کو بیدار کرنا بھی ضروری ہے۔اس کے لیے جتنے بھی ذرائع ممکن ہیں، تلقین کے، تشہیر کے، رائے عامہ کو بنانے کے، عوام کی رائے کو صحت مند رخ پر لانے کے وہ سب ذرائع اختیار کر کے ہم یہ چاہتے ہیں کہ لوگوں کی رائے کی صحیح تربیت کریں۔اور مسلمانوں کے تعلق سے ہماری کوشش ہے کہ ان میں مسلمان ہونے کا صحیح شعور پیدا کریں، اسلام کے تقاضوں کی پہچان اور اس کو ادا کرنے کی فکر ان کے اندر پیدا ہو جب تک ٹھیک طور سے یہ فکر پیدا نہیں ہوگی اس وقت تک اپنے کو بچانے کی چاہے جتنی کوشش کی جائے وہ کامیاب نہیں ہوگی، تو یہ ساری ہماری کوششیں ہیں اور ان کی حیثیت کوششوں ہی کی ہے۔اس کے اثرات اور نتائج سب اللہ کے ہاتھ ہیں۔ سعی و کوشش اور دعا ہمارا کام ہے اور ہمیں یہ دونوں کام کرنا چاہیے اور کرتے رہنا چاہیے۔

☆ آپ کی نظر میں ملک، ملت اور عالم اسلام کا سب سے اہم مسئلہ کیا ہے نیز اس مسئلہ کے حل کے لیے تحریک اپنے پاس کیا پروگرام رکھتی ہے؟

امیر جماعت: ہمارے نزدیک تو اصل مسئلہ یہ ہے کہ انسان پر اس کی زندگی کا صحیح مقصد واضح ہو اور انسان اسے پہچانے اور مان لے۔ وہ جب اس کو نہیں پہچانتا اور نہیں پاتا ہے تو اس کے مسائل پیدا ہوتے اور الجھتے جاتے ہیں۔اور یہی مسائل ایک ملت کے لیے ملی، ایک ملک کے لیے ملکی اور عالم کے عالمی ہو جاتے ہیں اگر چہ ان کی ظاہری شکلوں اور نوعیتوں میں اور تفصیلات میں فرق ہوتا ہے۔انسان کو یہ پہچان بس خدا کی ہدایت سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اصل مسئلہ یہی ہے باقی سارے مسائل اسی مسئلہ کی پیداوار ہیں۔تو ان مسائل کا حل تو یہ ہے کہ ہم بنیادی طور سے خدا کے پیغام کو خدا کے بندوں تک پہنچانے کے کام کو تیز سے تیز تر کریں، کھول کھول کر بہت واضح انداز میں، عصر حاضر کی زبان میں اور آج کی ذہنی سطح اور زمانے کی فضا اور ماحول کو سامنے رکھتے ہوئے بات کی جائے، کہی جائے اور سمجھائی جائے۔اس کے علاوہ

اور دوسری تدبیریں بھی ہوسکتی ہیں۔ کچھ مضبوط اور پختہ ہوتی ہیں، کچھ ناپختہ ہوتی ہیں، کچھ دوررس اثرات کی حامل ہوتی ہیں تو کچھ فوری نتائج کی حامل بھی ہوتی ہیں۔ یہ سب تو جس کے جو سمجھ میں آئے کر ہی رہا ہے۔ ہمارے نزدیک تو یہ ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ وقتی طور پر جو تبدیلی وقت اور حالات کے لحاظ سے کی جاسکتی ہے کریں۔

☆ ایس آئی او جماعت اسلامی ہند کی سرپرستی میں چلنے والے مسلم طلبہ ونوجوانوں کی اس ملک کی سب سے منظم تنظیم ہے۔ اس تنظیم کے تعلق سے آپ کی رائے؟ نیز آپ انہیں کیسا دیکھنا پسند کرتے ہیں؟

امیر جماعت: رائے کیا یہ تو ظاہر ہے کہ ایس آئی او جماعت اسلامی ہند کی شوری کے فیصلے کے تحت وجود میں لائی گئی ہے اور امیر جماعت اس کا سرپرست اعلیٰ ہوتا ہے تو اس کی رائے کیا اس کی تو آرزو ہے، تمنا ہے، اس کی انتہائی خواہش ہے اور یہ اس کا ایک حسین اور سنہرا خواب ہے اور کوشش ہے کہ اس خواب کی صحیح تعبیر ہو۔ جماعت ایس آئی او کو اپنے خوابوں کی تعبیر، اپنی تمناؤں اور اپنی توقعات کے پورا ہونے کے لیے ایک اہم اور موثر ذریعہ سمجھتی ہے۔ ہم دل وجان سے اس کو عزیز رکھتے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ وہ پھلے پھولے اور آگے بڑھے اسی سے ہمیں تحریک کے لیے کارکن ہی نہیں ہر محاذ پر کام کرنے والے افراد ملیں گے۔

☆ ملک کے طلبہ ونوجوانوں پر آپ کیا تبصرہ فرمائیں گے؟ اس تناظر میں ایس آئی او کے کارکنوں کو آپ کیا مشورہ دیں گے؟

امیر جماعت: اس وقت ہمیں جہاں یہ خوشی ہے کہ ملک میں تعلیم عام ہو رہی ہے، تعلیم کا شوق بڑھ رہا ہے، تعلیم کو پھیلانے اور فروغ دینے کی ہر سطح سے کوششیں ہو رہی ہیں۔ سرکاری سطح پر بھی اور عوامی سطح پر بھی۔ یہ بہت خوش آئند پہلو ہے لیکن تعلیم کا تعمیری، صحیح اور صحت مند رخ سامنے نہیں ہے۔ لوگوں کے بگاڑ میں یا ان کی خرابی میں صرف نوشت وخواند سے یا کچھ پڑھنے لکھنے سے تبدیلی واقع نہیں ہوسکتی۔ آدمی اگر غلط راستے پر جا رہا ہو، جانتا نہ ہو تو اس طرف سے جانا ایک بے خبر جانا ہے لیکن ایک دوسرا شخص ہے اور وہ بھی اسی راستے کی طرف جا رہا ہے سوچ سمجھ کر جا رہا ہے پڑھ لکھ کر جا رہا ہے تو ظاہر ہے پڑھنے لکھنے سے تو تبدیلی نہیں آئی۔ تعلیم

ایک مقصد کے ساتھ ہو، زندگی کے مقصد سے اس کا تعلق ہو اور آپ کا مقصد تو وہ ہے جو زندگی کا صحیح مقصد ہے۔ لہٰذا تعلیم تو عام ہو رہی ہے لیکن تعلیم کا مقصد سامنے نہیں ہے جس کی وجہ سے خرابیاں دور نہیں ہو رہی ہیں۔ پڑھ لکھ کر بھی انسان سارے خراب اور برے کام کر رہا ہے، اس کی اصلاح کی طرف پیش رفت کرنی ہے ایس آئی او کے ذریعہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ نئی اور نوجوان نسل میں زندگی کا صحیح شعور پیدا ہو، زندگی کے صحیح مقصد سے وہ آشنا ہو جائیں اور تعلیم اور ان کا علم اس میں ان کے لیے مددگار ثابت ہو، ایس آئی او یہ کام کرسکتی ہے چونکہ یہ طالب علم بھی ہیں اور نوجوان اور ہم عصر بھی اس لیے اس کام کو وہ مؤثر انداز میں انجام دے سکتے ہیں۔ اس کی طرف انہیں بھرپور توجہ دینی چاہیے۔ یہ کام ایس آئی او کے ذریعہ ہو سکے تو یہ دین کی بھی خدمت ہوگی اور ملک وملت کی بھی بلکہ بہت بڑی اور دوررس نتائج کی حامل ایک بڑی خدمت ہوگی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایس آئی او سے یہ عظیم کام لے اور اس کام میں اپنی نصرت شامل حال فرمائے اور ان کی کوششوں کو عنداللہ اور عندالناس مقبول فرمائے۔ آمین

پچاس سال میں کیا کھویا کیا پایا

آزادی ملک کی پچاس سالہ تقریبات اور تشکیل جماعت اسلامی ہند کے تناظر میں جماعت کی اب تک کی کارکردگی اور ملکی حالات سے متعلق اس کا موقف جاننے کے لیے چیف ایڈیٹر سہ روزہ دعوت جناب پرواز رحمانی نے محترم مولانا محمد سراج الحسن صاحب سے یہ انٹرویو لیا تھا، یہ انٹرویو سہ روزہ دعوت کے علاوہ ماہنامہ زندگی نو (اکتوبر 1997) میں شائع ہوا تھا۔

سوال: ملک کی آزادی کے پچاس سال پورے ہونے پر جہاں پورا ملک جشن منارہا ہے وہیں مختلف طبقات، تنظیمیں اور ادارے اپنا اپنا جائزہ بھی لے رہے ہیں کہ اس عرصے میں انھوں نے کیا کھویا، کیا پایا اور آج وہ کس مقام پر ہیں۔ ظاہر ہے کہ جماعت اسلامی ہند بھی اپنا جائزہ لے رہی ہوگی تو آپ مختصراً فرمائیں کہ جماعت کے قیام کے مقاصد کی جانب کس قدر پیش رفت ہوئی ہے۔ مقرر کردہ اہداف اور نشانے کہاں تک پورے ہوئے ہیں اور آج جماعت کس پوزیشن میں ہے؟

جواب: جماعت اسلامی ہند تو ایک ایسی تحریک ہے جو اپنے قیام کے اول دن سے ہی اپنے کام کا اور اپنا جائزہ لیتی رہی ہے اور جب سے ہم نے ہر چار سال بعد اپنے کیے ہوئے کام کا جائزہ لے کر آنے والے چار سالوں کے لیے پروگرام بنا کر کام کرنا شروع کیا ہے ہر دو سال بعد جماعت کی سب سے اونچی مجلس جس کو ہمارے دستور نے مجلس نمائندگان کا نام دیا ہے اپنے کام کا منفی اور مثبت دونوں پہلوؤں سے بے لاگ جائزہ لیتی ہے اور اپنی کمیوں، کمزوریوں اور موانع کا جائزہ لے کر انہیں دور کرنے کی فکر و تدبیر بھی کرتی ہے۔

اب جب کہ ہمارا ملک آزادی کی پچاسویں سالگرہ منارہا ہے اور جائزہ لے رہا ہے تو ہم

نے ملک کے ساتھ ساتھ اپنا بھی جائزہ لیا۔ ویسے انسان کی یہ بڑی کمزوری ہے کہ وہ دوسروں کا جائزہ تو لیتا ہے لیکن اپنے کو بھول جاتا ہے اور یہ بھولنا غیر ارادی نہیں ہوتا بلکہ بالارادہ ہوتا ہے۔ وہ خود کو مصلح اور اصلاح سے بے نیاز و بالاتر سمجھتا ہے یا اپنے ضمیر کا سامنا کرنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا، بقول جگر مرادآبادی:

با ہمہ ذوق آگہی ہائے رے پستی بشر
سارے جہاں کا جائزہ اپنے جہاں سے بے خبر

بہر حال جب ہم اپنا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ آگے بڑھنے اور تیز رفتاری سے کام کرنے میں جہاں خارجی رکاوٹیں رہی ہیں، وہیں ہماری کمزوریوں اور غفلتوں کا بھی ان میں دخل رہا ہے۔ ملک کی آزادی اور تقسیم کے بعد پیدا شدہ حالات نے باہمی نفرت اور انتقام کا وہ ماحول بنا دیا کہ قدم بڑھانا تو کجا اس کو جمائے رکھنا بھی دشوار ہوگیا۔ اس کے باوجود اللہ کے فضل سے ہم اس مدت میں کافی آگے نکل آئے ہیں۔ عوام ہماری دعوت اور پیغام سے بلا امتیاز عقیدہ و مذہب واقف اور متاثر ہوتے جا رہے ہیں۔ ملک کی تمام ریاستوں میں ہماری شاخیں قائم ہوگئی ہیں اور اپنے کام میں مصروف ہیں۔ اب جماعت ایک خدا پرست، انسان دوست، محبّ وطن اور خادم خلق جماعت کی حیثیت سے جانی پہچانی جا رہی ہے۔ ان شاء اللہ یہ تصویر وقت کے ساتھ ساتھ اور نکھرتی جائے گی۔

ہم نے خدا کے کلام اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو ملک کی تمام بڑی زبانوں میں منتقل کیا ہے اور کرتے جا رہے ہیں۔ زندگی کے صحیح مقصد کو پہچان کر اس کے لیے اپنی زندگیوں کو لگانے والے مردان کار کی ایک منظّم ٹیم ہم نے تیار کر دی ہے۔ جس کا جینا اور مرنا ہی اس کام کے لیے ہے اور جو خدا کی خوشنودی اور اخروی زندگی کی کامیابی کے علاوہ کسی چیز کے طالب نہیں ہیں۔ آج ہم بلا مبالغہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ حالات اس کام کے لیے سازگار ہیں، عوام میں حق کی پیاس اور طلب بڑھتی جا رہی ہے اور اہل ملک ہماری جانب امید بھری نظروں سے دیکھنے لگے ہیں۔

سوال: اب کچھ جماعت کے مستقبل کے بارے میں بتائیں کہ آپ کے کیا منصوبے ہیں؟

جواب: مستقبل نام ہے آنے والے کل کا اور کل نتیجہ ہوتا آج کے کیے گئے کام کا۔ مستقبل

کسی فرد کا ہو یا قوم کا چھپا ہوا ہوتا ہے، نہ چھپا ہوا۔ میں آج کے آئینے میں اپنے کل کو دیکھ سکتا ہوں۔ آپ نے جماعت کے مستقبل کے بارے میں پوچھا ہے۔ جماعت کے پاس کل کے لیے کیا منصوبہ یا منصوبے ہیں، جاننا چاہا ہے۔ میں سب سے پہلے اس بات کو واضح کردوں کہ جماعت اسلامی ہند کیا چاہتی ہے اور جو کچھ چاہتی ہے اس کے لیے وہ کیا کچھ کررہی ہے؟

جماعت اسلامی ہند اس بات پر کامل یقین رکھتی ہے کہ انسان اور کائنات کسی اتفاقی حادثہ کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ ایک خدائے واحد ہے جس نے اس کی تخلیق کی ہے اور وہی اس کا مالک بھی ہے اور حاکم بھی۔ خدا نے انسان کی ہر ضرورت کو پورا کیا ہے اور انسان کی سب سے بڑی ضرورت وہ علم اور ہدایت ہے جو اسے اس کا صحیح مقام بتائے اور زندگی کے اصل اور حقیقی مقصد سے آگاہ کرے۔ چنانچہ اس رحمٰن اور رحیم آقا نے انسان کی اس اہم ترین ضرورت کو پورا کیا اور سب سے پہلے انسان حضرت آدمؑ کو علم و ہدایت کی روشنی کے ساتھ اس زمین پر بھیجا اور انسانی آبادی کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ ہدایت اور ہادیوں کے زمین پر آنے کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ خدائی ہدایت آخری طور سے اور مکمل شکل میں اللہ کے آخری رسول حضرت محمد ﷺ کے ذریعے دنیا میں آئی، پھر آخری رسولؐ کے ذریعے ایک امت کو اٹھایا گیا تاکہ قیامت تک پیدا ہونے والے انسانوں کو خدا کا پیغام اور اس کی ہدایت پہنچتی رہے۔ امت مسلمہ جو ساری دنیا میں بقول کسے ایک سو بیس کروڑ کی تعداد میں پائی جاتی ہے، اسی کی یہ ذمہ داری تھی بلکہ ہے اور رہے گی کہ وہ اس کام کو انجام دے لیکن افسوس کہ وہ اپنے اس فریضے سے غافل رہی اور ہدایت سے محروم لوگوں کی طرح اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں ماررہی ہے۔

اب جن کے اندر بھی اس فریضے کا احساس بیدار ہوا، وہ اکٹھا ہوئے اور جماعت اسلامی ہند کی شکل میں منظم ہوکر اس کام کو انجام دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ جماعت اسلامی ہند کے سامنے دو بڑے کام ہیں۔ ایک تو امت مسلمہ کو اس کا فریضہ یاد دلانا اور اسے اس کام کے لیے ایک داعی امت کی حیثیت سے اٹھانا اور تیار کرنا۔ دوسرے تمام بندگانِ خدا تک پیغام رب کو پہنچانا اور اس نظام حق وعدل سے متعارف کرانا جس کو لے کر یہ پیغام آخری رسول ﷺ کے ذریعے دنیا میں آیا ہے۔ ہماری پالیسی، ہمارے پروگرام، ہماری منصوبہ بندی اور ہمارے

طریقے، ذرائع اور تدبیریں اسی مقصد کے لیے بنتی اور اختیار کی جاتی ہیں۔ وقت اور حالات کے تحت ان میں بوقت ضرورت تبدیلیاں بھی ہوتی رہی ہیں۔ اس کے لیے ہم نے سب سے پہلے اپنے ملک کو سامنے رکھا ہے اور ہمارے ہم وطن بھائی ہمارے اولین مخاطب ہیں۔ ہمارے منصوبے اور پروگرام انہی باتوں کو پیش نظر رکھ کر بنائے جاتے ہیں اور بنائے گئے ہیں۔ رہا جماعت کے مستقبل کا سوال تو یہ اس کے وابستگان کی اپنے نصب العین سے گہری وابستگی اور اس کے لیے ان کی جدوجہد پر منحصر ہے۔ ویسے اپنی کارکردگی کو دیکھتے ہوئے یہ بات تو کہی جاسکتی ہے کہ ان شاء اللہ وہ روشن اور تابناک ہوگا۔

سوال: پچھلے پچاس سال کے تجربات کی روشنی میں کیا آپ جماعت کے طریق کار میں کسی قسم کی تبدیلی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں؟

جواب: جماعت اسلامی ہند نے اپنے نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے تین بنیادی اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے طریقہ کار کو طے کیا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ جو کچھ بھی کرے گی قرآن وسنت کی روشنی میں کرے گی۔ دوسرے یہ کہ اخلاقی حدود کے اندر رہتے ہوئے کرے گی اور ذہنوں اور سیرتوں کی اصلاح کرتے ہوئے ان کی رایوں کو تبدیل کرتے ہوئے وہ اجتماعی تبدیلی لائے گی۔ جس کے نتیجے میں انسان کی پوری زندگی پر اللہ کا دین چھا جائے اور ہدایت کی روشنی پوری حیات کو روشن کردے۔ یہ ہیں ہمارے طریقہ کار کے بنیادی اصول۔ انہیں ملحوظ رکھتے ہوئے ہم اپنے دور کو، دورِ حاضر کے فراہم کردہ وسائل و ذرائع کو، آج کے انسان کو اور اس کی ذہنی وفکری سطح اور اس کے مسائل اور الجھنوں کو سامنے رکھتے ہوئے ہر وہ تدبیر اور ہر وہ ذریعہ اختیار کریں گے، جو قرآن وسنت کی تعلیم کے مخالف اور مغائر نہ ہو۔ ظاہر ہے اس حرکت کرتی، تبدیل ہوتی اور ترقی کرتی ہوئی زندگی میں جو دریا کی طرح رواں دواں بھی ہے اور آگے بڑھتی جارہی ہے، یہ دیکھنا ہوگا کہ اس وقت کس تدبیر کی اور کس ذریعے کو استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے اس میں تبدیلیاں ہوتی رہیں گی۔

رہی یہ بات کہ کیا اس وقت کسی تبدیلی کی ضرورت ہے تو ہمیں بڑی گیرائی اور گہرائی سے جائزہ لے کر فیصلہ کرنا ہوگا۔ یہ ایک معلوم بات ہے کہ ہمارے فیصلے اجتماعی غور وفکر کے بعد ہوا کرتے

ہیں اور ہم ایک شورائی جماعت ہیں، اپنے تمام کام حتی الوسع مشوروں سے انجام دیتے ہیں۔

سوال: بعض حضرات کا خیال ہے کہ اقامتِ دین کے سلسلے میں جماعت پہلے ہی اپنے طور طریق تبدیل کر چکی ہے؟

جواب: سوال مجمل بھی ہے اور مبہم بھی۔ اول تو ہمیں یہ بتایا جائے کہ جماعت اسلامی ہند نے اپنے طور طریق میں کیا تبدیلی کی ہے، کہاں کی ہے اور کب کی ہے؟ اور کوئی تبدیلی کی ہے تو وہ قابلِ توجہ اور قابلِ اصلاح بات کیا ہے؟ اگر یہ واضح ہو تو کوئی بات کی اور کہی جاسکتی ہے۔

سوال: مثلاً ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ جماعت عزیمت کی راہ چھوڑ کر رخصت کی راہ پر آگئی ہے۔ براہِ راست اور صاف صاف دعوت پیش کرنے کے بجائے معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا جارہا ہے۔ فورم کے قیام جیسی سرگرمیوں کے ذریعے باطل نظام کے ساتھ بقائے باہم کا تأثر پیدا ہو رہا ہے؟

جواب: عزیمت و رخصت دو اہم دینی اصطلاحات ہیں۔ سوال ان کے حقیقی اور صحیح مفہوم اور ان کے صحیح اطلاق و استعمال کا ہے۔ اس میں بھی رایوں کا فرق ہوسکتا ہے اور ہے۔ اس میں اہم سوال نیتوں کی درستی اور ارادوں کی پاکیزگی کا ہے جسے خدا ہی صحیح طور سے جان سکتا ہے۔ ایک موقع پر میرے مرحوم دوست اور بھائی عبدالرزاق لطیفی صاحب نے کسی صاحب کے سوال کے جواب میں کہا تھا کہ 'مصلحت' اگر وہ دین کے تحفظ اور اس کی کسی مصلحت کی خاطر ہے تو جائز اور اپنی چمڑی بچانے کے لیے ہے تو ناجائز۔ یہ تو عمومی پہلو سے مصلحت کے سلسلے کی ایک بات ہوئی۔ ویسے کبھی جان بچانے کے لیے بھی کلمہ کفر کہنے کی اجازت دین میں ملتی ہے۔ عزیمت ہو کہ رخصت دونوں کا تعلق دین سے ہے۔ کب کس پر عمل کی ضرورت ہے اس میں رائیں مختلف ہوسکتی ہیں۔ ہم چونکہ ایک شورائی نظام والی جماعت ہیں اس لیے امیر جماعت اور شوریٰ ہی غور وخوض کے بعد کسی رائے کے حق میں فیصلے کر سکتے ہیں اور وہی اجتماعی فیصلہ جماعت کا موقف ہوگا۔

رہا افراد اور گروہوں سے اپنے مقصد کے لیے تعلق قائم کرنے اور ان سے تعاون کرنے کا معاملہ تو حضور ﷺ کی سیرت کے مطالعے سے ہمیں اس سلسلے میں واضح روشنی اور رہنمائی ملتی ہے۔ ہجرت مدینہ کے بعد مختلف گروہ اور عناصر سے کیا گیا معاہدہ اور صلح حدیبیہ و فتح مکہ سے

پہلے بنی خزاعہ سے ہوا معاہدہ وغیرہ مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے۔ رہی تأثر کی بات تو تأثر تو بس تأثر ہوتا ہے۔ اس کی حیثیت اصول و نظریے کی ہے نہ کہ دلیل کی۔

سوال: گزشتہ نصف صدی کے سیاسی حالات اور موجودہ سیاسی رجحانات کے پیش نظر جن میں پسماندہ طبقات کی بیداری اور علاقائیت کے رجحانات خاص طور سے شامل ہیں، آپ ہندوستان میں تحریک اسلامی کی کامیابی کے امکانات کہاں تک روشن پاتے ہیں؟

جواب: ہندوستان ہمہ مذہبی، ہمہ لسانی، ہمہ نسلی، ہمہ طبقاتی اور ایک وسیع و عریض ملک ہے۔ تاریخ ہند کا کوئی دور بھی گروہی اور طبقاتی امتیازات، علاقائی رجحانات، باہمی کشمکش، بے اعتمادی و نفرت اور ظلم و استحصال سے خالی نہیں رہا ہے لیکن مختلف وجوہ سے یہ دبتے اور ابھرتے رہے ہیں اور ماضی قریب میں آزادی کی جدوجہد کے دوران ایک بڑے مقصد کے افکار و جذبات پر چھا جانے کی وجہ سے یہ خاصے دب دبا گئے تھے اور آزادی کے بعد گزرے ہوئے پچاس سالوں میں یہ پوری قوت سے ابھر آئے ہیں۔ ظلم و استحصال کے عمل نے ان میں بڑی تیزی پیدا کر دی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں شدت آتی جا رہی ہے۔

جماعت اسلامی ہند کے نزدیک ان امراض کے مستقل اور پائیدار علاج کی ایک ہی شکل ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ سارے لوگ:

(۱) ایک خالق کے بندے ہونے کی حیثیت کو سمجھ کر مان لیں۔

(۲) پوری نوع انسانی کو ایک ماں باپ کی اولاد سمجھیں اور بھائی بھائی بن جائیں اور

(۳) زندگی گزارنے کے لیے اپنے خالق اور پروردگار کی بھیجی ہوئی ہدایت کو مان لیں جس کو اللہ نے اپنے آخری رسول ﷺ کے ذریعے پوری نوع انسانی کے لیے بھیجا ہے اور اس کی بنا پر انسانی زندگی کی تعمیر نو کریں تاکہ حق و عدل کا وہ نظام زمین پر اور انسانی معاشرے پر قائم ہو جائے اور ظلم، استحصال اور ناانصافی کی ہر شکل کا خاتمہ ہو۔

(۴) اس سلسلے کی اہم اور آخری بات یہ کہ اس حقیقت کو مانا جائے کہ ہر انسان اللہ کے آگے جوابدہ ہے اور اسے اللہ کے حضور پہنچ کر اپنے سارے کیے کی جوابدہی کرنی ہے۔

جماعت اسلامی ہند اپنے آپ کو اور اپنے ملک کے عوام کو ان برائیوں اور بیماریوں سے بچانے کی جدوجہد میں لگی ہوئی ہے۔ وہ ہندوستانی عوام کی خوبیوں سے بھی واقف ہے اور ناکامیوں اور کمزوریوں سے بھی۔ خوبیوں سے وہ فائدہ اٹھائے گی اور انہیں مزید ابھارنے اور نکھارنے کی کوشش کرے گی اور کمزوریوں اور خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کرے گی نہ کہ ان سے فائدہ اٹھانے کی۔ ان کے درمیان جو اختلافات ہیں وہ انہیں فطری حدود میں رکھتے ہوئے صحیح بنیادوں پر اور صحیح رخ سے ان کے اندر ایک صحت مند اتحاد و اتفاق اور یکجہتی پیدا کرنے کی کوشش کرتی رہے گی اور ساتھ ہی وہ ہر قسم کے ظلم و استحصال کے خاتمہ کی جدوجہد بھی جاری رکھے گی چاہے وہ کسی بھی شکل میں موجود ہوں اور کوئی بھی ان کا ارتکاب کر رہا ہو۔ ظالم کو ظلم سے روکنا اور اس کا ہاتھ پکڑنا اور مظلوم کو ظلم سے بچانا ہماری ذمہ داری بھی ہے اور فریضہ بھی۔ اللہ ہمیں اس کی توفیق دے اور عزم و ہمت سے نوازے۔ آمین!

موجودہ حالات میں ہم اپنی دعوت لوگوں تک پہنچاتے ہوئے پوری سرگرمی سے اپنی اخلاقی اور سماجی اصلاح کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں لگ جائیں تو بہت جلد تحریک اسلامی ہند عوام الناس کی توجہ اور توقع کا مرکز بن جائے گی اور رائے عامہ کو ہموار کرتے ہوئے اپنی منزل کی جانب تیزی سے بڑھتی جائے گی اور عجب نہیں کہ توقع اور اندازے سے کچھ کم مدت ہی میں اپنی منزل سے ہمکنار بھی ہو جائے۔

سوال: نومبر میں حیدرآباد میں ہونے والے کل ہند اجتماع ارکان کے تعلق سے کچھ فرمائیں کہ اس کے خاص مقاصد کیا ہیں اور یہ کہ یہ اجتماع صرف ارکان ہی کی حد تک کیوں رکھا گیا ہے۔ دیگر وابستگان جماعت کو کیوں نہیں بلایا جا رہا ہے؟

جواب: یہ بات پہلے ہی واضح کی جا چکی ہے کہ کل ہند سطح کا یہ اجتماع صرف ارکان کا ہوگا اس لیے یہ انہی تک محدود رہے گا۔ اس موقع پر یہ عرض کرنا مناسب نہ ہوگا کہ جماعت کی تاریخ میں کل ہند سطح کا یہ پہلا اجتماع ارکان ہوگا جو چار روزہ ہوگا۔ اس سے پہلے ایک روزہ یا ڈیڑھ دو روزہ اجتماعات عمومی اجتماعات کے ساتھ اور ان سے متصل ہی رکھے جاتے رہے ہیں۔ کل ہند اجتماع جب بھی ہوا ہے وہ اگر شمال میں ہوا تو جنوب سے ارکان کی نمائندگی ہوئی اور جنوب میں

ہوا تو شمال سے نمائندگی ہوتی رہی۔ مئی ۱۹۷۸ء میں بھوپال میں ارکان کا ایک اجتماع ضرور ہوا تھا لیکن اس میں تمام ارکان کی شرکت لازمی نہیں تھی۔ جنوبی ہند سے صرف ارکان کے نمائندے شریک ہوئے تھے اور اس کا مقصد بھی صرف ایک مسئلہ پر غور کر کے فیصلہ کرنا تھا۔

اب جو اجتماع ہونے جا رہا ہے اس میں تمام ارکان کی شرکت لازمی ہوگی الا یہ کہ کسی کو عذر شرعی لاحق ہو۔ دوسرے یہ کہ اس کا مقصد تحریک اسلامی ہند کے ماضی، حال اور مستقبل کے سلسلے میں نہایت کھلے ذہن کے ساتھ غور کرنا اور سوچنا ہے تا کہ تحریک اسلامی ہند کا یہ قافلہ فکری ہم آہنگی اور ذہنی یکسوئی کے ساتھ پوری قوت اور مستعدی سے اپنے نصب العین کی سمت آگے ہی آگے بڑھتا جائے یہاں تک کہ اس سے ہمکنار ہو جائے۔

سوال: عام کل ہند اجتماع عام کب ہوگا؟

جواب: جماعت اسلامی ہند کا ایک مدت سے یہ معمول رہا ہے کہ ہر چار سال کے بعد جب نئی میقات شروع ہوتی ہے تو وہ اپنے لیے ایک چار سالہ پروگرام بھی طے کر لیتی ہے تا کہ جماعت کے ارکان اور کارکنوں کے سامنے آنے والے چار سالوں میں جو کام انجام دینے ہیں وہ ان کی نگاہ میں رہیں۔ چنانچہ ہم اجتماعات کے بارے میں بھی طے کرتے رہے ہیں اور اب کی بار بھی یہ طے کیا ہے کہ کل ہند سطح کا اجتماع ارکان منعقد کیا جائے گا اور ظاہر ہے کہ یہ صرف ارکان ہی کا ہوگا اور وہی اس میں شرکت بھی کر سکیں گے۔ ہاں اس کے علاوہ ہم نے منطقہ واری اجتماعات کے انعقاد کا بھی فیصلہ کیا ہے۔ منطقے بھی بنا دیے ہیں اور یہ بھی طے کر دیا ہے کہ دسمبر 1988ء تک ان کا انعقاد عمل میں لایا جائے۔ یہ منطقے کم سے کم دو حلقوں اور زیادہ سے زیادہ چار حلقوں پر مشتمل ہوں گے۔ امید ہے کہ دعوتی اور تنظیمی پہلو سے یہ انتہائی مفید اور نتیجہ خیز ثابت ہوں گے۔ ان شاء اللہ

سوال: آزادی کی گولڈن جوبلی تقریبات کے ایک بڑے پروگرام کے طور پر پارلیمنٹ کا ایک خصوصی اجلاس ابھی پچھلے ہفتے بلایا گیا تھا، جس کی کارروائی آپ نے بھی سنی اور دیکھی ہوگی۔ اس اجلاس میں ہونے والے مباحث سے آپ کی نظر میں ملک کی کیا تصویر بنتی ہے؟

جواب: پچاس سالہ جشن آزادی ایک عظیم الشان قومی تقریب کے طور پر ضرور منایا گیا

لیکن نیند سے مغلوب شعور، آنکھیں ملتی، بیدار ہوتی ہوئی اس کی روح، بیتاب زخموں سے چور ضمیر کی دردناک کراہ، ایک چیخ، ایک فریاد اور مدد کے لیے آواز دیتی ہوئی ایک پکار تھی جو بلند ہوئی۔ لوک سبھا اور راجیہ سبھا کے چھ روزہ اجلاس میں ہوئے مباحث ہوں یا اس دوران کی دوسری تقریبات جو ہر سطح پر اور ہر میدان میں مختلف شکلوں میں منائی گئیں خوشی ومسرت کے قہقہے بلند ہوئے جو کھوکھلے تھے۔ تقریریں کی گئیں جو یقین سے خالی اور مایوسیوں اور اندیشوں سے معمور تھیں۔ ان کی آوازیں، ان کی زبانیں اور ان کے انداز الگ الگ تھے۔ لیکن باتیں ملتی جلتی تھیں۔ یہ کہہ رہے تھے کہ:

''آزادی کے بعد مادی اور صنعتی ترقی کے باوجود آج بھی ہندوستان کو غریبی، جہالت، طبقاتی اونچ نیچ اور ان کے اندر بڑھتی ہوئی نفرت اور تیز ہوتی ہوئی کشمکش سے اور فرقہ وارانہ تعصب اور فرقہ پرستی سے چھٹکارا نہیں مل سکا ہے۔ لاقانونیت، ابھرتے ہوئے پرتشدد رجحانات، بڑھتی ہوئی تشویشناک دہشت گردی اور بے ایمانی، بدکرداری، رشوت، بے حیائی اور عریانی کے امڈتے ہوئے سیلاب میں ملک بہتا چلا جارہا ہے۔ پھر مزید یہ کہ پچھلے سال سے اونچے درجہ کی شخصیتوں کے جو اسکینڈل سامنے آئے ہیں اور عدالتوں میں زیرغور وفیصلہ ہیں، ان سے ملک کے سامنے ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے سامنے ہماری حقیقی تصویر بے نقاب ہوگئی ہے۔ پارلیمان میں مباحث کے بعد پارلیمان کے اراکین کی جانب سے کیے ہوئے عہد نے کہ اب ہر سطح سے کرپشن کو ختم کرنے کی سعی کی جائے گی ایک اچھی علامت تو ہے لیکن صرف عہد وعزم کرلینے سے یا قانون بنالینے سے کام نہیں چلے گا بلکہ سماج کی اخلاقی بنیادوں پر تعمیر کی ایک ہمہ جہتی اور ہمہ سطحی جدوجہد کرنی ہوگی۔ جماعت اسلامی ہند روزِ اول سے ہی اہلِ ملک کو اس کی طرف متوجہ کرتی رہی ہے لیکن اس کی آواز یا تو سنی ان سنی کردی گئی یا پھر نعروں اور بلند بانگ دعوؤں کے شور بے ہنگم میں دب کر رہ گئی۔ ضرورت ہے کہ اس پر توجہ دی جائے اور سارے سماجی، مذہبی اور سیاسی رہنما ایک مشترکہ جدوجہد کے لیے کمر کس لیں۔ اب یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ ہم عزم اور عہد میں کتنے سنجیدہ اور کتنے مخلص ہیں۔

سوال: ایک بات یہ دیکھی جارہی ہے کہ گزشتہ چند برسوں کے دوران بعض علماء اور اہلِ

فکر کے اندر دعوت دین کی ضرورت واہمیت کا احساس اجاگر ہوا ہے مگر وہ اپنے اپنے طور پر انفرادی حیثیت میں یا چند ہم خیال افراد کو لے کر یہ کام کررہے ہیں، دوسرے اداروں یا تنظیموں کے ساتھ چلنا پسند نہیں کرتے کجا کہ جماعت اسلامی ہند تو اس کی وجہ کیا ہے، ظاہر ہے کہ وجہ تو وہ حضرات خود بتائیں گے لیکن آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟

جواب: یہ بات خوشی کی ہے کہ بقول آپ کے بعض علماء اور اہلِ فکر کے اندر دعوتِ دین کی ضرورت واہمیت کا احساس اجاگر ہوا ہے۔ رہی یہ بات کہ یہ حضرات اپنے طور سے اپنے ہم خیال افراد کو لے کر کام کررہے ہیں۔ دوسری تنظیموں کے ساتھ مل کر کام کرنا پسند نہیں کرتے تو دراصل یہ بیماری بہت پرانی ہے اور صدیوں کی تاریخ رکھتی ہے۔ خلفائے راشدین کے بعد ہماری اسلامی اجتماعیت جو متأثر ہونی شروع ہوئی اور بالآخر تقریباً ختم ہوگئی تو اس کے نتیجے میں ہمارا ذہن، ہمارا مزاج اور ہماری سیرت سب پر انفرادیت چھا گئی۔ اجتماعی مزاج اور کردار ہی جاتا رہا، جس کی وجہ سے ایک محدود دائرہ عقیدت میں چند لوگ کسی شخصیت کے گرد تو جمع ہوجاتے ہیں اور آنکھیں بند کرکے چلنے لگتے ہیں لیکن کسی بڑے دائرے میں وسیع پیمانے پر جڑ نہیں سکتے اور جڑ جائیں تو بہت دیر تک جڑے نہیں رہ سکتے۔ یہ مختلف تنظیمیں اور ادارے جو موجود ہیں اور طویل مدت سے کام کررہے ہیں، ان کے بارے میں کیا کہا جائے گا، تو عرض ہے کہ ان سب کی کارکردگی اور ان کا اندرونی حال دیکھ لیجیے تو ساری صورت حال سمجھ میں آجائے گی۔ باہمی اختلاف اور اختلاف میں شدت و جذباتیت، نتیجہ میں باہمی کشمکش، جوڑ توڑ اور سازشیں وغیرہ اب کوئی کہاں تک انہیں گنوائے اور انہیں گناتے ہوئے بھی دکھ اور افسوس ہوتا ہے۔ بہرحال اس کی بڑی وجہ تو ہماری غیر صحت مند انفرادیت یعنی بیمار اور پھولی ہوئی انا جو خودرائی، خود پسندی، خودنمائی اور خود پرستی کی شکل میں پائی جاتی ہے اور دوسرے رائے اور فکر کا حدود نا آشنا اختلاف، مزاجوں کا عدم توازن، باہمی اعتماد کا فقدان، فراخدلی، کشادگی اور توسع کی کمی اور کسی اونچے اور اعلیٰ مقصد ونصب العین کا فکر ونگاہ کے سامنے نہ ہونا اور مفادات کا ٹکراؤ ہے۔ ویسے اور بھی وجوہ ہوسکتے ہیں لیکن بنیادی اسباب تو میرے خیال میں یہی ہیں۔

جماعت اسلامی ہند کے ساٹھ سال

اصل کام خدا کا پیغام خدا کے بندوں تک پہنچانا ہے

مولانا سراج الحسن مرحوم سے یہ انٹرویو جناب پرواز رحمانی سابق چیف ایڈیٹر سہ روزہ دعوت نے لیا تھا۔ یہ انٹرویو سہ روزہ دعوت کی خصوصی اشاعت ''جماعت اسلامی ہند کے ساٹھ سال'' (۴راپریل ۲۰۰۹ء) میں شائع ہوا تھا۔

سوال: جماعت کی امارت سے سبکدوش ہونے کے بعد آپ کی مصروفیات کیا ہیں؟

جواب: ہم جماعت کی امارت سے سبکدوش ہوئے ہیں نہ کہ اس نصب العین سے جو زندگی کا نصب العین ہے۔ مستقر پر ہوتا ہوں تو مطالعہ کرتا ہوں۔ اس دوران اسفار کے پروگرام بھی بنتے رہتے ہیں۔ زیادہ تر کرناٹک میں مختلف مقامات پر جانا ہوتا ہے۔

سوال: سفر کے دوران کس طرح کی مصروفیات ہوتی ہیں؟

جواب: تحریک اسلامی کا اصل کام خدا کا پیغام خدا کے بندوں تک پہنچانا ہے۔ ہمارا زیادہ تر زور اسی پر ہوتا ہے۔ اس کے ضمن میں اور بھی چیزیں آتی ہیں۔ حسبِ ضرورت کبھی ان کے تقاضوں کا سوال آتا ہے، کبھی حالات کے پس منظر اس کام کے کرنے کا سوال آتا ہے جو ہمارے کارکن کام کر رہے ہیں۔ ان کی ذہنی، فکری اور اخلاقی تربیت کا مسئلہ بڑا اہم ہے۔ ہمارا زیادہ وقت اسی پر صرف ہوتا ہے۔

سوال: کیا آپ کے مخاطب مسلمانوں کے ساتھ ساتھ برادران وطن بھی ہوتے ہیں؟

جواب: ہمارے پروگرام دونوں طرح کے ہوتے ہیں۔ برادرانِ وطن سے میں خاص

دلچسپی رکھتا ہوں۔ان کی اہم مذہبی وسماجی شخصیات سے ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔

سوال: برادرانِ وطن میں اہم افراد جن سے آپ کی خاص ملاقاتیں رہی ہوں اور اہم باتیں ہوئی ہوں، بتائیں؟

جواب: عام طور پر یہ خیال مسلمانوں اور تحریک اسلامی کے رفقاء اور کارکنوں میں بھی پھیلا ہوا ہے کہ برادرانِ وطن غلط فہمیوں کا شکار ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ ہم خود غلط فہمی کا شکار ہیں۔ جب کہ ہم سمجھتے ہیں کہ برادرانِ وطن غلط فہمی کا شکار ہیں۔ ہم جو کچھ ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں اس سے ہماری ایک تصویر بنی ہوئی ہے۔ کم وبیش اس کے سلسلے میں وہ کہتے ہیں۔ میرے خیال میں انہیں کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ غلط فہمی اگر اسلام سے بے خبری کے معنی میں لیتے ہیں تو اس کے ذمہ دار بھی ہم ہی ہیں کہ ہم نے اسلام کو ان تک پہنچایا نہیں۔ لہٰذا جو کچھ وہ ہمیں دیکھتے ہیں اسی سے ان کے ذہن میں ایک تصویر بنتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک بات ضرور عرض کروں گا کہ اس پر مزید ان کا اپنا ذہن بھی کام کرتا ہے اور ہمارے بارے میں رائے قائم کرنے میں کچھ زیادتی بھی ہوسکتی ہے اور کچھ کمی بھی ہوسکتی ہے۔ ہمارا یہ کہنا کہ وہ سراسر غلط فہمیوں کا شکار ہیں اور اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں، درست نہیں ہے۔

سوال: اس وقت اسلام اور امتِ مسلمہ کے خلاف پوری دنیا میں ایک مہم چل رہی ہے۔ اس ملک کے لوگ بھی اس سے متاثر ہیں۔ یقیناً مسلمانوں کی کچھ کمزوریاں ہیں لیکن ان کی بھی ذمہ داری ہے کہ اسلام کو جانیں۔ کیا آپ کو اس سے اتفاق ہے کہ ایسا ہونا چاہیے؟

جواب: ہماری اولین ذمہ داری یہ ہے کہ اسلام کے نام لیوا ہونے کی وجہ سے اسلام کو ٹھیک سے پہنچائیں۔ افسوس کہ اس فریضہ کی ادائیگی میں ہم سے بہت بڑی کوتاہی ہوئی ہے۔ پیغام سے بے نیازی برتنا بھی درست نہیں بلکہ روابط مستقلاً رہنے چاہئیں۔ اس سے انکار نہیں کہ ہمیں سمجھنے کی کچھ ذمہ داری برادرانِ وطن کی بھی ہے لیکن اس کے لیے بھی حالات ہم کو ہی پیدا کرنے چاہئیں تاکہ وہ اس طرف راغب ہوں۔

سوال: مولانا ابواللیث اصلاحیؒ اپنے دو ادوار میں مجموعی طور پر 32 برس امیر جماعت رہے۔ ان کے بعد آپ ہی ہیں جن کو زیادہ موقع ملا۔ 13 برس اس ذمہ داری کے دوران آپ

کے خیال میں ایسا کون سا خاص کام ہوا جس کا ذکر کرنا آپ پسند کریں گے؟

جواب: میں اپنے کسی کام کے امتیازی شان بیان کرنے کے موقف میں نہیں ہوں لیکن جس کام پر ہماری توجہ زیادہ رہی وہ برادرانِ وطن تک پیغام کو پہنچانا تھا اور اس سلسلے میں میرے خیال میں مرکز میں بھی اور تحریک کے مختلف حلقوں میں بھی دعوتی کام ترجیحی رہا۔

سوال: آپ کے دورِ امارت میں جب کنڑ زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ مکمل ہوا تو اس کی تقریب اجراء میں کنڑ کے مختلف معروف شعراء، ادباء اور دانشوران شریک تھے۔ ان میں سے بعض نے بہت ہی جذباتی انداز میں کہا کہ آپ نے آج تک ہمیں کیوں اس سے محروم رکھا؟ اس پر آپ کا ردِ عمل کیا تھا؟

جواب: برادرانِ وطن کی جانب سے یہ شکایت ہمیں وقتاً فوقتاً سننے کو ملتی رہتی ہے۔ جب بھی کسی پڑھے لکھے اور ذمہ دار شخص کے سامنے ترجمۂ قرآن یا اسلام کا تعارف آتا ہے، اس کا پہلا تأثر یہی ہوتا ہے کہ افسوس کہ وہ اب تک اس سے محروم رہا۔ تراجم قرآن کا کام دراصل دعوتی کام کا حصہ ہے اور دعوتی کام جماعت کی امارت ہی کے وقت سے نہیں بلکہ ہم اس سے پہلے بھی کرتے تھے اور آج بھی کررہے ہیں۔ ابراہیم سعیدؒ نے امارت حلقہ کا چارج لینے کے بعد کرناٹک میں ہر مقام میں درس قرآن دیا، غیر مسلم بھائیوں کے لیے خاص طور سے ایک دن توحید، دوسرے دن رسالت اور تیسرے دن آخرت جیسے تین موضوعات پر ان کی تقریر ہوتی تھی۔ یہ ان کے دورِ امارت میں کئی سال ہوتا رہا۔ چک منگلور ایک جگہ ہے۔ وہاں درس قرآن کا ایک پروگرام رکھا گیا تھا۔ وہاں کے تمام رفقاء برادرانِ وطن میں دعوت پہنچا رہے تھے تو ایک سیشن جج صاحب جو اس وقت برسرِ کار تھے، انھوں نے ملاقات کے دوران اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں نہایت سخت باتیں کہیں۔ رفقاء ان کی باتیں بہت خاموشی اور صبر کے ساتھ سنتے رہے۔ اس وقت ہم نے کہا کہ آپ ہمارے پروگرام میں شرکت کریں۔ انھوں نے شرکت کا وعدہ کیا اور پروگرام میں تین دن مسلسل شریک رہے۔ آخری دن سیشن جج صاحب اسٹیج پر آئے اور سارے مجمع کے سامنے انھوں نے ابراہیم سعید کے پاؤں چھوئے۔ یہ واقعہ اپنی نوعیت کا پہلا یا انوکھا واقعہ نہیں ہے۔ جب بھی سنجیدہ برادرانِ وطن کے سامنے بات آئی ہے یہی

ہوا ہے۔

سوال: آپ نے اپنی مصروفیات میں دعوت و تبلیغ کے تعلق سے دوروں کا ذکر کیا جس کی تفصیل آچکی ہے۔ براہِ کرم آپ یہ بتائیں کہ آپ جب گھر پر ہوتے ہیں تو مطالعے میں کون سی کتابیں پیش نظر ہوتی ہیں؟

جواب: مجھے تاریخ سے بہت دلچسپی ہے جس میں ہر طرح کی تاریخ شامل ہے۔ اس کے علاوہ عام مطالعہ بھی ہوتا ہے جس میں سیاسیات بھی ہیں اور سماجیات بھی، دعوتی کتب بھی ہیں اور تحریکات کے سلسلے میں کتابیں بھی۔ حالاتِ حاضرہ سے باخبر رہنے کے لیے ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات ان میں جو بھی میسر ہیں ان کا بھی استعمال کرتا ہوں۔

سوال: گیارہ ستمبر 2001ء کا واقعہ تاریخ کا بڑا واقعہ سمجھا جارہا ہے۔ امریکہ کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملے کے بعد امریکہ کی قیادت میں مغربی دنیا نے اسلام اور امتِ مسلمہ کے خلاف باقاعدہ مہم چھیڑ رکھی ہے۔ آپ اس واقعے سے پہلے اور اس کے بعد بھی دنیا کی ایک بڑی تحریک اسلامی کے سربراہ رہے ہیں۔ لہٰذا اس پر اپنے تأثرات بتائیں؟

جواب: گیارہ ستمبر 2001ء کا واقعہ اور پھر اس کے بعد پیش آنے والے واقعات پر حضورؐ کا وہ ارشاد بار بار یاد آتا ہے۔ ''حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: عنقریب ایسا ہوگا کہ قومیں تم پر اسی طرح ٹوٹ پڑیں گی جس طرح کھانے والے کھانے کے پیالے پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ ایک شخص نے جب یہ معلوم کیا کہ کیا ایسا اس زمانہ میں ہماری قلتِ تعداد کی وجہ سے ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں، تم تو اس زمانہ میں کثیر تعداد میں ہوگے، لیکن تمہاری حیثیت کوڑے کرکٹ کی ہوگی یا اس خاشاک کی جو دریا اور سیلاب کے جھاگ کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے۔ اللہ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے رعب نکال دے گا اور تمہارے دلوں میں وہن (سستی اور کمزوری) ڈال دے گا۔ ایک شخص نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول وہن کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا دنیا کی محبت اور موت سے نفرت۔'' میرے خیال سے امت اسی دور میں داخل ہوگئی ہے۔

سوال: تحریک اسلامی کو نئی صورت حال سے نمٹنے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟

جواب: ہم یہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ صورت حال سے نکلنے کا راستہ یہی ہے کہ پوری قوت

کے ساتھ اپنے تمام ممکنہ وسائل وذرائع کو بروئے کار لاکر اسلام کے پیغام کو عام کیا جائے۔اس سلسلے میں اب تک جو غفلت ہوئی ہے اس کی تلافی کی جائے۔

سوال: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ تحریک اسلامی اس طرف گامزن ہے جس کا آپ اشارہ کر رہے ہیں؟

جواب: جماعت اس کام میں لگی ہوئی ہے اور آئندہ بھی ان شاء اللہ لگی رہے گی۔ یہ بات درست ہے کہ جتنی سعی اور لگن کی ضرورت ہے ابھی ہم اس سے پیچھے ہیں۔ ہمیں مستقبل کا احساس ہے۔ ہمیں اس کام میں اپنی پوری صلاحیت جھونک دینی چاہیے۔

سوال: آپ کے دورِ امارت میں جماعت پر ایک بار پابندی لگی تھی 1992ء میں بابری مسجد کے انہدام کے بعد تو اس سلسلے میں آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟ اس دوران بھی آپ نے برادرانِ وطن کی اہم شخصیات سے ملاقاتیں کیں۔ کچھ اہم تاثرات بتائیں؟

جواب: بابری مسجد کی شہادت کے بعد ملک میں یہ حالات پیدا ہوئے کہ ایک طرف مسلمانوں کا ردِ عمل تھا۔ صدمہ، غصہ اور اپنی بے بسی کا احساس تھا۔ دوسری طرف کام کرنے والے لوگ جو میدان میں کام کر رہے تھے انھیں یہ احساس ہوا کہ اب پہلے سے زیادہ پوری قوت اور توجہ کے ساتھ ہمیں دعوتی کام کو آگے بڑھانا چاہیے۔ اگر چہ بابری مسجد کی شہادت کے بعد جماعت اسلامی ہند پر بھی بے بنیاد پابندی لگی جس سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا، لیکن ان حالات میں بھی ہم اپنے موقف پر قائم رہے۔ اس دوران بھی اجتماعی شکل میں نہ سہی لیکن دعوت کے کام میں لگے رہے۔ ہم نے ملک کے دانشوروں اور سیاست دانوں سے ملنے کا سلسلہ شروع کیا اور اپنا موقف سمجھاتے رہے، بعض لوگوں نے اس کو سمجھا، بعض لوگ خاموش رہے۔ بہر حال وہ دور بھی ختم ہوا۔

سوال: تقسیم وطن سے پہلے بانی جماعت اسلامی مولانا مودودیؒ نے اپریل 1947ء میں مدراس میں اپنا مشہور خطبہ دیا تھا جس کے چار نکات ہیں۔ جس میں قومی کشمکش کا خاص طور سے ذکر تھا کہ اس سے کیسے نمٹا جائے۔ 1992ء میں بابری مسجد کے انہدام کے بعد ملک کے اندر منافرت اور عداوت کی لہر پھیلی۔ اس سے ایسا لگا کہ قومی کشمکش کھل کر سامنے آگئی۔ آپ کو کیا

محسوس ہوتا ہے جس قومی کشمکش کے خاتمے کے لیے مولانا مودودیؒ ہم لوگوں کو پیغام دے کر گئے تھے کیا ہم اس کے لیے تیار ہوئے؟ قومی کشمکش اور فرقہ وارانہ عصبیت جیسی برائیوں کے خاتمے کے لیے جماعت نے کیا کیا؟

جواب: مولانا مودودیؒ نے اس وقت جو بات کہی تھی اس وقت اس قومی کشمکش میں مسلمان بھی برابر کے شریک تھے یا کم سے کم ان کا ایک بڑا حصہ مسلم لیگ کی قیادت میں سرگرم تھا۔ مسلمانوں کو مستقبل کے بارے میں کچھ اندیشے تھے اور انھیں شکایت تھی کہ انڈین نیشنل کانگریس جو خود کو تمام ہندوستانیوں کی جماعت کہتی تھی، ان پر توجہ نہیں دے رہی ہے یا پھر خود انڈین نیشنل کانگریس کا ایک طبقہ مسلمانوں کی اس قوم پرستی کو بڑھاوا دے رہا تھا۔ بہرحال اسی کشمکش میں ملک تقسیم ہوا۔ آج اس ملک کی بڑی اکثریت اسلام سے اس طرح بے خبر ہے جیسا اس وقت تھی۔ اس لیے کہ ہم اس ملک کی بڑی اکثریت تک اسلام کی دعوت نہیں پہنچا سکے۔ اگرچہ اس سلسلے میں کام ہوا ہے، ہم نے مختلف زبانوں میں قرآن واحادیث اور دیگر اسلامی کتابیں شائع کی ہیں اور لوگوں تک انہیں پہنچایا ہے، لیکن اس کے باوجود یہ ملک انسانوں کا سمندر ہے۔ ابھی ہم ساحل پر کھڑے ہوئے ہیں، کچھ کنکری چن سکے ہیں۔ ہمارے سامنے سمندر ہے لیکن ہم ہمت ہارے بغیر اس کام کو جاری رکھنا چاہیں گے اور جب تک یہ بے خبری رہے گی اس وقت تک مسائل مختلف شکلوں میں ابھرتے رہیں گے۔

سوال: جماعت کی موجودہ کوششوں کا کچھ ذکر فرمائیں؟

جواب: بحمداللہ آج بھی جماعت اسلامی قومی کشمکش کے اثر سے خود کو بچائے ہوئے ہے اور اس بات کی کوشش کر رہی ہے کہ وہ ایک اصولی جماعت کی طرح ابھرے۔ اس کوشش کو ہم رفتہ رفتہ ہی آگے بڑھائیں گے۔ لوگوں تک بات پہنچے گی اور لاعلمی دور ہوگی۔

سوال: کیا آپ کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ قومی کشمکش کے ازالے پر مولانا مودودیؒ نے جتنا زور ڈالا تھا اس پر شاید اتنی توجہ نہیں کی جا سکی جس کے سبب یہ حالات پیدا ہوئے؟

جواب: یہ بات درست ہے کہ مولانا مودودیؒ نے نہایت شدت کے ساتھ اس مسئلے کو پیش کیا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد جماعت اسلامی ہند نے اس پر فوری اور خصوصی توجہ بھی دی لیکن

مسلمانانِ ہند کے لیے حالات اس قدر سنگین ہوگئے تھے کہ انہیں سنبھالنا پوری مسلم قیادت کی اولین ذمہ داری بن گئی۔ نفرت کا ماحول گرم تھا۔ فسادات ہورہے تھے۔ مسلمان بحثیت مجموعی احساس کمتری میں مبتلا ہوگئے تھے۔ ان حالات میں ان کی کسی بھی جماعت کی طرف سے قومی کشمکش کے خاتمے کی کوشش بارآور ثابت نہیں ہوسکتی تھی۔ حالات کا منفی اثر ہمارے کام پر بھی پڑا، اگرچہ ہمارے پاس مولانا مودودیؒ کی ہدایات تھیں، لیکن اس کے باوجود ہم غیر شعوری طور پر اس کے شکار ہوتے رہے۔

سوال: آپ کے دور میں جماعت نے اپنا دائرۂ کار وسیع کرتے ہوئے ملک وملت دونوں کے مسائل میں گہری دلچسپی لی۔ مثلاً ملت کی اہم شخصیات کے ساتھ مل کر ملت کے مسائل حل کرنے کی کوشش کی۔ آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کو مضبوط اور مستحکم بنانے کی کوشش نیز کئی ذمہ دار شخصیات کو ساتھ لے کر ایف ڈی سی اے (فورم برائے جمہوریت وفرقہ وارانہ ہم آہنگی) قائم کیا۔ آپ کے خیال میں یہ کارکردگی کیسی رہی؟

جواب: اس سلسلے میں ہم نے کام کا آغاز تو کیا لیکن کوئی اچھی رفتار سے بہت زیادہ آگے نہیں بڑھ سکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کسی نئی راہ کو اختیار کرتے ہوئے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ ایک چیز کے جب ہم عادی ہوجاتے ہیں تو اس کے برعکس کوئی دوسری رائے دینا تحریکوں کے لیے بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔

سوال: آپ نے اپنے کام کا دائرہ وسیع کیا، ملی کاموں میں دلچسپی لی تو کیا اس دوران آپ کا ترجیحی کام یعنی کارِ دعوت متاثر بھی ہوا؟

جواب: میرے خیال میں یہ بالکل متاثر نہیں ہوا بلکہ برادرانِ وطن تک دعوت پہنچانے کے کام میں تیزی آئی۔ پہلے کے مقابلے اس جانب زیادہ توجہ ہوئی اور اب اس رخ پر گاڑی جارہی ہے مگر اسے مزید تیز کرنے کی ضرورت ہے۔

سوال: جماعت اسلامی کو مولانا مودودیؒ نے 1941ء میں اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ قائم کیا تھا۔ اس میں جس چیز کو بڑی اہمیت تھی وہ دعوت وتبلیغ تھی اور اس میں برادرانِ وطن اصل ہدف تھے۔ مسلمانوں کی اصلاح بھی اہم پہلو تھا لیکن آپ کے دور میں ایسا لگا کہ ملی

مسائل میں جماعت زیادہ ملوث ہونے لگی، زیادہ توجہ آپ کی اس جانب مرکوز رہی جب کہ اس سے قبل جماعت نے ان مسائل پر اتنی توجہ نہیں دی تھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ ایک اور اہم واقعہ ہوا۔ وہ یہ کہ ریزرویشن کی تحریک جواَب بہت زوروں پر ہے اسی زمانے میں شروع ہوئی۔ سید حامد صاحب اور سید شہاب الدین صاحب کے ساتھ مولانا مونس صاحب بھی اس میں پیش پیش تھے۔ کیا یہ کام بھی جماعت تحریک کی خیر خواہی کے لیے کر رہی تھی؟

جواب: اس میں کوئی تضاد نہیں اس لیے کہ اسلام جہاں ایک پیغام دعوت ہے اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے ملت کو برپا کیا اور اس ملت کو ذریعہ بنایا اس پیغام کو عام کرنے کے لیے تاکہ قیامت تک یہ کام جاری رہے۔ اس ملت کے تشخص کے لیے ان مسائل پر توجہ رکھنا ضروری ہے۔ اس کام کو بھی آپ دعوت سے علیحدہ نہیں کر سکتے اس لیے کہ کارِ دعوت آگے بڑھے گا تو اسی ملت کے ذریعے سے آگے بڑھے گا۔ اگر ہر کام میں اسلام کی فکر کو غالب رکھیں تو کوئی خطرہ نہیں ہے۔

سوال: چھ سال قبل جب آپ اپنے دیرینہ رفیق ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری صاحب کو امارت کا چارج دے رہے تھے تو آپ کا احساس کیا تھا؟ خاص طور سے اس لیے کہ آپ اس رفیق کو ذمہ داری سونپ رہے تھے جن کا اپنا وژن تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب بھی امارت تبدیل ہوتی ہے تو آنے والے شخص کی پسند اور ناپسند کے تحت تحریک راستہ اختیار کر کے آگے بڑھتی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: یہ خیال بڑی حد تک درست ہے لیکن جماعت کے فیصلے بہرحال اجتماعی ہوتے ہیں جن میں امیر جماعت کا اپنا ذہن اور اپنا وژن بھی کام کرتا ہے۔

سوال: کیا آپ یہ محسوس نہیں کرتے کہ جب ملی اور ملکی مسائل میں جماعت نے دلچسپی لی تو اس کو ضرورت تھی لیکن اس سے ایک نقصان جو بعض لوگ محسوس کرتے ہیں وہ یہ ہوا کہ ملت میں مزید انتشار ہوا۔ مثال کے طور پر ملت کمزور حالت میں رہی۔ یہ وہی دور تھا جب قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی قیادت میں ایک دوسری تنظیم نے جنم لیا جس کا نام ملی کونسل ہے۔ آج ملی کونسل اپنی جگہ پورے زور وشور کے ساتھ قائم ہے۔ یہ آپ کے ہی دور میں ہوا۔ اس طرح جماعت کی

ملی اور ملکی مسائل میں دلچسپی کے سبب ایک اور تنظیم مسلمانوں کی بن گئی ورنہ اس سے قبل بڑا اعتماد نظر آتا تھا گویا جماعت نے جب دلچسپی لی تو ملت میں مزید انتشار پیدا ہوا۔ اس پورے واقعے کو آپ کیسے دیکھتے ہیں؟

جواب: ان دنوں کی بات میں عرض کروں جب ملی کونسل قائم ہونے جارہی تھی۔ قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ اور ڈاکٹر منظور عالم صاحب میرے پاس لکھنؤ سے تشریف لائے۔ ملاقات کی اور مولانا علی میاں کا پیغام پہنچایا۔ ان کا ایک کنونشن ان دنوں ممبئی میں ہونے جارہا تھا جس میں ملی کونسل کی تشکیل پر بات ہونی تھی۔ اس وقت میں نے ان حضرات سے یہ عرض کیا تھا کہ ملت کے ان مسائل کے سلسلے میں جو آپ ایک نئی تنظیم کی ضرورت محسوس کررہے ہیں تو کیوں کررہے ہیں جب کہ مسلم مجلس مشاورت موجود ہے اس سے یہ کام لیا جاسکتا ہے۔ اس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ نہیں وہ سرد پڑگئی ہے اور فعال نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ جو افراد اس میں ہوں گے یہی لوگ تو مسلم مجلس مشاورت ہیں۔ یہ لوگ اگر یہاں کچھ نہیں کرسکے تو وہاں جاکر کیا کریں گے۔ میں نے کہا کہ میں اس کے لیے خود کو آمادہ نہیں پاتا۔ اس کے بعد لکھنؤ میں ایک نشست مسلم پرسنل لا بورڈ کی ہوئی جس میں اہم لوگ شامل تھے۔ مولانا علی میاںؒ، مولانا نظام الدین صاحب، بنات والا، ابراہیم سلیمان سیٹھ جو ملی کونسل کا دستور بناکر لوٹ رہے تھے، اس میں بھی شامل ہوئے۔ اس موقع پر بنات والا صاحب نے کہا کہ ملی کونسل سے مرعوبیت کی کیا ضرورت ہے؟ بننے دیں اور انہیں کام کرنے دیں۔ اس کے جواب میں میں نے کہا کہ میں نہیں سمجھتا کہ یہاں موجود ہمارے بزرگ ملی کونسل کی مرعوبیت کا شکار ہیں اور میں تو یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں اس کا شکار نہیں ہوں۔ میرا سوال تو صرف یہ ہے کہ آخر ملی کونسل ہے کیا؟ اس وقت ابراہیم سلیمان سیٹھ نے کہا کہ میں بھی نہیں جانتا کہ ملی کونسل کی حیثیت کیا ہے جب کہ وہ دستور بناکر آئے تھے۔ میں نے کہا کہ یہ واضح کریں کہ ملی کونسل کس چیز کا نام ہے؟ آخر اس کا مقصد کیا ہے؟ ہم نے پوچھا کہ مسلم مجلس مشاورت کے رہتے ہوئے ملی کونسل بنانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ افراد وہی ہیں جو مشاورت میں تھے تو وہاں جاکر کیا نیا کام کریں گے؟ اس کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

سوال: آپ اسے مانتے ہیں کہ انتشار پیدا ہوا؟ جماعت اسلامی ملی مسائل میں اگر اتنی دلچسپی نہ لیتی تو شاید یہ صورت پیدا نہ ہوتی۔ اس پر آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: یہ تأثر قطعی صحیح نہیں ہے کہ ہمارے دلچسپی لینے کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا۔

سوال: جماعت جس طرح دعوت وتبلیغ میں پہلے منہمک تھی اگر اس رخ پر کام کرتی تو شاید اس طرح کا ٹکراؤ نہیں ہوتا؟

جواب: میں نہیں سمجھتا کہ جماعت اگر اپنے آپ کو دعوت تک ہی محدود رکھے گی تو اس طرح کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔

سوال: 1990ء میں آپ نے جماعت کی قیادت ایک ایسے وقت سنبھالی تھی جب ایک اہم موضوع الیکشن پر جماعت میں دو رائیں تھیں اور دونوں طرف جذبات شدید تھے۔ آپ نے اتنے نازک وقت میں قیادت سنبھالی اور پورے تیرہ سال قیادت کی اور وہ مسئلہ یا تو خود بخود سرد خانے میں چلا گیا یا خوش اسلوبی سے جماعت کو متحد رکھا گیا۔ ہمارے ایک بزرگ شفیع مونس صاحب آپ کے دور کو اس لحاظ سے اہم ترین دور کہتے ہیں جب کہ یہ اندیشہ تھا کہ خدانخواستہ ناخوشگوار صورت نہ پیدا ہو جائے۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

جواب: جماعت کا نازک دور 1980 سے 1990ء تک کا ہے۔ ہماری امارت 1990ء میں آئی ہے۔ سکریٹری کی حیثیت سے پورے ہندوستان کا دورہ میں نے اسی دور میں کیا۔ 1984ء سے لے کر 1988ء کے نصف تک۔ دسمبر 1981ء میں شوریٰ ہوئی تھی۔ اس میں فیصلہ ہوا تھا الیکشن میں ووٹ دینے کے سلسلے میں۔ مولانا ابواللیثؒ نے آکر اس کو عمل میں لانے کی کوشش کی۔ وہ مولانا یوسفؒ کا دور تھا۔ 1982ء میں مولانا ابواللیثؒ نے چارج لیا۔ جماعت اسلامی ہند کی تاریخ میں 1980ء اور 1990ء کے درمیان ڈاکٹر حسن رضا کی بات یاد آتی ہے۔ نمائندگان میں انھوں نے تقریر میں کہا تھا کہ آپ نے اپنے سکریٹری کے عہدے پر رہتے ہوئے یہ بات کہی تھی کہ جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ جماعت اسلامی کو انتخابات میں حصہ لینا چاہیے وہ یہ خیال نہ کریں کہ جو لوگ اس کے قائل نہیں ہیں وہ کوئی قدامت پسند یا جمود پسند ہیں۔ یہ بات غلط ہوگی کیونکہ دونوں نہایت مخلص ہیں اور دونوں کے خیال میں صرف فرق ہے۔ ہم کو اس فرق کو اپنے حدود میں رکھتے ہوئے کام کو جاری رکھنا چاہیے۔

سوال: ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰؒ جو جماعت کے اہم ستون سمجھے جاتے تھے ان کے رخصت ہونے پر آپ کے کیا تاثرات تھے؟

جواب: کسی بھی نظریاتی تحریک میں اختلاف کا ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ اس طرح کے مراحل آتے ہیں تو ایسے میں یہ ہوتا ہے کہ کتنے لوگ بکھر جاتے ہیں۔ ہمیں ان کے جانے کا احساس ضرور ہوا۔

سوال: شفیع مونس صاحب سے آپ کو کیا معاونت ملی؟

جواب: جماعت کو انتشار سے بچانے میں مولانا مونس صاحب کا اہم رول ہے۔ انھوں نے اختلاف رائے کے باوجود ہر طرح کا تعاون کیا۔

سوال: آپ الحمدللہ 1951ء سے تحریک سے وابستہ ہیں اور تیرہ سال تک تحریک کی ذمہ داری بھی نبھائی اور اب امارت سے سبکدوش ہوئے چھ برس گزر گئے۔ براہِ کرم یہ بتائیں کہ آپ کے نزدیک جماعت کی موجودہ پوزیشن کیا ہے؟ یہ کس مقام پر کھڑی ہے؟

جواب: جماعت اسلامی کے سلسلے میں اس دوران جو کچھ بھی کام ہوسکا ہے اس کی بدولت یہ ایک منظّم اور پرامن جماعت کی حیثیت سے پہچانی جانے لگی ہے۔ پورے ملک کے اندر اس کے نظریات یا اصول سے چاہے کوئی اتفاق کرے یا اختلاف کرے لیکن یہ کوئی ایسی تحریک نہیں ہے جس سے ملک کو کوئی نقصان پہنچے گا۔ اس میں شامل لوگ امن پسند ہیں، آئین پسند ہیں، قانون کے پابند لوگ ہیں۔ یہ مزاج عام لوگوں کا بڑی حد تک بن چکا ہے۔ اس لیے جماعت اسلامی کے سلسلے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے کچھ لوگ کچھ غیر ضروری بات کہتے ہوں لیکن عام آبادی اب یہ سمجھنے لگی ہے۔ اس کے باوجود ہمیں مطمئن ہوکر بیٹھنا نہیں چاہیے بلکہ جماعت اسلامی کے پیغام سے متعارف کرانے کا یہ بہت بہتر وقت ہے کہ ہم اپنے اس بنے ہوئے امیج کی بنیاد پر کھڑے ہوکر اپنی دعوت کو آگے بڑھائیں اور کسی بھی فرد یا تحریک کے لیے امیج کافی اہمیت رکھتی ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے خود یہ فرمایا ہے: اے رسولؐ! آپ فرما دیجیے کہ میں چالیس سال تم میں گزار چکا ہوں۔ جماعت کی امیج میں مزید بہتری آئے گی۔ جماعت کو اس فکر سے کبھی خالی نہیں ہونا چاہیے کہ اس کی اصل حیثیت سامنے آئے۔ ایک خدا پرست، انسان دوست اور محبّ وطن گروپ کی حیثیت سے اس کا تعارف ہو۔

مولانا ابواللیث اصلاحی مرحوم کی وفات پر

وہ ایک اچھے قائد کی حیثیت سے متعارف تھے

مولانا سراج الحسن صاحب سے یہ انٹرویو سابق مدیر ماہنامہ رفیق منزل مولانا طارق فارقلیط مرحوم نے لیا تھا، یہ انٹرویو رفیق منزل کی خصوصی اشاعت ''مولانا ابواللیث اصلاحی نمبر'' میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں اسے مولانا ابواللیث اصلاحی مرحوم کی حیات وخدمات پر شائع کتاب ''رہبر کارواں'' (اشاعت اول، جنوری ۲۰۱۴ء، شائع کردہ: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی) میں بھی شامل کیا گیا۔

سوال: سابق امیر جماعت مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی سے آپ کی پہلی ملاقات کب ہوئی؟ کب تعارف ہوا؟

جواب: مولانا سے میری ملاقات گویا ان کا دیدار نومبر 1952ء میں لکڑ کوٹ حیدرآباد میں منعقد ایک کل ہند اجتماع میں ہوا۔ ہم لوگ اجتماع کے انتظامات میں مصروف تھے۔ مولانا صبغت اللہ صاحب استقبال کرنے والوں میں تھے، وہ جب مولانا کو اپنے ساتھ لائے تو پورا قافلہ وہاں پہنچا اور تعارف ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ مولانا ابواللیث صاحب ہیں۔ بس اس وقت میں نے ان کو دیکھا۔ یہ تعارف یک طرفہ تھا۔ 1952ء میں ہمدرد کی اصطلاح تھی اور اس وقت میری حیثیت ایک ہمدرد کی تھی۔ چند مہینے ہوئے تھے کام کرتے ہوئے۔

سوال: پہلی ملاقات میں آپ کا کیا تأثر تھا؟

جواب: بس دیکھا دبلے پتلے آدمی، سیدھے سادے لباس میں، نوجوان سے، مولانا کوئی 39 سال کے رہے ہوں گے اور اگر 1912ء کی پیدائش مانی جائے تو 40 سال کے ہوئے۔

1952ء میں کوئی خاص تأثر نہیں تھا۔ مولانا ذمہ دار تھے احترام ومحبت کی نگاہ تھی بس۔

سوال: مولانا مرحوم سے ایک لمبی مدت تک آپ کے تعلقات رہے ہیں۔ امیر حلقہ، سکریٹری جماعت اور پھر امیر جماعت کی حیثیت سے آپ کے تعلقات رہے۔ امیر حلقہ کی حیثیت سے آپ نے ان کو کیسا محسوس کیا؟ امرائے حلقہ جات کو وہ کس طرح ٹریٹ کرتے تھے؟

جواب: جہاں تک مولانا سے میرے شخصی تعلقات اور مراسم کی بات ہے تو اس کا واسطہ تو فی الواقع جماعت ہی تھی۔ مولانا سے میری دوسری ملاقات 1956ء میں حیدرآباد کے اجتماع میں ہوئی، اس وقت ذرا دوطرفہ تعارف ہوا۔ ہم اس وقت بھی ہمدرد ہی تھے۔ تفصیلی تعارف تو امیر حلقہ بننے کے بعد ہوا، جب ہم امیر حلقہ کی حیثیت سے حیدرآباد میں چار حلقوں کے ایک منتخب اجتماع میں شریک ہوئے۔ اس کے بعد شخصی حیثیت سے بھی مولانا سے ملاقات، تعلقات اور تعارف بڑھے اور ہمارے تعلقات اور وابستگی میں پھر کبھی وقفہ نہیں ہوا۔ یعنی میرے اور مولانا کے تعلقات کبھی سرد نہیں ہوئے۔ اس طویل دور میں ان کے انتقال تک بھی ہمارے تعلقات ان سے بڑے خوشگوار اور بڑے اچھے رہے۔ بڑی شفقت فرماتے تھے وہ اور بڑی محبت۔ ہمیشہ جو چیز مختلف لوگوں کی زبانی مجھ تک پہنچتی رہی وہ شخصی طور پر بھی ہمارے لیے کلماتِ خیر ہی کہا کرتے تھے۔

سوال: آپ کو تو ان کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہوگا؟ آپ نے ان کی زندگی کے گویا کتنے پہلو محسوس کیے؟

جواب: ایسا ہے بھائی کہ زندگی کے تو انیک پہلو ہیں، زندگی کیا ہے؟ ایک مفصل کتاب ہے۔

سوال: مولانا! اگر آپ کو تجزیہ کرنا ہو، ایک دو تین، چار تو کیسے کریں گے؟

جواب: ویسے مولانا کی عظمت، بزرگی، کردار کی بلندی، استغناء اور ان کے اندر جو ایک طرح کی استغنائیت تھی نفس میں، قلب میں وہ بڑی خاص چیز تھی۔ اچھا اور گہرا کردار وعمل، خدا کی محبت، خدا کا خوف، خدمت کا جذبہ، یہ سب چیزیں بڑی نمایاں اور متاثر کرنے والی تھیں۔ پھر ان کی سادگی، شرافت، شرافت نفسی، یہ سب چیزیں متاثر کرنے والی تھیں۔ ویسے کوئی بھی

شخصیت دنیا میں نہ مکمل ہے اور نہ مکمل ہوسکتی ہے اور نہ خامیوں اور کمیوں سے پاک ہوسکتی ہے۔ خامیاں اور کمیاں سب میں ہیں اور ہوسکتی ہیں۔ بحیثیت مجموعی خوبیوں کا، خیر کا پہلو غالب اور نمایاں تھا۔ تحریک اسلامی کے قائد کی حیثیت میں وہ ایک اچھے قائد کی حیثیت سے گویا کہ وہ متعارف بھی تھے اور اچھے قائد تھے بھی۔ ویسے بعد میں ان کی صحت بھی کچھ متاثر ہوئی اور جذبات وغیرہ میں ایک طرح کی پژمردگی اور ایک طرح کی فکرمندی یعنی امارت کے آخری سالوں میں پائی جاتی تھی اور محسوس بھی ہوتی تھی۔

سوال: ان کی علمی شخصیت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: ویسے مولانا نے اپنے اس دور میں جب وہ سرائے میر پڑھا کرتے تھے یا ندوہ میں علماء اور بزرگوں سے استفادہ کیا، یا وہاں ''الضیاء'' نکلتا تھا اور اس میں مضمون لکھا کرتے تھے تو اس دور میں مولانا نے کچھ علمی کام کیا لیکن بعد میں تحریکی کاموں میں کسی علمی کام کا انھیں موقع نہیں ملا۔ ایسا نہیں ہے کہ ان میں صلاحیتیں نہیں تھیں بلکہ تمام صلاحیتیں ان کے اندر موجود تھیں لیکن تنظیمی اور تحریکی مشغولیات کی وجہ سے کوئی خاص کام تحقیقی انداز کا وہ نہیں کر پائے۔

سوال: تقسیم ہند کے بعد ہندوستان اور پاکستان دونوں کے حالات آپ کے سامنے ہیں، کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ ہندوستان میں اگر مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی کے علاوہ کوئی اور قائد ہوتا تو کیا جماعت کو کسی اور رخ پر ڈائنامک انداز میں لے کر چلتا یا یہ کہ یہ موزوں ترین فرد تھے جو جماعت کو ملے؟

جواب: ایک تو اس وقت افراد کا سرمایہ ہی بہت مختصر تھا اور جو افراد بھی ہندوستان میں رہ گئے تھے ان میں سے بہتر آدمی کا انتخاب جماعت نے کیا اور اس بہتر آدمی نے اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے جو بہتر سے بہتر خدمت انجام دی جاسکتی ہے یا جس کی توقع کی جاسکتی ہے اس کی اپنی حد تک کوشش کی اور اس کے بڑے فائدے بھی ہوئے۔

سوال: مولانا مرحوم کے بارے میں ایک بات کہی جاتی ہے کہ شروع میں ان کی گرفت جماعت پر بہت مضبوط رہی اور بہت حوصلے کے ساتھ انھوں نے جماعت کی قیادت کی لیکن بعد میں یہ گرفت کچھ کمزور ہوگئی تو یہ بات کہاں تک صحیح ہے؟

جواب: جہاں تک گرفت کمزور ہونے کی بات ہے تو آزادی کے بعد جب ذرا ہندوستان کے حالات ٹھیک ہوئے، ذہنی سکون ہوا اور جماعت کے ارکان کو مل بیٹھنے کا موقع ملا تو انھوں نے غور کیا، اپنی قوت کو سمیٹا اور اپنا امیر منتخب کیا۔ اس وقت سے 1972ء تک مسلسل مولانا 24 سال تک جماعت کی امارت پر فائز رہے۔ 1956ء میں دستور سازی کے بعد گویا ہر چار سال پر دستوری لحاظ سے انتخابی عمل انجام دیا جاتا تھا، اس کے تحت بار باران کا مسلسل انتخاب ہوتا رہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مختلف دور آدمی کے حوصلوں، امنگوں اور امیدوں کے آتے رہتے ہیں۔ شروع شروع میں بڑی تازگی ہوتی ہے۔ عزم اور حوصلے جوان ہوتے ہیں اور آدمی بڑی قوت سے کام کرتا ہے، ہوا بھی ایسا ہی، شروع شروع میں مولانا نے بڑے عزم وحوصلے سے کام کیا۔ خصوصاً اس نازک دور میں تو ان کی امیدیں، ان کی امنگیں اور ان کے حوصلے بہت جوان تھے، وہ خود بھی جوان تھے، اس وقت بڑی ضرورت تھی اس کی۔ آزادی کے بعد اس مخدوش اور پُرخطر دور میں بڑے عزم اور حوصلے سے جماعت کی قیادت کرنا، اس کی رہنمائی کرنا، مختلف مسائل سے نپٹنا اور ان کا سامنا کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی اور مولانا نے بڑی بلند حوصلگی کے ساتھ اسے نبھایا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں مختلف مسائل میں انھیں محسوس ہوا کہ جس لائن پر میں جماعت کو چلانا چاہتا ہوں اور جس رخ پر لے جانا چاہتا ہوں اس میں مجھے کامیابی نہیں ہو رہی ہے تو اس کا اثر ان کے حوصلے اور کارکردگی پر بھی پڑا۔

سوال: کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ ہندوستان میں جماعت اسلامی کو جس لائن پر چلنا چاہیے یا جس لائن پر چلائی جانی چاہیے تھی، کیا اسی لائن پر وہ چل رہی ہے یا چلائی جاتی رہی ہے؟

جواب: دیکھئے! یہ مضمون بہت اہم ہے مگر آسان نہیں ہے۔ اس پر گفتگو اور رائیں مختلف بھی ہوسکتی ہیں اور ہیں۔ میری اپنی بھی ایک رائے ہے مگر اس کی حیثیت ذاتی رائے کی ہے۔ اس کے علاوہ اور چیزوں پر بھی نظر ڈالنی ہوگی۔ پورے حالات کو سامنے رکھنا ہوگا۔ اس میں کیا ہونا چاہیے تھا؟ کیا ہوسکا؟ کیا کچھ کیا گیا، کیا کچھ کیا جاسکتا تھا؟ یہ ساری چیزیں آتی ہیں تو اس لیے میرے خیال میں اس موضوع پر اوّل تو گفتگو بڑی مفصل چاہیے اور اس کی حیثیت بہرحال انفرادی ہوگی اور رائیں مختلف ہوں گی۔

سوال: پھر بھی آپ اپنی رائے کا اظہار تو کر ہی سکتے ہیں خواہ وہ انفرادی رائے ہی سہی؟

جواب: ویسے طبعاً تو خارجی طور پر آزادی کے بعد جو حالات، موانع اور مشکلات رہی ہیں اور تحریک افرادی قوت کے اعتبار سے، مادی وسائل کے اعتبار سے ایک بہت ہی قلیل اور کثیر المسائل تحریک تھی۔ یہ صورت حال تھی، کچھ کرنا چاہیں تو وسائل میسر نہیں اور افراد میسر نہیں۔ تو کچھ کاموں کے نہ کر سکنے کے کچھ اور وجوہ ایسے ہیں جن پر قابو پانا ہی مشکل تھا۔ ایک تو افراد ہی کم اور دوسرے باصلاحیت اور بہت ہی اونچے درجے کے افراد اور بھی کم تو اس لیے بہت سے کام جو ہونے چاہیے تھے (نہیں ہو سکے)۔ میرا اپنا خیال ہے کہ نئے حالات میں بہت ہی گہری نظر سے جائزہ لے کر تحریک کے نصب العین کو سامنے رکھ کر، نئے حالات کو سامنے رکھ کر، کتاب وسنت کی روشنی میں ایک نئے تخلیقی ذہن اور گہری فکر کے ساتھ سوچنے، کچھ فیصلہ کرنے اور کچھ کرنے کی ضرورت تھی، وہ ضرورت بہر حال باقی رہی، اس میں کچھ ہو نہ سکا۔ بس ایک لائن پر چلتی رہی جس لائن پر پہلے تھی۔

سوال: ابھی آپ نے اشارہ کیا کہ مولانا جماعت کو ایک نئے رخ پر لے جانا چاہتے تھے لیکن جب وہ اس رخ پر نہیں لے جا سکے تو ان کو کچھ مایوسی سی ہوئی...... (م بں! مایوسی نہیں بلکہ یہ احساس سا ہوا کہ گویا ایک طرح سے ان معاملوں میں ہم لوگوں کو ہم خیال نہیں بنا سکے ہیں) تو وہ رخ کیا تھا جس پر مولانا لے جانا چاہتے تھے؟

جواب: وہ یہ کہ یہاں — ہندوستان کے نئے حالات میں یہاں کی تمام قومی سماجی اور سیاسی تنظمیں پوری طرح شامل اور داخل ہوں۔

سوال: مولانا! اس سے ملتا جلتا ایک سوال ہے کہ مولانا مودودیؒ نے تقسیم سے قبل ایک نقشہ بنایا تھا جس میں چند نکات تھے جس کو انھوں نے مدراس کے اجتماع میں پیش کیا تھا تو کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ وہ یہاں کام کرنے کے لیے موزوں ترین نکات تھے جن پر جماعت اسلامی کو چلایا جا سکتا تھا یا اس کے علاوہ کچھ اور چیزیں یا نکات لائے جا سکتے تھے؟

جواب: وہ 1947ء کی بات ہے۔ اگست 1947ء میں ہندوستان آزاد ہوا اور وہ اجتماع مدراس میں اپریل میں ہوا تھا۔ مولانا نے اس میں چار نکاتی لائحۂ عمل رکھا تھا۔ اس وقت کے

تمام حالات کو سامنے رکھ کر اس کا تجزیہ کرتے ہوئے اور مستقبل قریب میں جو امکانات دکھائی دے رہے تھے اور حالات کا جو رخ تھا اس کو سامنے رکھ کر کے وہ چار نکاتی پروگرام رکھا تھا۔ انہی نکات کے اوپر نہ صرف یہ کہ کام کرنے کی ضرورت تھی بلکہ پھر نئے حالات میں اس پر غور کیا جاتا اور ضرورت پر اس میں اضافے بھی کیے جاتے لیکن تقسیم اور آزادی کے فوری بعد جو حالات تھے گویا کہ جماعت کا پورا نظم ہی منتشر ہو گیا تھا، ان کو جمع ہونے اور جڑنے میں کئی مہینے لگ گئے اور جب جڑے اور جمع ہوئے تو ایک ڈیڑھ سال اور لگ گئے اور حالات فوری توجہ کے طالب تھے، لوگ دوڑ رہے تھے، بھاگ رہے تھے، خوف و ہراس طاری تھا۔ ہر طرف آگ لگی ہوئی تھی پھر بھی جب ذرا سا سکون ہوا اور حالات معمول پر آئے تو ان نکات پر کام کرنے کی ضرورت تھی مگر افرادی سرمایہ بہت مختصر تھا لہٰذا ان نکات پر جیسا حق ہے ویسا کام نہیں کیا جاسکا۔ مثلاً اس کا ایک نکتہ یہ بھی تھا کہ علاقائی زبانوں میں اپنے پیغام اور اپنے لٹریچر کو منتقل کرنا چاہیے، اس پر زور تو دیا جاتا رہا لیکن کتنے سالوں بعد عملاً یہ کچھ شروع ہوسکا، حالانکہ یہ اور پہلے ہونا چاہیے تھا۔

سوال: موجودہ حالات میں جماعت کے اندر کچھ تبدیلیوں کی ضرورت ہے یا جس انداز میں ہم چل رہے ہیں اسی انداز میں چلنا چاہیے؟

جواب: دیکھئے! ایک تو یہ کہ کس طرح چلنا چاہیے؟ کس رخ پر چلنا چاہیے؟ اس کے سلسلے میں شوریٰ تمام حالات پر غور و فکر کر کے پروگرام بناتی ہے۔ یہ جو ہمارا موجودہ میقاتی پروگرام ہے جو 1990ء سے شروع ہوا اور 1994ء تک کے لیے ہے ان سب کو سامنے رکھ کر ہی بنایا گیا ہے تو اگر ہم اپنے پروگرام پر پوری یکسوئی، دلجمعی، توجہ، سرگرمی اور مستعدی کے ساتھ عمل درآمد کریں تو کچھ کر سکتے ہیں اور نصب العین کی سمت میں اچھی رفتار سے آگے بڑھ سکتے ہیں۔ اب رہا کہ کیا کچھ اور کرنا چاہیے تو ویسے سوچا تو بہت کچھ جاسکتا ہے اور کہا بھی بہت کچھ جاسکتا ہے لیکن جو کچھ بھی سوچا گیا ہے اور کہا گیا ہے ضرورت ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ اس وقت تک ہم یہی کہیں گے کہ ہمارا میقاتی پروگرام ہمارے سامنے ہو اور اس پر پوری یکسوئی اور سرگرمی سے عمل ہونا چاہیے۔

سوال: مولانا! موضوع سے ہم ذرا ہٹ گئے ہیں اور جب ہٹ گئے ہیں تو ایک سوال اور کر لیتے ہیں اور وہ یہ کہ رفقاء میں یہ احساس پایا جاتا ہے کہ ہمارا منصوبہ ایک لانگ ٹرم منصوبہ ہے اور اپنے مقصد اور نصب العین کے حصول کے لیے ایک لمبی مدت تک جدوجہد کرنی پڑے گی تو کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ رفقاء کے اندر مایوسی کی جو کیفیت محسوس ہو رہی ہے وہ کسی شارٹ ٹرم منصوبہ سے ختم کی جاسکتی ہے۔

جواب: اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ نصب العین چند مہینوں یا چند سالوں کا تو نہیں ہے۔ یہ تو ایک ایسا نصب العین ہے جس کے لیے طویل المدت جدوجہد کی ضرورت ہے۔ یہ نسلوں کا کام ہے اور نصب العین پر آنکھیں بند کر کے اس معنی میں کہ اس نصب العین کو سامنے رکھ کر پوری یکسوئی کے ساتھ، پوری قوت سے بس کام کرتے چلے جانے کی ضرورت ہے۔

اس لحاظ سے ایک طویل المدتی پروگرام لانگ ٹرم پروگرام بھی چاہیے اور اس کے لحاظ سے ایک قلیل المدتی پروگرام بھی چاہیے۔ تو ہمارا جو یہ چار سالہ میقاتی پروگرام ہے وہ قلیل مدتی ہے، طویل مدتی نہیں ہے۔ یہ سمجھئے کہ یہ طویل مدتی پروگرام کا ایک حصہ ہے۔ اس میں جو مصالح رکھے گئے ہیں، اس میں جو لائن بتائی گئی ہے اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے اور اس پر عمل درآمد کی ضرورت ہے۔

سوال: مولانا ابواللیث صاحب کے بارے میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ مولانا بات اس طرح کہتے تھے کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے یعنی ہماری بات بھی ہو جائے اور ہم کہیں پھنسیں بھی نہ اور نکل بھی جائیں تو آپ کا کیا خیال ہے تحریک اسلامی کو اس طرح کا اسلوب اختیار کرنا چاہیے یا بات دوٹوک انداز میں کہنی چاہیے؟

جواب: بات تو وہی ہوتی ہے، کہنے کے انداز کا فرق مختلف وجوہ سے لازماً ہوتا ہے اور ہوا کرتا ہے۔ وہ کہنے والے کی شخصیت، اس کے بات کرنے کا انداز، اس کے فہم کی سطح، اس کے فکر ونظر کی وسعت و گہرائی اور اس کے اپنے نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر یا ان مسائل پر اظہارِ خیال کرنے میں حالات کی نزاکت، ان سب چیزوں کو سامنے رکھ کر ایک آدمی کوئی بات کہتا ہے، تو مولانا ابواللیث صاحب کے کہنے کا ایک انداز تھا اور لوگ عام طور پر یہ کہتے ہیں کہ مولانا

کی بعض باتیں کبھی واضح نہیں ہوتی تھیں لیکن بہت سے لوگوں کو یہ بات بہت اپیل بھی کرتی تھی، رائے مختلف ہے۔ ویسے میرے خیال میں بات بہت واضح اور صاف کہنی چاہیے۔ چاہے مختصر انداز میں کہے، جامع انداز میں کہے، بہرحال دوٹوک انداز میں کہنی چاہیے۔ اب ہم خود کہاں تک یہ کہہ سکتے ہیں اور کہاں تک کہہ پائے ہیں، ہمیں تو نہیں معلوم مگر ہونا یہی چاہیے۔

سوال: ایک طویل مدت تک تقریباً 32یا33 سال تک مولانا نے جماعت کی قیادت کی اور اس کے امیر جماعت رہے تو اس طویل مدت میں کبھی شوریٰ نے ان کے اندازِ بیان پر گفتگو کی؟

جواب: میں تو شوریٰ میں 1972ء سے ہوں اور اس وقت وہ مولانا کی 24 سالہ امارت کا آخری سال تھا، وہ جب ختم ہوا تو نئی امارت آئی اور نئی شوریٰ بنی، اس میں ہم بھی تھے اس لیے مجھے نہیں معلوم کہ 72ء سے پہلے کی شوریٰ پر اس موضوع پر کبھی کوئی تذکرہ ہوا یا بات ہوئی اور نہ ہی اس کا کوئی ریکارڈ ہے۔

سوال: ادھر جب مولانا دوبارہ امیر جماعت ہوئے؟

جواب: جب 1981ء میں دوبارہ امیر جماعت ہوئے، اور شوریٰ ہوئی تو میں شوریٰ میں شریک تھا لیکن اس طرح کی کوئی بات نہیں ہوئی۔

سوال: تو گویا شوریٰ بھی اس انداز کو پسند کرتی تھی جو مولانا کا انداز تھا؟

جواب: نہیں! اس میں احساسات اور خیالات متفق تھوڑے ہی تھے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ نہیں تھا جس پر سوچیں اور بیٹھ کر طے کریں کہ یہ انداز پسندیدہ ہے یا نہیں ہے یا اس پر کوئی احساس یا تأثر قائم کرنا ضروری ہے۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

سوال: شوریٰ میں مولانا ابواللیث صاحب کے فیصلہ لینے کا انداز کیا تھا، مثلاً جب کوئی مسئلہ ڈسکشن کے لیے پیش ہوتا تھا اور اس پر ڈسکشن ہوتا تھا تو مولانا کیسے فیصلہ لیتے تھے؟ کیا انداز تھا؟

جواب: مولانا سبھی مسائل میں اظہارِ خیال کرتے تھے، اپنی بات رکھتے تھے لیکن آخر میں 72ء سے 90ء تک کے دور میں دو ایک مسائل میں مولانا نے اپنے کو علیحدہ رکھا تھا۔ مثلاً انتخاب کے مسئلہ میں وہ کوئی حصہ نہیں لیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ میری رائے میرے خیالات سب

جانتے ہیں اور واضح ہیں، میں نے یہ طے کرلیا ہے کہ آپ لوگ جو کچھ سوچیں گے، طے کریں گے اس کو عمل میں لانا میری ذمہ داری ہے، اس کو کروں گا میں، میں اپنے خیالات کا اظہار کئی بار کر چکا ہوں، اب نہیں کروں گا اور مولانا اس پر آخر تک گامزن رہے۔

سوال: مولانا درمیان میں جب امیر جماعت نہیں رہے اور اس دوران عام طور پر شوریٰ میں بھی شریک نہیں رہے اور یہ دلیل دی کہ میری شرکت سے بعض چیزیں متاثر ہوتی ہیں، میں چاہتا ہوں کہ لوگ آزاد ہو کر بعض چیزوں کا فیصلہ کریں اور بحث کریں تو کیا ایسی بات تھی کہ مولانا جب یہاں موجود ہوتے تھے تو لوگ ان سے متاثر ہوجاتے تھے اور فری ڈسکشن نہیں ہو پاتا تھا یا مولانا لوگوں کو جلدی کنونس کر لیتے تھے؟

جواب: نہیں، مولانا کے اس خیال سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔ مولانا کا اپنا ایک خیال تھا اور وہ اس سلسلے میں آزاد تھے اور اس کا حق رکھتے تھے کہ میں کچھ کہوں یا شریک نہ ہوؤں تا کہ لوگ آزادی سے سوچیں، لیکن میں نہیں سمجھتا کہ ہماری جو ذہنی اور مزاجی تربیت تحریک کے اندر ہوئی ہے اس میں ہم میں سے کوئی ایسا ہو کہ کسی بات کو بس آنکھیں بند کر کے مان لیتا ہو یا کسی سے اختلاف یا اتفاق آنکھیں بند کر کے کرتا ہو، ایسا تو عام طور پر نہیں ہوا اور نہ ہی ہمارا ذہنی مزاج ہے۔ مولانا کا یہ خیال تھا اور اس خیال کو شاید وہ صحیح سمجھتے ہوں لیکن ہمیں اس سے اتفاق نہیں بلکہ ہم نے مولانا کو متوجہ بھی کیا اور ہم متوجہ ہی تو کر سکتے تھے اور کیا کر سکتے تھے۔

سوال: الیکشن کے سلسلے میں مولانا مرحوم کا کہنا تھا کہ ان کی کوئی رائے نہیں ہے مگر انھوں نے الیکشن پر خود ایک کتاب لکھی، اس میں اور شوریٰ نے جو کتابچہ شائع کیا اس میں ڈسکشن کے بہت سارے ایسے نکات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی اپنی ایک رائے تھی، اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: مولانا کی رائے تھی، رائے رہی اور اس رائے کا اظہار وہ ہمیشہ 62ء کی شوریٰ سے پہلے کرتے بھی رہے، روداد میں وہ ہے، اور روداد شوریٰ شائع بھی ہوئی۔ رائے نہیں کے یہ معنی نہیں کہ کوئی رائے ہی نہیں ہے بلکہ ان مباحث سے اپنے کو انھوں نے الگ کرلیا تھا اور اپنے تئیں یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ بھائی جو کچھ میری رائے ہے ان سب کا میں اظہار کر چکا ہوں،

بتا چکا ہوں، اب کوئی بات اظہار کی باقی نہیں رہی، میں تو اس وقت جو کچھ آپ لوگ گفتگو کر کے فیصلہ کریں گے اس پر عمل درآمد کروں گا، میں خود اس میں حصہ نہیں لوں گا، یہ تھی وہ بات۔

سوال: تو ایسا انھوں نے کیوں خیال کیا؟

جواب: ان کا خیال تھا کہ اس مسئلے کے سلسلے میں شاید ہمارے نقطۂ نظر میں بہت فرق ہے اور اس میں جہاں تک اپنی رائے کا تعلق ہے اور رائے کے حق میں استدلال کرنے اور دوسروں کو قائل کرنے کا معاملہ ہے ان کے اپنے خیال میں وہ اس کے لیے ساری کوششیں کر چکے تھے اور اب ان کا خیال تھا کہ اس پر مزید گفتگو کر کے وقت ضائع کرنا ہے۔ ہوگا کچھ نہیں۔ اس لیے وہ حصہ نہیں لیتے تھے تو یہ ان کا اپنا خیال تھا۔

سوال: میرے اپنے مطالعہ کی حد تک مولانا کی جو پہلی رائے تھی کہ الیکشن میں حصہ نہیں لینا چاہیے اور اس کے لیے انھوں نے دلائل بھی فراہم کیے لیکن بعد میں انھوں نے اس سے رجوع کر لیا اور ان کے اندر نرمی پیدا ہوئی تو یہ رائے شوریٰ کی رائے سے ملتی جلتی ہے اور جو فیصلہ ہوا اس سے بھی ملتی جلتی ہے تو آخر الگ رہنے کی کیا وجہ ہے؟

جواب: نہیں، دیکھئے! ایک بات تو یہ ہے کہ مسئلہ انتخاب پر مولانا نے اپنی رائے کا اظہار کیا کہ مسلمان کو انتخاب میں حصہ نہیں لینا چاہیے اور وہ کتابچہ کی شکل میں شائع بھی ہوا لیکن بعد میں ان کے خیالات اور رایوں میں فرق بھی ہوا اور شوریٰ میں وہ اس کا اظہار بھی کرتے رہے۔ چنانچہ پہلی بار جب یہ مسئلہ شوریٰ میں زیر بحث آیا تو وہ مسلسل شوریٰ میں موجود رہے، پھر اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے لیے کمیٹی بنی۔ اس نے ہندوستان کے مختلف علماء دین اور دانشورانِ ملت کی خدمت میں سوال نامہ جاری کیا۔ جوابات منگوائے، ان سے استفادہ کیا، پھر اس سلسلے میں اپنی سفارشات پیش کیں۔ اس کے بعد شوریٰ جن نکات پر پہنچ چکی تھی اس پر عمل درآمد کے سلسلے میں رائیں مختلف تھیں اور عملاً جو فیصلہ ہوا وہ دسمبر 1984 میں ہوا اور شرائط وغیرہ جنوری 1985ء میں طے کی گئیں اور اس مسئلہ میں صرف رائے دہی اور رائے کے استعمال کی حد تک فیصلہ ہوا۔

سوال: مولانا ابواللیث صاحب نے اپنی زندگی میں دو شخصیات سے بہت زیادہ استفادہ

کیا ہے، مولانا فراہی اور مولانا مودودیؒ، لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مولانا مودودیؒ اور مولانا فراہیؒ دونوں سے الگ ہٹ کر انھوں نے ایک راہ پیدا کی۔ مولانا مودودیؒ جس رخ پر جماعت کو چلانا چاہتے تھے اس سے الگ ہٹ کر مولانا نے ایک دوسری راہ اختیار کی، آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: اس طرح سے کسی خیال کا تو مجھے پتہ نہیں ہے، کچھ ہو تو میری معلومات میں اضافہ ہوگا۔ کوئی صاحب بتائیں کہ دونوں سے ہٹ کر وہ دوسری راہ یا دوسرا رخ کیا تھا؟ جو رخ تھا وہ سامنے ہے۔

سوال: میرے پاس جو مقالات آئے ہیں ان میں ایک صاحب نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ مولانا ابواللیث نے بہت پہلے یہ بات کہی تھی کہ جماعت کا جو لٹریچر وغیرہ تیار ہوا ہے وہ کچھ شدید سا ہے اس میں تھوڑا سا اعتدال ہونا چاہیے اور ایسے ہی ایک اور مقالے میں یہ بات کہی گئی ہے کہ مولانا ابواللیث صاحب کو مولانا فراہی کی بعض رایوں سے اتفاق نہیں تھا اور ان کا کہنا تھا کہ ان میں بھی اعتدال ہونا چاہیے، یہ رائیں شدت پر مبنی ہیں؟

جواب: اس سلسلے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا، بہرحال یہ خیال ضرور تھا۔ یہ خیال تو گفتگو میں بھی سامنے آتا رہا ہے کہ ہمارے لٹریچر کی زبان ایک مخصوص ماحول میں اختیار کی گئی تھی۔ تقسیم کے پہلے کے ماحول میں یہ لٹریچر تیار ہوا اور اس پر اس وقت کے حالات کا اثر ہے۔ اس وقت اپنی بات پیش کرنے کا جو انداز تھا اس کا، زبان کے معیار کا اور مخصوص حالات کا، ان تمام چیزوں کا اس پر اثر ہے۔ بعد کے دور میں مولانا یہ چاہتے تھے کہ بدلے ہوئے حالات میں ہمارے لٹریچر کو عام فہم ہونا چاہیے۔ نئے حالات کی اس میں رعایت بھی ہونی چاہیے۔ اس طرح کے خیالات تھے، رخ کی بات نہیں تھی۔ بہرحال ضرورت تو وہی ہے کہ لوگوں کے لیے اس کو قابلِ فہم اور قابلِ عمل بنایا جائے اور نئے حالات اور نئے مسائل کی بھی رعایت کی جائے۔

سوال: یہ بات کہی جاتی ہے، جیسا کہ آپ نے بھی کہا ہے کہ آخری وقت میں مولانا کی جماعت پر گرفت کچھ ڈھیلی ہوگئی تھی اور وہ کچھ پریشان سے تھے لیکن اس کے باوجود شوریٰ نے ان کا انتخاب کیا تو آخر اس کی کیا وجہ تھی؟

جواب: شوریٰ نے نہیں انتخاب کیا، انتخاب تو نمائندگان کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ ایوان میں جس کے حق میں رائیں ہوں گی اس کے حق میں فیصلہ ہوگا۔ ایوان میں کئی افراد پر گفتگو ہوئی تھی، رایوں کا اختلاف بھی پایا جاتا تھا، مولانا کی طرف سے انکار بھی ہوتا تھا، لیکن لوگوں نے بحیثیت مجموعی مولانا کو بہتر سمجھا اور منتخب کیا۔ لوگوں نے اپنے آپ کو مجبور پایا کہ مولانا ہی کے اوپر یہ ذمہ داری رہے۔

سوال: ایک عام تأثر یہ بھی ہے کہ مرکز کے اندر اور ہمارے جتنے اسٹیٹ ہیڈکوارٹرس ہیں ان کے اندر تحریکیت کے بجائے بیوروکریٹک انداز پیدا ہوگیا ہے اور بہت سے قوانین وضوابط ایسے بنائے گئے کہ رفقاء اس کو فالو کرنے پر مجبور ہوں، اس کی وجہ سے ان کے اندر سے وہ روح ختم ہوگئی جو تحریکی روح ہونی چاہیے اور کام بھی نہیں ہوسکا تو کیا اس میں مولانا کا بھی کچھ رول تھا؟

جواب: دیکھئے! یہ بھی ایک موضوع ہے، بہرحال جب کوئی منظّم تحریک کسی بڑے اور عظیم نصب العین کے لیے اُٹھتی اور چلائی جاتی ہے تو اپنے نصب العین کے حصول کے لیے منظّم جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ منظّم جدوجہد اس کی ضرورت بھی ہوتی ہے، تو یہ ضرورت ہی اسے ایک منظّم تحریک کی شکل میں ڈھالتی ہے اور تنظیم کی شکل میں منظّم کرتی ہے۔ تنظیم اب ایک مکمل تحریک بن جاتی ہے تاکہ اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے منظّم جدوجہد کی جاسکے۔ پھر ایک دور وہ بھی آتا ہے کہ تنظیم تو وجود میں آجاتی ہے مگر اس میں تحریکیت باقی نہیں رہتی، تنظیم آگے اور تحریک پیچھے ہوجاتی ہے لیکن حقیقت میں تنظیم تحریک ہی کے لیے ہوتی ہے، تنظیم کے لیے کوئی تحریک نہیں چلائی جاتی ہے اور نہ اٹھائی جاتی ہے لیکن مختلف وجوہ سے کسی بھی تحریک کے لیے اس طرح کے ادوار آجاتے ہیں، جب اپنے نصب العین کی سمت آگے بڑھتے ہوئے تحریکیں تنظیم بن جاتی ہیں۔ اس کے بعد اس کی حیثیت ایک ادارہ کی ہوجاتی ہے پھر ادارہ جاتی شان اس میں پیدا ہوجاتی ہے اور وہی اس کا مزاج بن جاتا ہے، تحریکیت باقی نہیں رہتی، ہم پر بھی ایک دور ایسا آیا اور ہم ابھی اس دور سے گزر رہے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ ہم اپنی کمیوں اور کمزوریوں کو اگر ٹھیک طور سے نہیں سمجھیں گے اور ان کا اعتراف نہیں کریں گے تو ان کو دور بھی نہیں کرسکتے۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس مشکل دور سے نکالیں اور یہ

ہمارے بس کی بات نہیں ہے یہ اجتماعی کوشش ہی سے ہوسکتا ہے۔ اس احساس اور اس فکر کو عام کرنے اور نمایاں کرنے کی ضرورت ہے اور ہم اس میں لگے ہوئے ہیں۔ اس چار سالہ میقات کو میں اپنے خیال کے مطابق رفقاء کے لیے اور تحریک کے لیے عزمِ نو کی میقات بنانا چاہتا ہوں۔ اس میقات کو ہم تجدیدِ عہد کی میقات بنانا چاہتے ہیں تاکہ ہمارے اندر تحریکی اسپرٹ پیدا ہو اور اپنے نصب العین کے حصول کے لیے ایک منظّم تحریک کی حیثیت سے ہم آگے بڑھ سکیں، تحریکی انداز میں کام کرنے لگیں۔ بیشک ہمارے اندر وہ روح اور وہ جذبہ پیدا ہوا ہے، اور ان شاء اللہ اس کی مدد شامل رہی تو اس مشکل سے ہم اپنے آپ کو نکالنے میں کامیاب ہوں گے۔

سوال: ایک اور بات ہے ملی مسائل میں مولانا کا کیا نقطۂ نظر تھا، سکریٹری کی حیثیت سے آپ نے تجزیہ کیا ہوگا، جیسے حالات ہیں، تعلیم ہے اور اس طرح کے دوسرے مسائل ہیں، غربت وغیرہ۔

جواب: دیکھئے! جو چار سالہ ہمارا میقاتی پروگرام بنتا ہے تو میقات میں پروگرام بنانے سے پہلے شوریٰ تمام مباحث پر غور کرتی ہے۔ اس کے بعد ہی پروگرام بنتا ہے۔ اس میں مولانا کے اپنے مشورے اور تجویزیں سب زیرِ بحث آتی تھیں اور اس میں شامل رہتی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ کبھی کچھ چاہتے تھے کہ کیا کیا جائے تو اس کا اظہار انھوں نے کھل کر میری معلومات کی حد تک نہیں کیا۔ کہیں اور کیا ہو تو کیا ہو۔

سوال: جانے والوں کی خامیوں کو عام طور سے یاد نہیں کیا جاتا لیکن چونکہ گفتگو ایک قائد پر ہو رہی ہے اس لیے اگر ان کے اندر کچھ کمیاں تھیں تو اس سے بچنا ضروری ہے۔ مولانا مرحوم کے اندر قائد کی حیثیت سے موٹی موٹی کیا کمیاں تھیں؟ کیا آپ نشاندہی کریں گے؟

جواب: اس سلسلے میں میرا جو نقطۂ نظر ہے، میرے خیال میں آپ بھی غور کریں گے تو پسند فرمائیں گے کہ ہمیں اپنے ماضی پر اب سے لے کر تحریک کے آغاز تک کے اس پورے دور پر نظر ڈالنی چاہیے۔ نظر رکھنی چاہیے کہ ہم کہاں سے چلے تھے اور کن کن منزلوں اور مرحلوں سے گزرتے ہوئے اور ان سے ہو کر یہاں تک پہنچے ہیں اور کیا کچھ ہوتا رہا ہے اور کیا کچھ کر سکے ہیں، کتنا کچھ حاصل کیا ہے، کیا پایا کیا کھویا ہے، ان سب پہلوؤں پر ہماری نگاہ ہونی چاہیے۔

ایک بات تو یہ ہے، اس کے لیے ہر طرح کے جذبات اور احساسات سے دور رہ کر، خالص حقیقت پسندانہ انداز میں نگاہ ڈالنی چاہیے۔ اس کے ساتھ ایک دوسری بات جو میں ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ جائزہ، یہ احتساب اس لیے ہونا چاہیے کہ ہم اپنی کمزوریوں سے اور کمزور پہلوؤں سے، غلطیوں سے، لغزشوں سے واقف ہوں اور آئندہ ان سے اجتناب کریں۔ جائزہ کا یہ پہلو میرے نزدیک مفید نہیں ہوگا اور نہ ہی اس پہلو سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے اور کم سے کم میں تو لینا نہیں چاہتا کہ ان کوتاہیوں، ان خامیوں اور ان لغزشوں میں کس فرد کا یا کن افراد کا حصہ رہا ہے۔ ہم ایک تحریک ہیں، ہم ایک تنظیم ہیں، ہم نے کچھ پایا ہے، کچھ کھویا ہے تو اگر کچھ خوبیاں ہیں تو وہ بھی ہماری ہیں اور اگر کچھ خامیاں ہیں تو وہ بھی ہماری ہیں۔ ہم خامیوں کو سمجھیں اور آئندہ اس سے بچنے کی کوشش کریں تو ان کا جائزہ اس پہلو سے ہمیں لینا چاہیے۔ افراد کے پہلو سے یا فرد کے پہلو سے نہیں لینا چاہیے۔

سوال: کوئی ایسا واقعہ بتائیں گے جو آپ کے لیے یادگار واقعہ ہو یا آپ اور مولانا کے گہرے تعلقات پر روشنی ڈالتا ہو؟

جواب: اس طرح کا کوئی واقعہ تو پیش نہیں آیا، البتہ یہ ہے کہ ان کی امارت وغیرہ کے سلسلے میں کوئی مسئلہ آتا تو ہم سب کی کوشش اور سب کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ ہم سب میں بہتر بہرحال ان ہی کو پاتے ہیں، بحیثیت مجموعی انہی کو ہونا چاہیے اور اس سلسلے میں مولانا کبھی بہت انکار کرتے یا فیصلے کے باوجود بھی ماننے سے انکار کرتے، ایسا معلوم ہوتا کہ اب نہیں مانیں گے تو ان کو منوانے میں، ان کو اس کے لیے آمادہ کرنے کے سلسلے میں انفرادی واجتماعی کوششیں ہوا کرتی تھیں۔ تو ایسا ہوا ہے کہ کبھی اس فیصلے کے بعد ہم ان سے رجوع ہوئے ہیں، بات چیت کی ہے، تو ہمارے جذبات بھر آئے ہیں، ہم رو پڑے ہیں، اس کو آپ تعلقات کا اظہار سمجھیں یا گہرائی۔ اس کے علاوہ کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔

سوال: رفقاء کو آپ کوئی پیغام دینا پسند کریں گے، رفقاء میں SIO اور جماعت دونوں کے رفقاء شامل ہیں؟

جواب: کوئی خاص پیغام بطور خاص کیا دینا ہے، اگر کوئی پیغام ہے تو بس یہی ہے کہ

اقامتِ دین کے نصب العین کو جو ہم نے اپنایا اور فلاح آخرت اور رضائے الٰہی کے حصول کے لیے اس دنیا میں اس فریضے کو ادا کرنا ضروری سمجھا ہے کہ اس کو کرتے ہوئے ہی وہ حاصل کیا جاسکتا ہے یعنی اللہ کی رضا اور آخرت کی فلاح، تو اس نصب العین سے پورے شعور کے ساتھ ہم چمٹ جائیں اور پوری قوت اور عزم مصمم کے ساتھ اس نصب العین کے حصول کے لیے اپنے آپ کو لگا دیں اور SIO سے بھی ہماری خواہش یہی ہے۔ خواہش ہی نہیں بلکہ آرزو اور توقع بھی ہے کہ ان شاء اللہ یہ پودا جو ہمارا لگایا ہوا ہے برگ و بار لائے گا اور تحریک کے لیے کارکن اور نیا خون فراہم کرے گا اور ان شاء اللہ تحریک کی ضرورت کو پورا کرنے میں اپنا رول Play کرے گا۔